حیات ظفیرؒ

(مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کی حیات وخدمات)

مرتب

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، ۱۶۱، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

نام کتاب	:	حیات ظفیر (مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کی حیات وخدمات)
مرتب	:	پروفیسر (ڈاکٹر) محمد سعود عالم قاسمی
ضخامت	:	۳۷۶ صفحات
تعداد	:	ایک ہزار
سن طباعت	:	ستمبر ۲۰۱۱ء
قیمت	:	
ناشر	:	ایفا پبلیکیشنز، ۱۶۱، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ.
ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً
مَّرْضِيَّةً. فَادْخُلِيْ فِيْ
عِبَادِيْ. وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ
(الفجر:۲۷-۳۰)

مرنے والے کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں
اقبالؔ

فہرست

۱	عرض مرتب	۹
۲	پیش لفظ — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۵
۳	تقریظ — مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی	۱۹

● مشاہدات وتاثرات

۴	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کامیاب مربی، مشہور فقیہ اور عظیم مصنف — مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی	۲۱
۵	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب نے ایک لاکھ فتاویٰ تحریر فرمائے — مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری	۳۱
۶	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب ..... یادوں کے چراغ — مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی	۳۳
۷	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب - متنوع کمالات کے حامل — مولانا قاری ابوالحسن اعظمی	۴۲
۸	ترکش مارا خدنگ آخریں — پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۴۶

● نقش حیات

۹	اجمالی حالات — مرتب	۵۲
۱۰	میرے ابو جان — ڈاکٹر ابوبکر عباد	۵۴
۱۱	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب - سادگی کے پیکر — مولانا نور عالم خلیل امینی	۸۰
۱۲	مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب - ایک جامع شخصیت — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۸۹
۱۳	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب - دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن — مولانا محمد اسلام قاسمی	۱۰۴
۱۴	ابا جان - دارالعلوم دیوبند سے خدا کے حضور تک — ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی	۱۱۳

● علمی خدمات

۱۵	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کا علمی امتیاز — پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۱۳۱
۱۶	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کی علمی و دینی خدمات — مولانا عتیق احمد بستوی	۱۴۲
۱۷	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب بحیثیت مفسر قرآن — مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی	۱۵۵
۱۸	مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب اور فقہ وفتاویٰ کی تدوین — پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	۱۶۵

● تصنیفی سرمایہ

۱۹ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کا تصنیفی ذوق
مولانا مفتی بدرالحسن قاسمی ۱۷۷

۲۰ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کا تصنیفی کارنامہ
ڈاکٹر عبید اقبال عاصم ۱۸۹

۲۱ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کی تصانیف ایک نظر میں
ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی ۲۱۹

۲۲ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کا اسلوب نگارش
مولانا اشرف عباس قاسمی ۲۲۴

۲۳ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب ایک نامور اہل قلم
مولانا نسیم اختر شاہ قیصر ۲۳۱

● بزرگوں سے تعلق

۲۴ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کے اکابر علماء سے روابط
مولانا اختر امام عادل ۲۳۷

۲۵ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ مفتاحی اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ
ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی ۲۵۷

۲۶ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ اور مولانا منت اللہ رحمانیؒ - باہمی رشتے
پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ۲۹۵

۲۷ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب اور مولانا عبدالرحمان صاحبؒ
مولانا وصی احمد شمسی ۳۱۷

۲۸ مکاتیب مولانا عبدالرحمانؒ صاحب بنام مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب
پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ۳۲۲

● عزیزوں اور شاگردوں کی تربیت

۲۹ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کی خردنوازی
جناب عبدالباری صدیقی ۳۳۴

۳۰ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب اور طلباء کی تربیت
پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ۳۳۸

۳۱ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب میرے استاذ اور مربی
مولانا محمد ساجد قاسمی ۳۵۰

۳۲ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کے اوصاف حمیدہ
مولانا اشتیاق احمد قاسمی ۳۵۵

۳۳ مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی ۳۶۳

● منظوم خراج عقیدت و تاریخ وفات

۳۴ مولانا وارث ریاضی
۳۷۱

۳۵ ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی ۳۷۳

۳۶ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی ۳۷۶

عرض مرتب

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ (ولادت ۱۹۲۶ء وفات ۲۰۱۱ء) کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز ہندوستانی اہل قلم اور اصحاب افتاء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ۸۵ سال کی عمر پائی اور پوری زندگی علم وفقہ کی خدمت میں صرف کی۔ رسول کریم ﷺ نے اس مومن کو خوش قسمت قرار دیا ہے جس کی عمر طویل ہو اور عمل اچھا ہو (**من طال عمرہ وحسن عملہٗ**) حضرت مفتی صاحب جناب رسالت مآبؐ کی اس حدیث کا مصداق تھے۔ ان کی زندگی جدّ و جہد، محنت ولگن، صبر وعزیمت، علم وعمل، تدریس وتصنیف اور تبلیغ دین سے عبارت تھی۔ ان کی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیاں ۶۵ سالوں پر محیط ہیں۔ یہ اپنی جگہ خود ایک روشن مثال ہے۔

ان کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب (امیر خامس امارت شرعیہ بہار) مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا عبدالجبار صاحب اور محدث وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی جیسے جلیل القدر علماء تھے، جب کہ ان کے شاگروں میں وقت کے مشہور علماء وفقہا، اصحاب افتا اور اصحاب قلم شامل ہیں۔ انھوں نے نصف صدی تک دارالعلوم دیوبند کی علمی وفقہی خدمت انجام دی، دارالعلوم کے منتشر فتاویٰ کو بارہ جلدوں میں مرتب کر کے مسلمانوں میں متعارف کرایا، دارالعلوم کے کتب خانہ کو منظّم کر کے اور دو جلدوں میں اس کے مخطوطات کی تفصیلات رقم کر کے دنیائے علم و

دانش کے سامنے پیش کیا۔ نو آموز مفتیوں کی تربیت کر کے ان کو جوہر قابل بنایا اور خود ایک لاکھ فتاویٰ لکھ کر روزمرہ کے مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ دارالعلوم دیوبند میں جب معارف قرآنی کا شعبہ قائم ہوا تو اس کی ذمہ داری سنبھالی اور ۱۷ سالوں تک رسالہ دارالعلوم کا اداریہ لکھ کر میدان صحافت میں دارالعلوم کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی۔

مفتی صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ مدارس کی چہار دیواری میں رہتے ہوئے بھی ان کا علمی افق نہایت وسیع تھا، جہاں لوگ ترجمہ وشرح نگاری اور حاشیہ آرائی سے آگے نہیں سوچتے الا ماشاء اللہ، وہاں مفتی صاحب کا قلم نت نئے موضوعات کا تعاقب کرتا تھا اور بحث وتحقیق کی نئی جہت سامنے لاتا تھا۔ انھوں نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں اور دوسو سے زیادہ مقالات قلم بند فرمائے۔ ان کی کتابوں کے ترجمے ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں ہوئے۔ ان کی تحریروں سے ایک دنیا مستفید ہورہی ہے اور ہوتی رہے گی۔

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو بس یہی دو پشت چار پشت

مفتی صاحب مسلم پرسنل لا بورڈ، امارت شرعیہ بہار، بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ممبر رہے اور قاضی مجاہدالاسلام صاحب قاسمیؒ کے بعد اسلامک فقہ اکیڈمی کے تاحیات صدر رہے۔ وہ دینی جلسوں میں اپنی تقریر وتذکیر سے لوگوں کو سرفراز کرتے اور سمیناروں اور کانفرنسوں میں اپنے مقالات و مباحث سے دارالعلوم دیوبند کی علمی نمائندگی فرماتے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی دینی وعلمی زندگی کے منور گوشے ہیں۔ ان کی علمی کاوشوں اور قلمی نگارشات کے قدر دانوں میں ملک کے ممتاز علماء اور اساطین قرطاس وقلم ہیں، مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حسین احمد

مدنی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہم۔ مفتی صاحب نے ان حضرات کی محبتوں اور شفقتوں کا والہانہ تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''زندگی کے مختلف دور ہوتے ہیں ہر منزل پر ان کی شفقتیں کام آئیں، کسی دوراہے پر پہنچ کر جب دل میں تذبذب اور شکوک وشبہات کا بے پناہ زور پیدا ہوا، اس مشکل وقت میں ان کی تحریریں مشعل راہ بنیں اور انھوں نے ایک مناسب راستہ پر ڈال دیا۔'' (علمی مراسلے، ص ۵)

زمانہ طالب علمی میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد میں بھی حصہ لیا اور پریشانی اٹھائی، بزرگوں سے ان کا تعلق نیازمندانہ تھا اور چھوٹوں کے لیے وہ سراپا رحمت وشفقت تھے۔ بایں ہمہ علم وافتخار، انکسار اور تواضع کا وہ مجموعہ تھے، سادگی ان کا مزاج تھی اور بے تکلفی ان کی پہچان، وہ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کے قائل تھے، وہ ہمیشہ محنت کے ساتھ اپنے فریضۂ منصبی اور یکسوئی کے ساتھ فریضہ مذہبی کی ادائیگی میں مصروف رہتے۔ اسی محنت اور استقلال نے ان کے کاموں کو متعارف اور مقبول بنایا۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہر چند کہ ایجاد معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مرد خرد مند ہے آزاد
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

ان کے انتقال سے دارالعلوم دیوبند کا مسند افتا ہی سونا نہیں ہوا بلکہ اعزہ، تلامذہ اور متوسلین میں صف ماتم بچھ گئی، کیوں کہ ایک شخصیت کی موت نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ تھا، ایسا عہد جس میں علم وفن کی آبیاری تھی۔

شام در شام جلیں گے تیری یادوں کے چراغ
نسل در نسل تیرا درد نمایاں ہوگا

جس وقت راقم الحروف کو حضرت کی وفات کی خبر ملی، راقم علی گڑھ سے دور نیپال کی سرحد پر مدرسہ چشمہ فیض ململ کی علمی کانفرنس میں مدعو تھا، جنازہ کی نماز اگلے دن بروز جمعہ طے کی گئی تھی۔ شب میں جلسہ عام میں تمام علماء ودانشوران اور شرکاء نے مفتی صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی اور بعد نماز فجر متصلاً نماز جنازہ میں شرکت کے لیے راقم کے ساتھ مولانا قاسم مظفر پوری، مولانا وصی احمد اور مولانا عبدالخالق وغیرہم چل پڑے اور صبح ۹/ بجے نماز جنازہ ادا کی۔

حضرت مفتی صاحب کا انتقال راقم الحروف کے لیے ذہنی وعلمی سانحہ تھا۔ ذہنی اس لیے کہ وہ میرے خاندان کے بزرگ تھے، یعنی میرے دادا کے چھوٹے ہم زلف تھے۔ دادا جان کا انتقال بہت پہلے ہوگیا تھا، ان کی تمام تر شفقت مجھے حضرت مفتی صاحب کی شکل میں ملی۔ یہ سانحہ علمی اس وجہ سے تھا کہ میری تعلیم و تربیت خاص طور پر قرطاس وقلم سے میری مناسبت ان کی ہی مرہون منت ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ قیام میں وہ میرے سرپرست، مربی اور محسن رہے اور ان کے ساتھ ان کے بڑے صاحب زادے مولانا احمد سجاد میرے لیے شجر سایہ دار رہے۔ میرا علی گڑھ آنا مفتی صاحب کے مشورہ سے ہوا اور آخر عمر تک خطوط کے ذریعہ اور بنفس نفیس آکر میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

ان کی وفات سے ان کی تعلیم وتربیت، تذکیر ونصیحت، بزرگانہ شفقت اور محبت کی یادیں ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی ہیں۔ راقم کے نام مفتی صاحب کے بہت سے خطوط ہیں جن میں ذاتی اور خانگی مسائل کے علاوہ دینی اور علمی مسائل پر اظہارِ خیال بھی ہے، کبھی موقع ملا تو ان مکتوبات کو بھی دیگر مکاتیب کے ساتھ مرتب کرکے شائع کردیا جائے گا۔

حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد راقم کی خواہش تھی کہ ان کی حیات وخدمات کوقلم بند کیا جائے اور ''**اذکروا محاسن موتاکم**'' پرعمل کرکے ثواب حاصل کیا جائے، مگر چونکہ مفتی صاحب نے خود اپنی سرگزشت حیات نہایت سادگی وسلاست سے قلم بند فرمائی ہے جو'' زندگی کا علمی سفر'' کے نام سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اور مشاہیر علماء کے خطوط ڈاکٹر منظور عالم صاحب کے زیر اہتمام قاضی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوئے۔ اس لیے دوسرا خیال یہ آیا کہ ان کے احباب، تلامذہ اور متوسلین سے گذارش کی جائے کہ مفتی صاحب کے بارے میں وہ اپنے علمی مقالات، دینی تجربات اور ذاتی مشاہدات قلم بند فرمائیں اور ان مقالات کو ترتیب وتہذیب کے ساتھ شائع کردیا جائے۔ کوشش یہ کی جائے کہ مفتی صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں کا احاطہ ہوجائے۔

چنانچہ اس کام کو انجام دینے کی خاطر راقم نے پچاس سے زیادہ اہل علم کو خطوط لکھے، فون سے رابطہ کیا اور یاد دہانی کرائی، مجھے خوشی ہے کہ بہت سے اہل علم نے میری دعوت قبول کی اور حوصلہ افزائی فرمائی، جب کہ بعض اہل علم اپنی طے شدہ مصروفیت سے وقت نہ نکال سکے، راقم ان تمام اہل علم ودانش کا شکر گذار ہے۔ اور بطور خاص مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی کا کہ انھوں نے مضامین اور مکاتیب کی فراہمی میں تعاون فرمایا۔

دستیاب شدہ مقالات کا منتخب مجموعہ پیش خدمت ہے، یہ مجموعہ جہاں حضرت مفتی صاحبؒ کی علمی زندگی کو خراج عقیدت ہے، وہاں ان کے عزیزوں اور شاگردوں کے لیے سامان راحت ہے اور بعد والوں کے لیے شاید علمی دستاویز بھی۔ میں اسلامی فقہ اکیڈمی نئی دہلی کے ذمہ داران بالخصوص جنرل سکریٹری حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ

انھوں نے اس مجموعہ مقالات کو جو'' حیات ظفیر'' سے موسوم ہے، شائع کرنے کا فیصلہ فرمایا اور فقہ اکیڈمی کے دوسرے سکریٹریز مولانا عتیق احمد بستوی اور مولانا عبید اللہ اسعدی نے ازراہ عنایت مسودہ پر نظر ڈالنے کی زحمت فرمائی راقم ان سب کا شکر گزار ہے۔ فقہ اکیڈمی ہندوستانی مسلمانوں کا سرمایہ افتخار ہے، اللہ کرے کہ اس کا فیض جاری رہے اور وہ شرور وفتن سے محفوظ رہے، مقالات میں جن خیالات ومشاہدات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مقالہ نگاروں کے ہیں، البتہ میں نے کوشش کی ہے کہ جن مقالات میں تکرار ہے یا جہاں کہیں مفتی صاحب کی مشکلات کے حوالہ سے شدت احساس ہے اسے کم کردیا جائے تاکہ عمداً کسی فرد اور ادارہ کے اکرام میں کمی نہ ہو، جب کسی شخصیت کے بارے میں مختلف اہل علم لکھتے ہیں تو ان کے مقالات میں مکررات اور اعادہ کا ہونا انوکھی بات نہیں۔ اس مجموعہ میں بھی اس کی جھلک موجود ہے۔ لیکن قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان مقالات میں تنوع کے ساتھ علمی وقار اور شخصی اعتبار بھی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مفتی صاحبؒ کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہمیں اخلاص وانہماک کے ساتھ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

محمد سعود عالم قاسمی

۲۸؍رمضان المبارک، ۱۴۳۲ھ

اسٹریٹ نمبر ۲، اقرا کالونی، نیو سرسید نگر، علی گڑھ، یوپی

●●●

پیش لفظ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ☆

زندگی میں جن چند بزرگوں سے غیر معمولی محبت و احترام کا تعلق رہا ہے، ان میں ایک نمایاں نام حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صدیقی مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جب تک ان کو دیکھا نہیں تھا، دل ان کی عظمت سے معمور تھا اور جب ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی تو جوں جوں وقت گذرتا گیا، عقیدت کے ساتھ ساتھ محبت کے جذبات شامل ہوتے گئے، عقیدت ان کے علمی کاموں اور تصنیفی کارناموں کی وجہ سے، اور محبت ان کے حسن اخلاق اور حسن کردار کی وجہ سے، ان کے لباس و پوشاک اور رہن سہن کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ایک باکمال مصنف اور صاحب نظر عالم دین ہیں، درخت جتنا پھل دار ہوتا ہے، اسی قدر جھکا ہوا ہوتا ہے، مفتی صاحبؒ کی شان یہی تھی، انھیں دیکھ کر ان سلف صالحین کی شخصیت کو سمجھا اور جانا جاسکتا تھا، جن کا ذکر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں اور جن کی سادگی اور انکساری کے قصے آج کے لوگوں کو افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

مفتی صاحبؒ کی شخصیت بڑی حد تک علمی اور عملی جامعیت سے آراستہ تھی، فقہ ان کا خاص موضوع تھا، تقریباً ایک لاکھ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جیسی معتبر دینی دانش گاہ کے مرکز افتاء سے ان کے قلم سے جاری ہوئے، انھوں نے درمختار کا

☆ جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی؛ ناظم المعہد العالی، حیدرآباد

ترجمہ کیا، مجموعہ قوانین اسلامی کی ترتیب میں ان کا ہم حصہ رہا، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی بارہ جلدیں نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ مرتب کیں، نئے دور کے ذہن کے مطابق شریعت اسلامی کی تشریح وتفہیم کی انھوں نے بڑی کامیاب کوشش فرمائی ''اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام امن، اسلام کا نظام عفت وعصمت اور اسلام کا نظام جرم وسزا'' اس پہلو سے نہایت اہم کتابیں ہیں، جن میں سے بعض کتابوں کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوچکے ہیں، تفسیر قرآن مجید کا کام بھی کیا، تاریخ وسیرت اور تذکرہ نگاری میں ان کی خدمات بہت نمایاں ہیں، مفتی صاحب کی تحریر بہت سادہ، شستہ اور شگفتہ ہوا کرتی تھی، ہر عام وخاص کے لئے قابل فہم۔

وہ ایک اچھے مدرس بھی تھے اور کئی شخصیتیں جو اس وقت علم کے اُفق پر کواکب و انجم کی طرح روشن ہیں، وہ ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہ چکی ہیں، دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تدریب افتاء میں بھی انھوں نے عرصہ تک تدریس کے فرائض انجام دیئے ہیں اور دیوبند آنے سے پہلے تو آپ کا مشغلہ ہی تدریس کا تھا، وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے اور جن لوگوں نے ان کے خطاب کو سنا ہے، انھیں اندازہ ہے کہ ان کے خطاب میں دردمندانہ نصیحت بھی ہوتی تھی اور جوش و ولولہ بھی، خاص کر طلبہ کو جب نصیحت کرتے تو ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سینہ میں ایک تڑپتا ہوا دل بھی رکھتے تھے، جس میں مخلوق کی محبت بھی تھی اور اپنے خالق سے تعلق بھی، نماز ہمیشہ باجماعت ادا کرتے، اکثر پہلی صف میں رہتے، سنن ونوافل کا بہت اہتمام کرتے، فجر کا وقت شروع ہونے سے کافی پہلے بیدار ہوجاتے اور نماز تہجد اور اوراد واذکار میں مشغول رہتے، روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کا بھی معمول تھا۔

عام طور پر جو لوگ علم وتحقیق اور تعلیم وتربیت سے شغف رکھتے ہیں، ملی کاموں سے بے تعلق ہوجاتے ہیں؛ لیکن مفتی صاحبؒ کبھی ملی وقومی کاموں سے

دور نہیں ہوئے ، طالب علمی کے دور ہی میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں شرکت کی اور اس راہ میں صعوبتیں بھی اُٹھائیں ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور امارت شرعیہ بہار سے انھوں نے ہمیشہ اپنا ربط قائم رکھا اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ، اس لیے واقعہ ہے کہ ان کی شخصیت مختلف الجہات تھی اور کسی علمی موضوع یا ملی مسئلہ پر کوئی نشست منعقد ہوتی تو ان کی شرکت کے بغیر وہ نامکمل سمجھی جاتی ۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کی جب تشکیل عمل میں آئی ، تو بانیٔ اکیڈمی نے جن اولین چند شخصیتوں کے نام اکیڈمی کے ارکان کی حیثیت سے لکھے ، جہاں تک مجھے یاد ہے ان میں سرفہرست مفتی صاحبؒ کا نام تھا ، مفتی صاحبؒ پابندی سے اکیڈمی کے سیمیناروں میں شرکت فرمایا کرتے تھے ؛ حالاں کہ بعض حضرات کو ان کی یہ شرکت پسند نہیں تھی ، اور یہ بات مفتی صاحبؒ کے لئے بہ ظاہر نقصاندہ ثابت ہوسکتی تھی ؛ لیکن مفتی صاحبؒ کبھی اس کو خاطر میں نہیں لاتے ، پھر بانی اکیڈمی کی وفات کے بعد حیدرآباد میں مجلس انتظامی کی پہلی نشست رکھی گئی ، اب تک اکیڈمی میں صرف ''سکریٹری جنرل'' کا عہدہ تھا ؛ لیکن اب طے پایا کہ عہدوں میں توسیع کی جائے ؛ چنانچہ اکیڈمی کے صدر (جو ادارہ کا سربراہ اعلیٰ ہوتا ہے) باتفاق رائے مفتی صاحبؒ کو منتخب کیا گیا ، مفتی صاحبؒ کے زیر صدارت اکیڈمی کا علمی سفر کسی توقف کے بغیر جاری رہا اور ہم خدام بہت ہی خوشگوار فضاء میں اکیڈمی کے تنظیمی کاموں کو انجام دیتے رہے ، اس لئے مفتی صاحبؒ کی وفات اکیڈمی کے لئے خصوصی طور پر بڑا سانحہ ہے ، اللہ تعالیٰ ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلاء کو بہتر طور پر پُر فرمائے ۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ ممتاز صاحب علم اور معروف مصنف پروفیسر مولانا سعود عالم قاسمی (ڈین فیکلٹی تھیالوجی : مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) —— جو مفتی صاحبؒ کے تربیت یافتہ بھی ہیں ، اور خاندانی رشتہ دار بھی —— نے بڑی خوش

اُسلوبی کے ساتھ مفتی صاحبؒ کے حالات وخدمات پر مضامین کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے ، جس میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اہل علم کے مقالات شامل کئے گئے ہیں اور کوشش کی گئی ہے کہ صاحب تذکرہ کی خدمات مختلف جہتوں سے سامنے آجائیں ، انشاء اللہ مقالات کا یہ مجموعہ آئندہ مفتی صاحبؒ کا مستقل تذکرہ لکھنے میں مدومعاون ثابت ہوگا اور اصحابِ توفیق اس متن کو سامنے رکھ کر ان کی شخصیت پر قلم اُٹھائیں گے ، یہ حقیر ہم سبھوں کی طرف سے اس فرض کفایہ کی ادائیگی پر مولانا قاسمی کا بے حد شکر گزار ہے اور انھیں اس خدمت پر مبارکباد پیش کرتا ہے ، اکیڈمی کے لئے اس مجموعہ کی طباعت نہ صرف ایک سعادت ہے ؛ بلکہ اس طرح وہ اپنے محسن کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی حقیر کوشش سے عہدہ برآ ہورہا ہے ۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ تذکرہ کو ان کی خدمات کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور '' اذکرو محاسن موتاکم '' کے تحت مرتب گرامی کی اس خدمت کو بھی عنداللہ اور عندالناس قبولیت حاصل ہو ۔

وللہ الحمد أولا وآخرا وهو المستعان ۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری : اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۴؍شوال ۱۴۳۲ھ
۵؍ستمبر ۲۰۱۱ء

●●●

تقریظ

مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی ☆

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند، ان باتوفیق علماء میں تھے جنھوں نے اپنی زندگی نہایت مفید علمی کاموں میں صرف کی اور اپنی محنت کا نتیجہ بے شمار تالیفات کی شکل میں چھوڑ گئے۔

میری اُن سے واقفیت کا آغاز اُس وقت ہوا جب میں ۱۹۶۱ء میں مفتاح العلوم مئو میں داخل ہوا، مفتی صاحب، وہاں کے قدیم فضلاء میں سے تھے اور مفتاح العلوم کی فضاؤں میں وہاں کے جن مستفیدین کا نام تذکرے میں آتا تھا اُن میں مفتی صاحب سب سے نمایاں سمجھے جاتے تھے، اس وقت تک ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی تھیں اور ان کے نام کے ساتھ مفتاحی کا لاحقہ استعمال ہوتا تھا؛ لیکن اس وقت تک میں نے ان کو دیکھا نہیں تھا، البتہ دل میں شوق ملاقات تھا۔

ملاقات کا اتفاق دارالعلوم دیوبند آنے کے بعد ہوا، دارالعلوم میں میرا داخلہ ۱۹۶۲ء میں ہوا، اُس وقت یہاں حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی باغ و بہار مجلس میں علماء و اعیان کی شرکت ہوتی تھی، ہمارے بزرگ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب بنارسیؒ، حضرت مولانا سلطان الحق صاحبؒ کے رفیق درس تھے، اس مناسبت سے میری حاضری بھی مولانا کی

☆ مہتمم دارالعلوم دیوبند، سہارن پور، یوپی

مجلس میں ہونے لگی، وہاں کے حاضر باشوں میں دیگر علماء کے علاوہ مفتی ظفیر الدین صاحبؒ بھی تھے، اس طرح ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا، ان کی گفتگو معلومات افزا ہوتی تھی، طبیعت میں سادگی تھی، ہمارا علاقہ بھی ان کے علاقہ سے قریب ہی ہے اور کچھ مفتاحی کی نسبت، اس لیے ان سے ایک مناسبت قائم ہوگئی۔

یہ تو مفتی صاحب مرحوم سے میرے ذاتی تعلق کی وضاحت تھی، جہاں تک ان کے علمی کارناموں کی بات ہے، ان سے تو ایک زمانہ واقف ہے، ان کے جس کام نے علمی حلقوں میں ان کے نام کو تعارف و اعتبار دیا وہ فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب کا کام ہے، جسے انھوں نے بڑی محنت سے انجام دیا، اس کے علاوہ ''اسلام کا نظام مساجد''، ''اسلام کا نظام عفت'' وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو ان کی جودت طبع، حسن انتخاب اور انتھک محنت پر شاہد عدل ہیں، ان کے قلم سے وجود میں آنے والی کتب کی تعداد غالباً پچاس کے لگ بھگ ہے، جو ان کے نام کو ایک عظیم مصنف و مؤلف کی حیثیت سے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

مفتی صاحب بہت سلیس زبان لکھتے تھے، ان کے فتاویٰ بھی واضح ہوتے تھے، تحریر بھی خوبصورت تھی، زندگی نہایت سادہ تھی، نماز باجماعت کا بے حد اہتمام کرتے تھے، مجموعی اعتبار سے ان کی شخصیت، یاد رکھے جانے کے لائق اور آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ جناب مولانا ڈاکٹر سعود عالم قاسمی صاحب زید مجدہم، مفتی صاحب پر ایک دستاویزی کتاب شائع کرنے جارہے ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب مفتی صاحبؒ کی علمی زندگی سے واقف کرانے میں کامیاب ہوگی اور مفتی صاحبؒ کے حق کی ادائیگی کا ذریعہ اور آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کا میاب مربی، مشہور فقیہ اور عظیم مصنف

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی☆

گذشتہ بیسویں صدی کے چوتھے دہے کی بالکل ابتدا میں، میں مدرسہ مفتاح العلوم جامع مسجد شاہی مئو میں ابتدائی مکتب میں داخل ہوا تھا، اس وقت میرے اساتذہ میں پرائمری درجات کے ذمہ دار جناب منشی گدا حسین صاحب فاروقی اور ناظرہ قرآن کریم کے استاذ قاری عبدالمنان صاحب تھے، بہت جلد چند سالوں میں یہ مرحلہ پورا ہوگیا، پھر عربی درجات میں تعلیم حاصل کرنے کی سعادت اس خاکسار کو حاصل ہوئی اور درجہ اول سے لے کر غالباً سال ششم جلالین ومشکوٰۃ اور ہدایہ کے درجہ تک کی ساری کتابیں ۱۹۴۸ء مطابق ۱۳۶۸ھ تک اپنے سبھی جلیل القدر اساتذہ سے پڑھ لیا تھا، ان میں عربی ادب کی کتابیں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہ اور درسیات کی جملہ کتابیں اپنے والد مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ایوب اعظمیؒ، حضرت مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا شمس الدین صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی عبدالباری صاحبؒ، حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ اور بعض دیگر اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، **فجزاھم اللہ خیرا کثیرا۔**

☆ مدیر البعث الاسلامی ومہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

مفتی صاحب میرے استاد میرے مربی

سال دوم میں علامہ جرجانی کی کتاب ''شرح مأۃ عامل'' کے اسباق حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ غالباً ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا، بالکل اسی زمانہ میں مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاح العلوم سے سند فراغ لے چکے تھے اور محدث جلیل حضرت مولانا اعظمیؒ نے ان کا معاون مدرس کی حیثیت سے مفتاح العلوم میں تقرر فرمالیا تھا، الحمدللہ ان کے طریقۂ تدریس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا اور ترکیب نحوی کی مشق کرنے اور اعراب کی صحت کا ادراک حاصل ہوا، مولانا مفتاحی نے بہت خوبی اور وضاحت کے ساتھ یہ کتاب ہم کو پڑھائی، **فجزاھم اللہ خیرا کثیرا۔**

متعدد مدارس میں تعلیمی وتدریسی سرگرمیاں

مولانا مفتاحیؒ نے اپنا بیشتر تعلیمی سفر مفتاح العلوم میں پورا کیا، محدث جلیل حضرت مولانا اعظمی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے جوہر کو اچھی طرح پہچان لیا تھا، اس لیے ان کی تعلیم وتربیت کی طرف خاص طور سے متوجہ رہے اور حضرت مولانا سے مفتی صاحب کا علمی اور تربیتی تعلق بہت مضبوط رہا اور اس شجر سایہ دار بلکہ شجر طوبیٰ کے سایہ میں اپنی علمی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ہمہ تن مشغول ہوگئے اور اہل علم کی صفوں میں ان کا شمار ہونے لگا، اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے استاد ومربی علامہ اعظمی سے اجازت لے کر دو تین سال تک مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنؤ میں تدریسی خدمت انجام دیں، ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر میں مدرس ہوئے اور عرصۂ دراز تک درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، ایک سال ڈابھیل ضلع سورت کی جامعہ اسلامیہ میں تعلیمی خدمت انجام دیں، لیکن وہاں کی

آب وہوا راس نہ آنے کی وجہ سے پھر دارالعلوم سانحہ واپس تشریف لے گئے۔

مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد علامہ سید سلیمان ندویؒ کے مشورہ سے انھوں نے ۱۹۴۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور تقریباً چھ ماہ بحیثیت طالب علم یہاں قیام کر سکے، اس دوران وہ شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ، مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ، مولانا محمد اسحاق ندویؒ اور مولانا حمید الدینؒ جیسے اساتذہ سے استفادہ کیا اور حضرت مولانا اویس ندوی نگرامیؒ کے مشورہ سے ان کے قصبہ نگرام کے مدرسہ معدن العلوم میں مدرس ہوگئے اور ایک اچھا تعلیمی اور تربیتی وقت گذارنے کا وہاں موقع ملا۔

دارالعلوم دیوبند میں علمی مشغولیت

۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے منسلک ہوکر کئی کتابیں تصنیف کیں، ۷ سال تک اس شعبہ سے متعلق رہنے کے بعد ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کے منتظم مقرر ہوئے اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب نو کا بیڑہ اٹھایا، ۱۲؍جلدوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی کے فتاویٰ کی تدوین کی اور یہ فتاویٰ شائع ہوئے، اس کے علاوہ دیگر فتاویٰ کی ترتیب وتدوین میں پورا حصہ لیا اور وہ بھی زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں، مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے مختلف علمی اور تدریبی شعبوں کی سرپرستی کی اور اس کے ذریعہ سے بہت سے ذہین اور ہونہار طلباء کے اندر علمی اور تفسیری مطالعہ کا شوق پیدا کیا اور انھوں نے ان کی بہترین رہنمائی میں اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا، دارالعلوم کے بہت سے شعبوں کو اپنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا، دارالافتاء میں صدر مفتی کا منصب آپ کو عطا کیا گیا، رسالۂ ''دارالعلوم'' میں اداریہ لکھنے اور اس کی سرپرستی کے فرائض بھی آپ نے انجام دیے اور ۱۴۲۹ھ تک

دارالعلوم کو اپنے علمی فیوض سے فائدہ پہونچاتے رہے، لیکن برکت عمر کی وجہ سے کمزوری حد درجہ کو پہونچ گئی، تو ذمہ داران دارالعلوم سے معذرت کے ساتھ سبکدوشی کی درخواست کی اور اپنے وطن عزیز میں قیام فرمایا۔

مفتی صاحب مرحوم نے ہر اعتبار سے ایک کامیاب استاد، انشاء پرداز اور افتاء میں مہارت کے ساتھ ساتھ جملہ دینی اور اخلاقی صفات کے ساتھ زندگی گذاری، دارالعلوم دیوبند میں اتنے طویل المدۃ قیام کے باوجود بحیثیت استاد کے نمایاں نہ ہوسکے، جب کہ وہ تعلیم وتربیت کے فن سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ وہ اس فن سے پوری طرح مسلح تھے اور حدیث وفقہ کی کتابوں کو درجات علیا میں پڑھانے کی استعداد کامل رکھتے تھے، ہوسکتا ہے اس میں کوئی انتظامی مصلحت رہی ہو، لیکن یہ سوال ان سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوکر رہتا ہے۔

مفتی صاحب کے قابل صد افتخار اساتذہ

مفتی صاحب کے اساتذۂ کرام میں سرفہرست محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ جن کے زیر تربیت رہ کر مفتی صاحب نے عالمانہ زندگی کا درس حاصل کیا، مطالعہ کی گہرائی، مسائل میں باریک بینی، ائمہ اسلام کی حیات وخدمات کا مطالعہ، علم دین کی اہمیت کے ساتھ حسنات دنیا سے پوری واقفیت، یہ ساری چیزیں حضرت محدث جلیل کی تربیت میں رہ کر ان کو سیکھنے کا خوب موقع ملا، ان کے دیگر غیر رسمی اساتذہ کرام میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ جیسی نادرۂ روزگار ہستیاں شمار کی جاتی ہیں۔

برادر مکرم حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ سے بے تکلفانہ مراسم

دوران قیام دارالعلوم دیوبند مفتی صاحب مرحوم کا محبانہ تعلق ہمارے برادر اکبر حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب اعظمیؒ سے بہت بے تکلفانہ تھا، اکثر یہ حضرات مجلسوں کی زینت بنتے تھے اور اپنے علم و آگہی سے دوسروں کو فائدہ پہونچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے اور صدق دلی کے ساتھ یہ دونوں حضرات اخیر تک ایک دوسرے سے برادرانہ اور محبانہ تعلق میں مشہور تھے، حکیم صاحب مرحوم اپنی چائے کی مجلسوں میں اکثر مفتی صاحبؒ کو دعوت دیتے اور شرکت کرنے کی درخواست کرتے تھے، مفتی صاحب انتہائی خوشی اور انبساط کے ساتھ تشریف لاتے اور جب تک وقت ساتھ دیتا علمی، دینی اور ادبی معلومات میں تبادلۂ خیال کرتے اور زندہ دلی اور فوائد علمیہ کی ایک بہتر فضا قائم کرکے ایک دوسرے سے جدا ہوا کرتے تھے، مختلف مواقع پر حکیم صاحب مرحوم مفتی صاحب کی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے اور وہیں ایک لطیف اور مفید مجلس منعقد ہوجایا کرتی تھی، بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے کا احترام و اعتماد مجلس کی زینت میں اضافہ کا باعث بنتا تھا اور جملہ اہل تعلق اس سے مستفید ہوتے تھے۔

مفتی صاحب نے تاحیات اپنے بنیادی ادارے مفتاح العلوم مئو سے مخلصانہ تعلق قائم رکھا، وہ حضرت محدث جلیل کے مشورہ سے وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے، جب بھی کوئی اہم موقع ہوتا، مفتی صاحب وہاں بلائے جاتے تھے، مفتاح العلوم کے ایک عظیم جلسۂ تقسیم اسناد میں جو غالباً ۱۹۵۳ء میں جامع مسجد کے وسیع میدان میں ہوا، مفتی صاحب نے جلسہ کے تنظیمی امور میں خاطر خواہ حصہ لیا اور اپنے استاد و مربی حضرت محدث اعظمی کی ہدایات کے مطابق وہاں کی سرگرمیوں میں مشغول رہے، مفتاح العلوم سے فراغت کے بعد

جہاں کہیں بھی تعلیمی اور تربیتی اعتبار سے قیام کیا، برابر محدث اعظمیؒ سے رابطہ رکھا اور ان کی ہدایات کے مطابق کام کیا، ان کی وفاداری کا حال یہ تھا کہ جب بھی وہ اپنے وطن جاتے یا وہاں سے واپس ہوتے مربی جلیل اور اساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے مئو میں بریک جرنی (Break Journey) کرتے، یا مزید کچھ وقت گذارنے کے بعد اپنے وطن واپس جاتے، محدث اعظمیؒ سے اپنے خاص الخاص تعلق کی بنا پر ان سے تعلق رکھنے والے ہر فرد سے اور ان کے خاندان کے جملہ افراد سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کی صدارت

دارالعلوم دیوبند میں قیام کے دوران وہاں کے دارالافتاء میں مفتی دارالعلوم کے صدر مفتی کے منصب پر فائز ہوئے تو اسلامی فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ذمہ داروں نے ان سے درخواست کی کہ اس اکیڈمی کے رئیس کا منصب قبول فرما کر اپنی ہدایات اور مشوروں سے اس کے لیے ترقی کی راہ عمل تجویز فرمائیں اور اپنی تجاویز سے ارکان اکیڈمی کو مستفید فرمائیں، الحمد للہ انھوں نے اس پیش کش کو قبول فرمالیا اور تاحیات اکیڈمی کے منصب صدارت پر فائز رہے، اکیڈمی کے سکریٹری جنرل حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ہیں اور سیمینار کے انعقاد کے سکریٹری حضرت مولانا عبید اللہ الاسعدی ہیں، جب تک صحت نے ساتھ دیا، مفتی صاحب نے سیمیناروں میں شرکت فرمائی اور اپنی نگارشات اور تقریروں سے فقہ اسلامی کی روشنی میں مسائل جدیدہ کا حل تلاش کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اہم ترین ارکان میں تھے اور فقیہانہ بلندی سے مسائل اور بورڈ کے سیمیناروں اور اجلاس کے ایجنڈے پر غور کرکے اپنی رائے دیا کرتے تھے اور بورڈ کے سبھی جلسوں میں شرکت فرماتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی تیاری میں مفتی صاحب کی سرگرمی

مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندویؒ نے ۱۹۷۵ء میں ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن منعقد کرنے کا فیصلہ فرمایا اور مجلس انتظامی نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کردی تو ندوۃ العلماء کے دارالافتاء کے فتاویٰ کی جمع وتدوین کے لیے حضرت مولانا کی نظر انتخاب مفتی صاحب مرحوم پر پڑی اور دارالعلوم کے ذمہ داروں سے خط وکتابت کرنے کے بعد ان کو کم ازکم دو مہینے تک ندوہ میں قیام کرنے کے لیے بلالیا، اس موقع پر مفتی صاحب سے جب میں ملا تو انھوں نے بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ سعیدالرحمٰن ! میں اب تمہارا مہمان ہوں، میں نے عرض کیا: میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہوسکتی ہے، چنانچہ ندوہ کے دوران قیام اور پچاسی سالہ اجلاس کی تیاریوں کی مشغولیت کی بنا پر بہت زیادہ خدمت کا موقع نہ مل سکا، مختلف مواقع سے دارالعلوم سے باہر اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلنے کی درخواست کیا کرتا تھا، تاکہ وہاں دوپہر کا کھانا نوش فرمائیں اور کھانے کے بعد عصر تک آرام فرمائیں، الحمدللہ اس طرح کے مواقع اُن اوقات میں بھی پیش آتے، جب وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی میٹنگ یا اجلاس کے موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء، دیگر ارکان اور علماء کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے، کئی اہم حضرات سے وہ اپنی خاص شفقت کے ساتھ میرا تعارف کراتے اور انتہائی شفقت کے ساتھ یہ بھی فرماتے کہ سعیدالرحمٰن میرے شاگرد ہیں، مجھے بہت خوشی ہوتی تھی اور جی چاہتا تھا کہ میں مفتی صاحب کے قدموں میں رہ کر زندگی گزاردوں۔

احقر پر مفتی صاحب کی شفقت

اجلاس ندوۃ العلماء کے دورانِ قیام مفتی صاحب کو یہاں کی آب وہوا اور کھانا موافق نہیں آتا تھا، ہم نے گذارش کی کہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے گھر کا پکا ہوا ٹوٹا پھوٹا کھانا آپ کی خدمت میں لایا کروں، لیکن انھوں نے مجھے اس کی مستقل اجازت نہیں دی، اس لیے مواقع کے انتظار میں رہا کرتا تھا، تاکہ مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع ملے، انھوں نے مجھے ہر موقع پر بہت دعائیں دیں اور ان کی دعاؤں سے مجھے فائدہ پہونچا، مجھے یاد ہے کہ کئی بار مفتی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العماء میں کچھ طلباء کے داخلہ کے سلسلہ میں مجھے خط لکھا اور میں نے اس کی تعمیل کرنے کی پوری کوشش کی، ندوہ کے تمام ذمہ دار حضرات اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ مفتی صاحب کا بہت احترام اور خاص خیال فرماتے تھے۔ کسی موقع سے جب یہاں تشریف لاتے تو ان کے قیام وطعام کا خاص اہتمام فرمانے کا حکم فرماتے اور اکثر مجھے فرماتے کہ دیکھو! مفتی صاحب کا خیال رکھنا۔

مفتی صاحب کے صاحبزادگان

مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے جناب احمد سجاد قاسمی صاحب اپنے وطن دربھنگہ کے ہائی اسکول میں استاد ہیں، دوسرے صاحب زادے جناب حماد میاں صاحب جامعہ رحمانی مونگیر اور دیوبند سے فارغ ہوئے اور تیسرے صاحب زادے جناب عباد میاں صاحب مفتی صاحب کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں حفظ کیا، اب دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

مفتی صاحب کے خط کا ایک حصہ جو انھوں نے ۱۳۹۲ء یعنی آج سے چالیس سال پہلے برادر مکرم حضرت مولانا نور عالم صاحب امینی کی خدمت میں بھیجا تھا، اس کا ایک حصہ نقل کرنا یہاں مفید ہوگا، اس لیے ان کی کتاب ''پس مرگ زندہ'' سے مفتی صاحب کے خط کا یہ ٹکڑا نقل کیا جارہا ہے۔

''.....عزیزم سجاد احمد سلمہ فراغت کے بعد گھر گئے تھے، ابھی شوال میں ان کو ''سانحہ'' بھیج کر آیا ہوں، وہاں وہ میٹرک کی تیاری میں ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب فرمائے اور میاں حماد سلمہ کو جامعہ رحمانی مونگیر بھجوادیا ہے، اس لیے کہ سانحہ سے قریب ہے، میاں احمد سجاد اس کی نگرانی بھی کریں گے، البتہ عباد سلمہ کو اپنے ساتھ لایا، وہ یہاں حفظ کررہے ہیں۔

مولانا علی میاں مدظلہ، مولانا سعید الرحمٰن سلمہ اور مولانا شمس تبریز سے سلام مسنون عرض ہے، اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں، میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے، اس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالب علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ اور مولانا ناظم صاحب اور مولانا اسحاق صاحب دامت برکاتہم، یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گوندوہ والے یہ نہیں جانتے۔

طالب دعا

محمد ظفیر الدین، دارالعلوم دیوبند

شب ۶/ذی قعدہ، ۱۳۹۲ھ''

سانحۂ وفات

۲۵/ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ مطابق ۳۱ مارچ ۲۰۱۱ء کو ۸۵ سال اور ۲۵

دن اس دار فانی میں اپنے علم وتقویٰ اور تواضع، وسعت نظر اور بلندیٔ فکر کی ایک مثال قائم کرکے راہیٔ دار آخرت ہوئے اور علمی دنیا میں ایک ایسا خلا پیدا کرگئے جو مشکل سے پر ہوتا ہے اور علم وعمل کی دنیا میں اس کو ایک بڑے نقصان سے تعبیر کیا جاتا ہے:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کے درجات بلند فرمائے، انھوں نے علم وعمل کی جامعیت کے ساتھ اللہ کے دین اور اس کی شریعت اور کتاب وسنت کے علم کو پھیلانے اور اس کے مطابق زندگی گذارنے اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانے کی جو سعی بلیغ کی ہے اللہ اس کو قبول فرمائے اور دار آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور جنت الفردوس کی بہاروں سے پوری طرح سرفراز فرمائے۔ (آمین)

اس موقع پر یہ عرض کرنا شاید مناسب ہو کہ مفتی صاحب کے مفتاح العلوم مئو کے زمانۂ تعلیم میں حضرت محدث جلیل، شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے اور حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی علوم اسلامیہ کے درجات علیا میں استاذ ومربی تھے اور میرے والد ماجد حضرت مولانا محمد ایوب صاحب اعظمی مفتاح العلوم کے ناظم اور علوم دینیہ وعقلیہ کے استاد تھے اور دیگر بڑے اساتذۂ کرام کا ذکر اس مقالہ میں واضح طریقہ سے آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو غریق رحمت فرمائیں اور ان کی خطاؤں اور لغزشوں کو معاف فرماکر جنت الفردوس کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے ایک لاکھ فتاویٰ تحریر فرمائے

مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری☆

۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء بروز پنجشنبہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی مفتی دارالعلوم دیوبند کے انتقالِ پر ملال کی خبر ملی، انا للہ وانا إلیہ راجعون! اس اندوہ ناک خبر سے دارالعلوم دیوبند غم والم کی تصویر بن گیا۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات صرف ان کے پس ماندگان کے لیے حادثہ نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند اور مسلمانانِ ہند کے لیے عظیم حادثہ ہے، مرحوم کی وفات سے علم وفقہ اور تصنیف وتالیف کے میدان میں بڑا خلا پیدا ہوگیا، اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کو آپ کا بدل عنایت فرمائیں!

حضرت مفتی صاحبؒ راقم الحروف سے محبت وخلوص کا تعلق رکھتے تھے، اگر ملاقات میں دیر ہوجاتی تو غریب خانہ پر تشریف لاتے، ضعیفی کی وجہ سے جب وطن چلے گئے تو وہاں بھی یاد کرتے اور آنے والوں کی معرفت ہدیۂ سلام بھیجتے، رب کریم نے آپ کی ذات میں محبوبیت اور کشش رکھی تھی، آپ کے اندر لکھنے پڑھنے کا انہماک قابلِ رشک تھا، وسعتِ علم، اصابتِ رائے، خلوص وللّٰہیت، دینی وملی فکر مندی، جہدِ مسلسل اور قلم کی تیز گامی میں بے مثال تھے، سادگی اور عزلت نشینی کے

☆ شیخ الحدیث وصدر المدرسین، دارالعلوم دیوبند، سہارن پور

عادی تھے، اکثر علم وتحقیق میں لگے رہتے تھے، تین درجن کے قریب تصانیف چھوڑیں، بارہ جلدوں تک ''فتاویٰ دارالعلوم'' مرتب کیا، دارالعلوم کے کتب خانہ کی ترتیب بھی آپ ہی کی مرہونِ منت ہے، مخطوطات کا دو ضخیم جلدوں میں تعارف لکھا۔ دارالعلوم میں نصف صدی سے زیادہ رہے اور بے مثال خدمات انجام دیں، ایک لاکھ کے قریب فتاویٰ تحریر فرمائے، آپ کی رحلت سے دارالافتاء کا مسند سونا پڑ گیا۔

ہم سب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر غم گین ہیں، ان کے لیے اور ان کے پس ماندگان اور وابستگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائیں اور جنت میں بلند درجات عطا فرمائیں۔ (آمین یارب العالمین)

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب

یادوں کے چراغ

مولانا (مفتی) فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی ☆

وقت کا کارواں رَواں دَواں ہے اور اتنا تیز رفتار ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب کتنا وقت گذر گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو آدھی صدی گذر چکی ہے جب ضلع دربھنگہ کے رہنے والے مولانا ظفیر الدین صاحب دیوبند میں وارد ہوئے تھے۔

ان سے غائبانہ طور پر ابتدائی تعارف اُن کی دو معروف کتابوں کے ذریعے تھا۔ ایک ''اسلام کا نظام مساجد'' اور دوسری ''اسلام کا نظام عفت وعصمت''۔

یہ دونوں کتابیں محترم تائے ابا مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنے ادارے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کی تھیں۔ اُس زمانے میں ندوۃ المصنفین سے کسی مصنف کی کتاب کا شائع ہونا اُس کے لئے بڑے فخر کی بات ہوتی تھی۔ ہندوستان میں علمی اور تحقیقی میدان میں کام کرنے والے دو ہی ادارے تھے ایک دارالمصنفین اعظم گڈھ اور دوسرا ندوۃ المصنفین دہلی۔ ان اداروں نے مختلف علمی گوشوں میں جو تحقیقی کام کیا ہے وہ اپنے معیار کے اعتبار سے کسی بین الاقوامی ادارے سے کم نہیں ہے۔

☆ سرپرست دارالسلام اسلامی مرکز، مالیرکوٹلہ، پنجاب

تصنیف کی ابتدائی منزل میں ہی مولانا ظفیر الدین صاحب کی یکے بعد دیگرے دو کتابوں کا ایک وقیع علمی ادارے سے شائع ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علمی دنیا میں خاصے معروف ہوگئے۔ اور شاید اسی کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند جیسے مرکزی ادارے میں اُن کی خدمات حاصل کی گئیں۔

دارالعلوم دیوبند میں نشر واشاعت کا ایک شعبہ تھا جس سے مختلف کتابیں چھاپی جاتی تھیں۔ یہ ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ دارالعلوم کی مسند حدیث پر رونق افروز تھے۔ جمعیۃ العلماء ہند کا بڑا زور وشور تھا اور وہ اس کے بھی صدر تھے۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیۃ العلماء کے ناظم اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے۔ اُسی زمانے میں جماعت اسلامی ہند کے دارالعلوم کے حلقوں میں چرچے ہونے لگے۔

اُس زمانے میں دارالعلوم کے شعبہ نشر واشاعت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ان کی جماعت، جماعت اسلامی کے خلاف کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا ''جماعت اسلامی کا دینی رُخ'' کے نام سے کئی حصوں میں ایک کتاب آئی اور بھی کئی کتابیں دارالعلوم سے چھپیں۔ مولانا مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن دونوں ہی سرکردہ حضرات جماعت اسلامی کے سخت خلاف تھے۔

اُسی زمانے میں مولانا ظفیر الدین صاحب کو دارالعلوم کے شعبہ ردِّ مودودیت کے لئے بلایا گیا اور اُن کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ جماعت کے خلاف اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔

مولانا تشریف لائے تو ابتداء میں ہی میرے والد صاحب قاری جلیل الرحمٰن عثمانی اور ہمارے پورے گھرانے سے اُن کا قریبی تعلق قائم ہوگیا۔ اور شاید اس کی بہت بڑی وجہ تائے ابا مرحوم مفتی عتیق الرحمٰن سے ان کا تعلق بھی تھا۔ اکثر

تشریف لاتے تھے، دعوتیں ہوتی تھیں، ملنا جلنا رہتا تھا اور وہ والد صاحب سے بہت مانوس ہوگئے تھے۔

سب سے پہلے ان کا دفتر، دفتر اہتمام کے اوپر کی منزل میں قائم ہوا تھا جو بعد میں مولانا فخر الحسن صاحب کو دیدیا گیا تھا۔ مولانا اُس کمرے میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے اور اُن کی سب سے پہلی کتاب اور مودودیت پر آخری کتاب ''جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' کے نام سے دارالعلوم کے شعبہ نشرواشاعت نے شائع کی۔

ظاہر ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کے لیے مولانا کو جماعت اسلامی کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کے بعد اُن کے خیالات بہت کچھ بدل چکے تھے اور وہ یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے تھے کہ جماعت اسلامی سے ہمارے بنیادی اختلافات نہیں ہیں، اُن کو سلجھایا جاسکتا ہے۔

بہرحال اس کتاب کے بعد ردِّ مودودیت کے موضوع پر مولانا نے شاید کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ہم بھی اُس زمانے میں دارالعلوم میں ملازم ہوگئے تھے، کئی شعبوں سے نکلتے ہوئے، ترتیبِ فتاویٰ کے شعبے میں مولانا کے پاس پہنچ گئے۔ پہلے ہماری تنخواہ سے ایک پیسہ فی روپیہ ردِّ مودودیت کی مد میں کٹا کرتا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد غالباً بند ہوگیا۔

●

ترتیبِ فتاویٰ کا شعبہ یہ تھا کہ جدامجد مفتی اول دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاویٰ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جس کا ریکارڈ دارالعلوم میں محفوظ تھا، اُس کو مرتب کرکے اور حواشی اور حوالوں کا اضافہ کرکے (جس کو آج کل کی زبان میں ''ایڈیٹ'' کرنا کہتے ہیں) شائع کرنا تھا۔

اس کے لیے الگ شعبہ قائم ہوا، اور جگہ دارالافتاء موزوں سمجھی گئی۔ مولانا

ظفیر الدین صاحب ردِّ مودودیت کے بجائے مرتب فتاویٰ دارالعلوم کے طور پر خدمت انجام دینے لگے۔ اُن کے ساتھ معاون کے طور پر مولانا اکمل صاحب کام کیا کرتے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی مولانا اصلح الحسینی جو کسی زمانے میں دارالعلوم کے شعبہ فارسی میں مدرس تھے، وہ پاکستان چلے گئے تھے۔ مولانا اکمل صاحب بھی اپنے بھائی سے ملنے کے لئے پاکستان گئے اور پھر وہ بھی وہیں کے ہورہے اور واپس نہیں آئے۔

اُن کی خالی جگہ پر اس ناچیز کا تقرر کردیا گیا۔ اِس طرح مولانا ظفیر الدین صاحب کے ساتھ اور زیادہ قریب ہونے کا اور ان کی عادت واخلاق کے مطالعے کا موقع ملا۔

مولانا کی عادت تھی کہ خاموشی کے ساتھ کام میں لگے رہتے تھے، نہ کبھی ڈھنڈورا پیٹتے تھے، نہ کام کا بہت چرچا کرتے تھے اور بڑے سے بڑے کام کو مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دے کر پورا کرلیتے تھے۔

ترتیبِ فتاویٰ کا کام بھی انھوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ انجام دیا اور یہاں آکر اُن کے علمی جوہر کھلے جب انھوں نے فتاویٰ پر قیمتی حواشی تحریر فرمائے۔ یہ اُنہیں کا دَم تھا کہ ارکانِ مجلس شوریٰ مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور دوسرے حضرات کو اعتماد میں لے کر اس کی بارہ جلدیں مرتب کرکے شائع کردیں۔

اُن کے ساتھ کام کرنے میں بڑا لطف آتا تھا، اُن میں بے تکلفی بھی تھی، سادگی بھی اور اخلاق بھی، کبھی یہ دباؤ نہیں ڈالتے تھے کہ اتنا کام پورا ہونا چاہئے۔ بلکہ اپنی طبیعت پر چھوڑ دیتے تھے۔ دل چاہا تو بہت سا کام کرلیا اور اوقات کے بعد بھی کام کرتے رہے۔ کبھی طبیعت میں آمادگی نہیں ہے تو مولانا سمجھ جاتے تھے اور کبھی ان کی طرف سے یہ تقاضا نہیں ہوتا تھا کہ اتنا کام پورا ہوجانا چاہئے۔

اس لیے ہم لوگ ملازمت سمجھ کرنہیں بلکہ اس کو اپنا کام سمجھ کر ذوق وشوق سے انجام دیتے تھے۔ مجھے اُن کے ساتھ رہنے میں علمی فائدہ بھی ہوااور بڑی بات یہ کہ مطالعہ کرنے اور لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگیا۔

ہمارے بے تکلف دوستوں میں مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی، مولانا سید عبدالرؤف عالی اور مولانا وحیدالزماں کیرانوی۔ ان سب کی نشست اور مجلس مولانا ظفیر الدین صاحب کے ساتھ رہتی تھیں۔ کبھی ہم ان کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ کبھی وہ ہمارے یہاں آجاتے تھے۔

●

کچھ عرصے کے بعد میں درجہ فارسی میں مدرس ہوگیا تو مولانا ظفیر الدین صاحب کو ضمنی طور پر دارالعلوم کے کتب خانے کی نئی ترتیب کا کام سپرد کیا گیا۔ وہ کئی سال تک اس کام کو بھی انجام دیتے رہے۔ میری درسگاہ کتب خانہ دارالعلوم کے نیچے تھی۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ہمارے درمیان اخباروں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ ایک اخبار میں منگاتا تھا، مولانا پڑھتے تھے اور دوسرا اخبار جو کتب خانہ میں آتا تھا وہ ہمیں بھی پڑھنے کو بھیجا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں کچھ دلچسپ معاملات بھی پیش آئے۔ کتب خانہ دارالعلوم کے ناظم مولانا سلطان الحق بجنوری تھے اور یہ دارالعلوم میں مدنی پارٹی کا دماغ سمجھے جاتے تھے۔ جب مولانا ظفیر الدین صاحب کو کتب خانے کی نئی ترتیب کا کام سونپا گیا تو ابتداء میں یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاید وہ مولانا سلطان الحق کی جگہ لے لیں گے اور ان کو ناظم کتب خانہ بنادیا جائے گا۔

مگر مولانا ظفیر الدین صاحب نے اپنے رویے اور سب کے ساتھ محبت و خلوص کے برتاؤ سے یہ اچھی طرح ظاہر کردیا کہ اُن کی ایسی کوئی اُمنگ نہیں ہے اور انھوں نے مولانا سلطان الحق صاحب کا بھی اعتماد حاصل کرلیا۔

درجہ فارسی میں عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں، جن میں نحو میر وغیرہ کا سبق ہمارے سپرد تھا۔ ایک روز اچانک اُس وقت کے ناظم تعلیمات اور شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب میری درسگاہ میں تشریف لے آئے، طلباء کا سبق سنا تو سب کو یاد نکلا۔

مولانا نے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ درسگاہ میں اخبار پڑھتے ہیں، اب میں سمجھا کہ مولانا کا آنا اصل میں کس وجہ سے ہوسکتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ جی ہاں! میں اخبار ''دعوت'' پڑھتا ہوں۔

اُس زمانے میں اخبار دعوت کا پڑھنا دارالعلوم کے احاطے میں بڑا عجیب ہوتا تھا۔ اُس وقت دعوت روزنامہ تھا اور پورے دارالعلوم میں صرف روزنامہ الجمعیۃ پڑھا جاتا تھا۔ مگر میری خواہش ہوتی تھی کہ دونوں اخبار مطالعے میں آجائیں اور اس کے تبصرے نظر سے گذریں..... مولانا فخرالدین صاحب یہ سن کر تھوڑے سے حیران ہوئے۔ تو میں نے عرض کیا کہ حضرت پڑھتا وڑھتا تو کچھ نہیں ہوں، مجھے یہاں موقع ہی نہیں ملتا۔ البتہ اخبار والا درسگاہ میں ڈال جاتا ہے اور میں اوپر مولانا سلطان اور مولانا ظفیر صاحب کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ اس کو پڑھ لیتے ہیں اور مجھے الجمعیۃ بھیج دیتے ہیں۔ میں اُس کو دوپہر کو گھر جاکر پڑھ لیتا ہوں اور ظہر کے بعد واپس لاکر ان کو دے دیتا ہوں۔ اس طرح دونوں اخبار ہم سب پڑھ لیتے ہیں۔

اُسی زمانے میں مولانا ظفیر الدین صاحب کے صاحبزادے احمد سجاد میرے پاس درجہ فارسی میں پڑھا کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین بہاری صاحب کے صاحبزادے محمد حسن بھی اُسی زمانے میں میرے پاس پڑھتے تھے۔ یہ دونوں ہی پڑھنے میں ماشاءاللہ بہت ہوشیار تھے۔

مولانا بہاری اور مولانا ظفیر الدین صاحب کے کمرے دارجدید کے شمال کی طرف برابر برابر تھے اور دونوں میں بڑے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا بہاری

ہمارے استاذ تھے۔اس لئے اگر وہ مجلس میں ہوتے تو ہمیں تکلف رہتا تھا، مولانا سمجھ جاتے اور کسی بہانے سے اٹھ کر چلے جاتے تھے۔

دارالعلوم میں جو لوگ عصر کے بعد ٹہلنے کے مریض تھے اُن میں مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ اور مولانا ظفیر الدین صاحب خاص طور پر ممتاز تھے۔ یہ لوگ میلوں ٹہلتے تھے۔ دیوبند کے ٹہلنے والوں میں ایک شخصیت مولانا عامر عثمانی کی بھی تھی۔ وہ عصر بعد اور عشاء کے بعد ٹہلنے کے لیے نکلتے تھے۔مگر زیادہ دور نہیں جاتے تھے۔ اس لیے عشاء کے بعد ٹہلنے میں ہم ان کے ساتھ ہوجاتے تھے۔مولانا عامر عثمانی تو ہوائی جہاز میں بھی ٹہلنے سے باز نہ آئے اور وہاں کے سارے اصول وضوابط توڑ کر تھوڑے سے ٹہلے ضرور۔ اس پر ہماری مجلسوں میں غالب کے شعر کو توڑ موڑ کر اس طرح پڑھا جانے لگا کہ ؎

ٹہلے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
آشفتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

مولانا ظفیر الدین صاحب نے اسی لگن کے ساتھ کتب خانے کی ترتیب بھی پوری کی اور آخر مستقل طور پر مفتی دارالعلوم کے منصب کو سنبھال لیا۔

میں ۱۹۷۳ء میں مالیر کوٹلہ آ گیا تھا، مگر وہ دیرینہ تعلقات جو شروع سے قائم تھے ہمیشہ رہے اور اُن کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مولانا ظفیر صاحب کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ حتی الامکان دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ یہاں مالیر کوٹلہ میں میرے ایک فتوے پر بڑا تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ طلاق کا معاملہ تھا۔شوہر نے یہاں کی زبان میں اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ ''میں نے چھڈّی''۔ اردو میں یعنی میں نے تمہیں چھوڑ دیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ''چھوڑ دیا'' کنایہ ہے، اس سے طلاق بائن واقع ہوگی۔معاملہ دیوبند پہنچ گیا۔اُس وقت مفتی احمد علی سعید صاحب بھی دارالافتاء میں ہوتے تھے۔اُن کا اصرار تھا کہ چھڈی یا

چھوڑ دی صریح طلاق ہے، مگر مولانا ظفیر صاحب نے دلائل کے ساتھ میرے فتوے کے حق میں ہی اپنی رائے لکھی۔

مسلم پرسنل لاء بورڈ میں میری رُکنیت کے لئے انھوں نے مولانا منت اللہ رحمانی صاحب سے کہا۔جس کو انھوں نے مان لیا اور مجھے پرسنل لاء بورڈ کا رکن بنا دیا۔مگر مولانا ظفیر الدین صاحب نے کبھی احسان کے طور پر میرے سامنے اس کو نہیں جتایا۔کبھی ذکر آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ آپ کو تو ہونا ہی چاہئے تھا۔حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ انھوں نے خاموشی کے ساتھ یہ بات امیر شریعت کے سامنے رکھی ہے۔

میرے چھوٹے بھائی مفتی کفیل الرحمٰن ایک عرصے تک ان کے ساتھ دارالافتاء میں کام کرتے رہے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ اخلاص ومروّت کا معاملہ کرتے رہے۔اُن کے انتقال پر جامع مسجد دیوبند میں جلسہ ہوا تو بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کی قابلیت اور خدمات کا اعتراف کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ہم لوگ ان سے مشورہ کرتے تھے۔

وہ کسی بھی خوبی کے اعتراف میں بخیل نہیں تھے۔مزاج میں چاپلوسی نہ تھی۔حق بات بے باکی کے ساتھ کہہ دیتے تھے۔دارالعلوم کی تقسیم کا بحران بڑا شدید تھا۔مگر مولانا ظفیر الدین صاحب بڑی استقامت کے ساتھ جمے رہے اور انھوں نے اپنی انفرادیت اس ماحول میں بھی باقی رکھی۔

●

ہمارے دینی اور علمی حلقوں میں ایک بڑی کمی رہی ہے کہ اہل علم کی حوصلہ افزائی کم ہی ہو پاتی ہے۔علمی خدمات انجام دیتے پوری عمر گذر جاتی ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس کا اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔لیکن دنیا میں بھی حوصلہ افزائی کی روایت نبی ﷺ سے ثابت ہے.....آپکی طرف سے مختلف خطابات کا عطا کیا جانا، حوصلہ افزائی کا ایک انداز ہوتا تھا۔

ہمارے اہل علم میں سے اس روایت کو دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے ناظم مولانا رضوان القاسمی مرحوم نے قائم فرمایا۔انھوں نے مولانا ظفیر الدین صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کا اعزاز کیا۔اُن کی کتاب ''اسلام کا نظام مساجد'' اضافے کے ساتھ شائع کی۔اوراُن کی خدمت میں پچاس ہزار روپے کا نذرانہ پیش کرکے ایک اچھی روایت قائم کی۔

اِس ناچیز کے ساتھ بھی مولانا کا طریقہ بڑا حوصلہ افزائی کا رہا۔انھوں نے پانچ دن کے ''خطبات حیدرآباد'' کے نام سے خطباتِ سیرت کا اہتمام کیا اور پھر ان خطبات کو ''نبی رحمتؐ کا پیام رحمت'' کے نام سے شائع کیا۔اس کی کیسٹ بنا کر وہاں لوگوں میں تقسیم کئے اور اس طرح اہل علم کی عزت افزائی کی روایات کو زندہ کیا۔افسوس ہے وہ زیادہ دن اس دنیا میں نہ رہ سکے اوران کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

وقت کہاں رُکتا ہے۔اپنی رفتار سے چلا جا رہا ہے۔ مولانا ظفیر الدین صاحب زندگی بھر علم کی اور دین کی خدمت کرتے رہے اور اپنے اخلاص اور اخلاق سے لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے رکھی۔آج وہ دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں تاحیات رہیں گی۔وہ چراغ روشن رہیں گے جوان کی یادوں نے جلائے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن فرمائے اوران کی اچھی باتوں کی پیروی کی توفیق عطاء فرمائے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ-متنوع کمالات کے حامل

مولانا قاری ابوالحسن اعظمی ☆

ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاحیہ میرے سامنے تھا، بڑی مسجد جونپور میں میرا قیام تھا،صاحب قلم کے نام پر میری نظر پڑی اور پھر تو ہر ماہ بڑی دلچسپی کے ساتھ یہ مضمون پڑھتا، اس طرح غائبانہ جناب مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کی زیارت ہوتی رہی، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں نے بارہ سال تدریس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا اور دارالعلوم کی قدیم مسجد میں دورانِ تعلیم امامت بھی تفویض ہوگئی۔ یہیں صرف ایک ہفتہ کے اندر مسجد کے مستقل مقتدی جناب مولانا حکیم عزیز الرحمٰن صاحب (اب یہ بھی مرحوم ہوگئے) سے قربت ہوئی، میں نے بعد نماز عصر اپنے کمرے میں چائے پر مدعو کیا، حکیم صاحب کے ساتھ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ اور جوان صالح، جید الاستعداد مولانا بدرالحسن دربھنگوی مدیر ماہنامہ ''الداعی'' عربی کے ساتھ ایک بزرگ بھی نظر آئے۔حکیم صاحبؒ نے فرمایا: امام صاحب! آپ سے ملو، آپ ہیں جناب مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب، ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند۔ میں نے مصافحہ کا شرف حاصل کرتے ہوئے عرض کیا، کیا وہی جن کا نام میں ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے افتتاحیہ میں دیکھتا تھا۔فرمایا: ہاں! یہ وہی ہیں۔ پھر کیا عرض کروں، کتنی مسرت ہوئی اور بعد عصر کا یہ سلسلہ میری تعلیم تک رہا۔

☆ صدر شعبۂ قرأت، دارالعلوم دیوبند

میں یہ عرض کردوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری گردن کی رگیں ذرا کچھ سخت بنائی ہیں، میں جلدی سے کسی سے مرعوب ہوتا ہوں اور نہ متاثر! بڑے اور مشہور علماء اور مقررین کی صحبتیں مجھے حاصل تھیں، نہ مجھے بہت بڑا عالم اور مدرس اور نہ بڑا مقرر اور خطیب متوجہ کر پاتا ہے، میں تو صرف اسی عالم سے متاثر ہوتا ہوں جو زبردست علوم وفنون کے ساتھ عمل کا پیکر ہو، یا پھر صاحب قلم ہو اور علمی، تحقیقی اور ادبی نگارشات کا حامل ہو۔

حضرت مفتی صاحب سے شاید اسی وجہ سے قربت روز افزوں ہوئی کہ آپ مختلف موضوعات پر صاحبِ تصانیف تھے، مضامین کا سلسلہ رکھتے تھے اور خوب رکھتے تھے۔

دوسالہ تعلیمی سلسلہ جلد ہی مکمل ہوا اور میرا تقرر دیوبند ہی کے ایک قدیم خادم القرآن مدرسہ اصغریہ میں ہوگیا، اس طرح مفتی صاحب سے ملاقات اور استفادے کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ مفتی صاحبؒ تو ایک عالمِ کامل تھے، مئو اور ندوہ دونوں اداروں کے فیض یافتہ تھے، حضرت محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ کی طویل صحبت اور شاگردی نے آپ کو مجموعۂ کمالات بنا دیا تھا۔

اللہ رب العزت نے آپ کو بہار سے دارالعلوم دیوبند میں بکمال اعزاز پہنچایا۔ آپ کی عظیم تحریری و تصنیفی صلاحیتوں کو پرکھ کر صحیح قدردان حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے آپ کو دارالعلوم دیوبند کے عظیم کتب خانہ کا ناظم بنایا اور پھر آپ نے یہاں تنہا وہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جسے فی زمانہ اکیڈمیاں اور مجالسِ علمی انجام دیتی ہیں یعنی فقیہ النفس، ولی کامل حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ کے فتاویٰ بنام ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کو مرتب فرمایا۔ دارالعلوم دیوبند نے اسے بارہ جلدوں میں شائع کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنی زندگی میں ایک عظیم حادثہ سے گذرے، یعنی دارالعلوم دیوبند میں جب انتظامیہ تبدیل ہوئی تو چوں کہ مفتی صاحبؒ کو حضرت حکیم الاسلامؒ سے گہری عقیدت تھی، اس عقیدت کی سزا ملنی تھی، اور پھر وہی ہوا جو جاہلوں اور نادان دشمنوں کی طرف سے ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ یعنی حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی بھر کی علمی کمائی اور تحقیقاتی وتصنیفاتی اندوختے کو تلف اور برباد کردیا گیا، ایک پڑھے لکھے اور علمی، تحقیقی و تصنیفی مزاج انسان کے لئے اس سے بڑا کوئی صدمہ اور حادثہ نہیں ہوسکتا، بلاشبہ مفتی صاحب کو جیتے جی مار ڈالنے کی یہ گھناؤنی کوشش تھی۔

لیکن آفریں ہے مفتی صاحبؒ نے اس جامِ حوادث کو بڑے صبر وسکون کے ساتھ ہونٹوں سے لگایا اور پی گئے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو صبر وثبات کا بلاشبہ ایک پہاڑ بنایا تھا اور اللہ کی جانب سے اس عطیہ کی بدولت آپ نہ صرف زندہ رہے بلکہ بعد والوں کے لئے ایک نمونہ بھی بنے۔ کتنوں کو مخالفانہ ماحول میں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا، ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اس ذکر وتذکرہ پر بہرحال ایک سرد آہ نکل جاتی تھی۔ آپ کی حیات کا یہ بھی ایک حزیں اور سبق آموز گوشہ تھا جس کی طرف اشارہ ضروری تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے اس دورِ ثانی میں آپ کی ضرورت شعبۂ افتاء میں پیش آئی، آپ نے اپنی فقیہانہ بصیرت اور تبحرِ علمی کا یہاں بھی خوب خوب ثبوت دیا۔

آخر میں آپ حضرت مولانا بہاری صاحبؒ اور حکیم عزیز الرحمٰن صاحبؒ کے وصال کے بعد خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ شبانہ روز کے معمولات تو علیٰ حالہٖ رہے، بعد عصر کو آپ نے مولانا عبدالخالق صاحب مدراسی استاذ حدیث و نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے پاس وقف کردیا تھا، جب تک دارالعلوم میں رہے آپ کی شام یہیں گذرتی، میں بھی حاضر ہوتا تھا، آپ اکثر خاموش ہی رہتے، کبھی

کسی سوال کے جواب میں کچھ فرمادیتے۔

آج مدارس کا حال عجیب وغریب ہوکر رہ گیا ہے۔ اب مدارس میں قابلیت اور کارکردگی کی نہیں، تملق اور حاضر باشی کی قدر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ مدارس اب بانجھ ہونے لگے ہیں اور مدارس کے اندر علم وتحقیق کی فضا تقریباً ختم سی ہوکر رہ گئی ہے۔

مدارس دینیہ اور مراکز علمیہ کے اربابِ حل وعقد جتنی جلد ممکن ہو اس صورتِ حال سے مدارس کو بچالیں کیوں کہ یہ ایک عظیم خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ آمین

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے گوناگوں کمالات اور خوبیوں کے باعث بلاشبہ ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ بال بال آپ کی مغفرت فرمائے، آپ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

●●●

ترکش مارا خدنگ آخریں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی ☆

گذشتہ ایک صدی یا اس سے کچھ کم کے زمانہ پر نظر ڈالیے، آسمان علم و ادب پر کیسے کیسے آفتاب اور ماہتاب چمکتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اگر صرف ناموں کی فہرست تیار کی جائے تو اس کے لیے بھی ایک پورا صفحہ درکار ہوگا، وہ سارے آفتاب و ماہتاب غروب ہوگئے، وہ کہکشائیں روپوش ہوگئیں۔ اس خوبصورت بہار کو دیکھنے والے جو لوگ رہ گئے تھے وہ بھی رخصت ہوتے جارہے ہیں۔ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کا نام بھی نواسنجان گلشن کے ان چند آخری پرندوں میں سے ہے جو پرواز کرچکے ہیں۔ غالب کی زبان میں - یادگارِ رونق محفل جو پروانے کی خاک باقی رہ گئی تھی بادصبا نے اس کو بھی نہ چھوڑا اور باقی رہنے نہ دیا-۔

۱۹۶۲ء میں راقم سطور کا دارالعلوم دیوبند میں داخلہ ہوا تھا، میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے پڑھ کر آیا تھا، داخلہ موقوف علیہ میں ہوا تھا، داخلہ کے امتحان میں ہر موضوع سے متعلق کتاب کی عبارت خانی اور تشریح سے ممتحن حضرات بہت ہوش ہوئے البتہ منطق کی کتاب سلّم کا امتحان لیا گیا تو اس کی عبارت سر کے اوپر سے گذر گئی اور سمجھ میں نہیں آیا کہ مصنف کیا کہنا چاہتا ہے۔ لگتا تھا کہ یہ عربی نہیں کسی اور زبان کی کتاب ہے۔ بہرحال داخلہ کے بعد مہمان خانے کے عقب کی عمارت کے ایک کمرے میں میرا قیام ہوا۔ مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی دارالعلوم کے صدر

☆ ڈین فیکلٹی آف لنگویجز، ای فل یونیورسٹی، حیدرآباد

دروازے سے متصل مسجد کے قریب بالائی منزل کے ایک کمرے میں رہتے تھے، ان کا تعلق بہار سے تھا اور امارت شرعیہ کے ذمہ داروں سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ اس رشتہ سے بہت جلد ان سے میں مانوس ہوگیا اور میں بے تکلف ان کے کمرے میں چلا جاتا اور مختلف موضوعات پر ان سے باتیں کرتا، وہ بھی مجھ پر شفقت فرماتے اور ندوۃ العلماء کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھتے اور میں اکثر ان کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمانہ زندگی کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ماحول کی بہت سی چیزیں میرے ذوق پر گراں گذری تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ مجھے دالعلوم دیوبند کے مقام ومرتبہ کا اندازہ نہیں تھا۔ ندوۃ نے اگر مؤرخ اور تاریخ نویس شخصیتیں پیدا کی ہیں تو دیوبند نے تاریخ ساز شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں بھی اس کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب از راہِ شفقت ومحبت جب مجھ سے یہ پوچھتے کہ تمھیں ان دونوں اداروں میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟ تو میں بے تکلف کہتا کہ ندوے میں طلبہ کو کھانا عزت واحترام کے ساتھ ان کے کمروں میں پہونچایا جاتا ہے، یہاں طلبہ پلیٹ اور پیالہ لے کر آتے ہیں اور مطبخ کے پاس لمبی لائن لگاتے ہیں، مجھے یہ منظر بہت برا لگتا ہے۔ پھر میں نے انھیں بتایا کہ ان دونوں اداروں کے نظام تربیت میں بھی بہت بڑا فرق ہے۔ ندوہ کے ہر ہوسٹل میں ایک نگراں ہوتا ہے اور بغیر نگراں کی اجازت کے طالب علم ندوے کے گیٹ کے باہر اور کہیں بازار بھی نہیں جاسکتا ہے۔ دیوبند میں ہوسٹل کے نگراں صرف نام کے لیے ہوتے ہیں اور وہ کبھی طلبہ کو دیکھنے نہیں آتے اور طلبہ جب چاہیں دہلی، سہارن پور، مظفر نگر اور کہیں بھی گھومنے جاسکتے ہیں۔ نماز تک کے لیے طلبہ کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے مختلف مسلک کے ماننے والوں سے مناظرہ کی مشق اور صدر دروازہ کی دیواروں پر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے خلاف قلمی مضامین ''کارملاّ فی سبیل اللہ فساد'' کا

منظر پیش کرتے ہیں۔ اتحاد امت میں رخنہ اندازی کی باتیں مجھے پسند نہیں آتی ہیں میں ان کا تذکرہ بڑی بے تکلفی سے مولانا مفتی ظفیر صاحب سے کرتا اور ان سے خاص انس محسوس ہوتا۔

مفتی صاحب مجھے اپنی نگارشات اور ذوق تصنیف کے اعتبار سے ندوہ کے ذوق سے قریب تر نظر آتے تھے۔ البتہ جماعت اسلامی کے سلسلہ میں ان کی کتاب تنگ نظری کی آئینہ دار تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا مودودیؒ پر تنقید کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش میں جمعیۃ العلماء کو جس کا تعلق دیوبند سے تھا، تنقید کا نشانہ بنایا ہے جمعیۃ العلماء اور علماء دیوبند کو بھی اس کا جواب دینے اور مولانا مودودیؒ پر تنقید کرنے کا پورا حق تھا۔ ''السنّ بالسنِّ والجروح قصاص'' مولانا مودودیؒ پر علمی تنقید کی گنجائش ہے، لیکن مولانا مودودیؒ کو خادم دین کے بجائے ہادمِ دین سمجھنا اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کرنا جو قادیانیوں اور منکرین حدیث کے ساتھ کیا جاسکتا ہے بہت بڑی زیادتی ہے۔ قرآن میں حکم ہے ''وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى'' (المائدہ:۸) یعنی کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات کا مجرم نہ بنادے کہ تم انصاف نہ کرسکو۔ انصاف کرو کہ یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی کو یہ احساس تھا کہ یہ کام دوسروں کے کہنے پر اور غالبًا اپنے ذوق کے خلاف انھوں نے انجام دیا ہے۔ کاش کہ وہ کھل کر تحریری طور پر اس کا اظہار بھی کردیتے۔ کئی مثالیں ہیں کہ بعض شخصیتوں نے مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کے خلاف بہت جارحانہ اور نازیبا زبان استعمال کی اور بعد میں ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن وہ تحریری طور پر اس کا اعتراف نہ کرسکے یا اعتراف کرنے کا ان کو موقع نہ مل سکا۔ ایک مثال امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی ہے۔ جب ان کی کتاب مکاتیبِ گیلانی چھپ کر آئی تو انھوں نے راقم سطور کو پڑھنے کے لیے دیا ایک مہینہ یا

اس سے کچھ زیادہ عرصہ کے بعد جب دوبارہ پٹنہ میں ان سے ملاقات ہوئی تو کتاب کے بارے میں میری رائے انھوں نے جاننا چاہی۔ میں نے کہا کہ کتاب بہت قیمتی ہے اور اس کے حواشی بھی بہت قیمتی ہیں لیکن میں نے یہ بھی صفائی کے ساتھ کہا کہ مولانا مودودیؒ کے نام پر حاشیہ میں آپ نے جو گمراہ اور گمراہ کن کے الفاظ لکھیں ہیں وہ بہت زیادہ سخت ہیں اور حد سے متجاوز ہیں، راقم سطور کو اس بات کے اظہار میں خوشی محسوس ہوتی ہے اور اس سے مولانا منت اللہ رحمانی کی اعلیٰ ظرفی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ جواب دیا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں میری اب وہ رائے نہیں ہے جس کا اظہار میری تحریر میں ہوا ہے۔ مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت اور دوسرے کئی پلیٹ فارم پر ہمارا جماعت اسلامی کے لوگوں کا ساتھ ہوتا ہے، ہم لوگ بہت سے کاموں میں شریک اور معاون ہیں وہ نوٹ جو میرے قلم سے نکلا ہے بیس سال پہلے کا ہے، کتاب کی اشاعت اب عمل میں آئی ہے اور مجھے ان حواشی پر نظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا ہے اور اگر اب مجھے حواشی لکھنے کا موقع ملتا تو میں ہرگز یہ نہ لکھتا۔

یادش بخیر، مولانا منت اللہ رحمانی صاحب پر مقالات کے مجموعہ کی اشاعت کی جب نوبت آئی تو دہلی کے مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے راقم سطور سے مولانا رحمانی پر مقالہ لکھنے پر مکرّر روسہ کرّر اصرار کیا، بار بار کے اصرار کے بعد جب انھوں نے کہا کہ چاہے آپ مخالفت میں لکھیں لیکن مقالہ ضرور لکھیں اور وہ مقالہ ضرور شائع ہوگا، پھر میں نے وہ مقالہ ان کے اصرار سے لکھ بھی دیا اور اس میں مذکورہ واقعہ کا بھی میں نے تذکرہ کر دیا لیکن جب مقالات کا مجموعہ زیور طبع سے آراستہ ہوکر کتابی شکل میں شائع ہوا تو اس میں میرا مقالہ موجود نہیں تھا۔ میں نے جب شکایت کی تو مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے فرمایا کہ مقالات پر نظر ثانی مونگیر میں ہوئی تھی اور میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔

مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی ایک بڑے عالم دین اور بڑے مصنف

اور بہت خلیق انسان تھے، مزاج میں غیر معمولی توازن تھا۔ ان کے مضامین ماہنامہ برہان، ماہنامہ دارالعلوم اور الفرقان میں چھپتے تھے اور کبھی کبھی لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے یا مجھ سے مناسبت کی وجہ سے مجھے دکھاتے تھے، دارالعلوم کی مجموعی فضا تصنیف و تالیف کی فضا نہ تھی، مفتی ظفیر صاحب اپنے تصنیفی ذوق اور مزاج کے اعتدال کی وجہ سے ندوی عالم یا اس کے مماثل نظر آتے تھے، ان کا علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے گہرا تعلق تھا۔ مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاح العلوم مئو سے فراغت کے بعد کچھ دنوں ندوہ کے طالب رہ چکے تھے، جب ان کا تقرر دارالعلوم دیوبند میں ہوا تو کچھ دنوں کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے۔ مسجد کے صحن میں نماز کے بعد مفتی ظفیر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ مفتی صاحب نے اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ مولانا علی میاں نے مجھے یہاں آنے پر مبارک باد دی اور ساتھ ہی نصیحت بھی فرمائی کہ آپ ندوہ میں رہ چکے ہیں، ندوہ کا مزاج اعتدال پسند ہے اور دارالعلوم کے مزاج میں شدت ہے۔ آپ میں وہ شدت نہیں آنی چاہیے۔

مفتی ظفیر صاحب کی پہلی تصنیف اسلام کا نظام مساجد کا مسودہ مولانا علی میاں نے بالاستیعاب پڑھا، اصلاح کی اور جو نصیحت فرمائی وہ مفتی صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:

> ”کتاب ہر ایک کے لیے لکھی جاتی ہے، موافق بھی پڑھتے ہیں اور مخالف بھی، اس لیے لب و لہجہ ایسا ہونا چاہیے کہ بڑے سے بڑا مخالف کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد بغیر پڑھے رکھ نہ سکے، بلکہ وہ شوق سے پوری کتاب پڑھے گو کچھ باتیں اس کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اس وقت

ہوتا ہے جب کہ لب و لہجہ خوش گوار اور شیریں ہو طرز ادا
شگفتہ و دل پذیر ہو‘‘ (زندگی کا علمی سفر، ص ۶۵)

اسی وجہ سے مفتی صاحب ہمیشہ مولانا علی میاںؒ کو اپنا استاذ اور مربّی سمجھتے تھے گو کہ باضابطہ وہ ان کے شاگردہ نہ تھے۔

ندوۃ العلماء کے فضلاء نے سنجیدگی کے ساتھ اس قدر گراں مایہ تصنیفی کام اسلامی موضوعات پر انجام دیا ہے کہ اس کی مثال آسانی کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی۔ علم صرف اگر دماغ میں محفوظ ہو اور صفحہ قرطاس پر منتقل نہ ہو تو اس کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ اس مئے کی کیا قیمت جو رگِ تاک کی خلوت میں تو موجود ہو اور جام و مینا کی جلوت تک نہ پہونچ سکے۔ کامیاب تحریر کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ادب کے لباس حریر میں سامنے آئے ورنہ وہ تحریر قبول عام اور خلعت دوام حاصل نہ کرسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے علما کی کتابیں علم کے وزن اور معانی کے عمق کے باوجود زیادہ مقبول نہ ہوسکیں وہ طاق میں رکھی رہیں اور پھر طاق نسیاں کا گلدستہ بن گئیں کیوں کہ وہ ادب انشاء کی چاشنی سے محروم تھیں۔ یہ کمی مفتی ظفیر الدین صاحب کے یہاں نہیں ملتی۔

مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی جلیل القدر عالم دین اور عظیم مصنف تھے، اسلام کا نظام عصمت و عفت، اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام امن وامان اور امارت شریعہ دینی جدو جہد کا روشن باب اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند وغیرہ ان کی مشہور و معروف کتابیں ہیں جو سادہ اور سلیس اردو زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی کئی کتابوں کے انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کی عظیم و مشہور شخصیتوں کے ان کے نام خطوط کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ ساری کتابیں تاریخی آثار اور علمی یادگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خدا کرے ان کتابوں کی بار بار اشاعت کی نوبت آئے اور ان سے استفادہ کا سلسلہ تادیر باقی رہے۔ یہی ان کو سچی خراج عقیدت ہے۔ ●●●

اجمالی حالات

۱- نام: محمد ظفیر الدین

۲- والد کا نام: منشی شمس الدین صاحب مرحوم

۳- ولادت: ۷/ مارچ ۱۹۲۶ء، مطابق ۲۱/ شعبان ۱۳۴۴ھ

۴- ابتدائی تعلیم: مدرسہ محمودیہ راجپور، نیپال

۵- ثانوی تعلیم: مدرسہ وارث العلوم چھپرہ

۶- تکمیل: جامعہ مفتاح العلوم مئو، یوپی، ۱۹۴۳ء

۷- اساتذہ کرام: مولانا عبدالرحمٰنؒ، مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ وغیرہم

۸- تحریک آزادی ہند میں شرکت: ۱۹۴۲ء

۹- زوجہ محترمہ: جنیسہ بیگم (مرحومہ) بنت جناب محمد حسین مرحوم

۱۰- صاحب زادگان: مولانا احمد سجاد قاسمی، مولانا حماد قاسمی، ڈاکٹر ابوبکر عباد

صاحب زادیاں: حسنیٰ خاتون زوجہ جناب سعید احمد، ریحانہ خاتون زوجہ جناب محمود عالم، نسیمہ خاتون زوجہ مولانا محمد عابد حسین رحمانی

۱۱- تصانیف: تقریباً پچاس کتابیں

۱۲- پہلی تصنیف: اسلام کا نظام مساجد، طباعت اول ۱۹۵۰ء

۱۳- مضامین: تقریباً تین سو

۱۴- تدریس: جامعہ مفتاح العلوم مئو، معدن العلوم نگرام (لکھنؤ)، دارالعلوم معینیہ سانحہ، بیگوسرائے، مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات

۱۵- دارالعلوم دیوبند میں تقرری ۱۹۵۶ء

۱۶- بیعت: بدست مولانا حسین احمد مدنیؒ ۱۹۴۷ء، بدست مولانا قاری محمد طیبؒ ۱۹۵۷ء

۱۷- خلافت: از دست مولانا فضل اللہ جیلانیؒ ۱۹۷۵ء

۱۸- ممبر: مجلس شوریٰ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، بورڈ آف اسٹڈیز شعبہ سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۹- حج بیت اللہ: ۱۴۱۱ھ، مطابق ۱۹۹۱ء

۲۰- صدر اسلامی فقہ اکیڈمی: نئی دہلی ۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۱ء

۲۱- دارالعلوم دیوبند سے سبک دوشی: ۲۰۰۸ء

۲۲- وفات: ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء بروز جمعرات

۲۳- تدفین: یکم اپریل بروز جمعہ، احاطہ مدرسہ شمس العلوم، پورہ نوڈیہا، ضلع دربھنگہ

●●●

میرے ابوجان

ڈاکٹر ابوبکر عباد☆

ذہن میں ابوجان کی پہلی صورت تب کی محفوظ ہے، جب ان کی داڑھی کے آٹھ دس بالوں میں سفیدی اتر چکی تھی۔ دیوبند سے آئے ہوئے شاید انھیں دو تین دن ہوئے تھے۔ وہ بالکل اجلے کرتے پاجامے اور ٹوپی میں ملبوس صحن میں رکھی چوکی پر تکیے کے سہارے نیم دراز تھے۔ پاس ہی امی جان بیٹھی انھیں ہاتھ کا پنکھا جھلتی اور مسکرا کر باتیں کرتی جاتی تھیں۔ ''کیا اتنی گرمی میں ٹوپی اوڑھے رکھنا ضروری ہے؟'' امی جان نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ یہ سن کر ابوجان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور انھوں نے ٹوپی اتار کر اپنے پہلو میں رکھ لی۔ میں آنگن میں کھڑا پائے (ستون) کی اوٹ سے جھانک کر امی اور ابوجان کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی دونوں میں سے کسی سے نظریں ملتیں، میں پھر سے پوری طرح پائے کے پیچھے چھپ جاتا۔ امی جان کا چہرہ ابوجان سے قریب ہوا اور انھوں نے ابوجان کے کان میں چپکے سے شاید میرے بے حد شرمیلے ہونے کی بات کہہ دی تھی۔ پہلے ابوجان کی ہنسی اور پھر ''اسے یہاں تو لاؤ'' کی آواز سنائی دی۔ جب امی جان کے کئی دفعہ بلانے کے باوجود میں ان کے سامنے نہ ہوا، تو امی جان میرا ہاتھ پکڑ کر ابوجان کے پاس لے گئیں اور دھیرے سے کہا ''ابوجان کو سلام کرو''۔ میں نے اپنے ننھے منے پاؤں کی انگلیوں پر نظریں جمائے ہوئے سلام کیا۔ ''اور زور سے''۔ امی نے

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

کہا۔تیسری بار میری آواز بمشکل سنی جانے والی جتنی بلند تھی۔ ''وعلیکم السلام، کیا نام ہے؟ اوپر دیکھو''۔ ابوجان نے پیار سے کہا۔ ''عباد''۔میری آواز اب بھی پہلی بار جیسی یا شاید اس سے بھی دھیمی تھی اور نظریں بدستور جھکی ہوئیں۔ ''دیوبند چلوگے؟'' ابوجان نے پوچھا۔میں نے خوش ہوکر اثبات میں جلدی جلدی گردن ہلانی شروع کردی تھی۔امی اور ابو جان کی ہنسی کی آواز ایک دوسرے میں مل کر ابھری اور فضاؤں میں رس گھولتی چلی گئی۔

بالکل یاد نہیں کہ ابو جان گھر پر کتنے دنوں تک ٹھہرے تھے اور میں ان کے سامنے کتنی بار گیا تھا، یا شاید ایک بار بھی نہیں۔ابوجان کو واپس لوٹے کافی دن ہوگئے تھے اور ان کی صورت ایک بار پھر بھول چکی تھی۔لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ جب منجھلے بھائی جان اور مولوی فضل احمد کے ساتھ مجھے دیوبند بھیجنے کی تیاریاں مکمل ہوچکیں تو میری چھوٹی بہن نسیمہ خوب روئی تھی ''بھائی کے ساتھ میں بھی دیوبند جاؤں گی، میں بھی پڑھوں گی'' اور دوڑتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی ''بھیا مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو''۔

تخیل اور منجھلے بھائی کے قصوں سے اخذ کی ہوئی باتوں کی مدد سے میرے معصوم دماغ میں دیوبند کا جو نقشہ بنا تھا، دیوبند اس سے ہزار گنا دلفریب اور خوابناک ثابت ہوا۔ بھاگتی دوڑتی بے شمار سائکلیں اور رکشے، بہت سی دکانیں، ان پر بکتی ڈھیر ساری چیزیں، صاف ستھرے لوگ اور پھر دارالعلوم کی سرخ اینٹوں سے بنی محل نما عظیم الشان عمارت۔ یاد آیا کہ امی جان نے نیکی کی ترغیب دیتے ہوئے جنت کی عمارت کا کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچا تھا۔تو کیا دارالعلوم واقعی جنت کا محل تھا، یا خوابوں کی جنت تھی، یا پھر حیرت زدہ کردینے والا سچ مچ کا جہانِ طلسم۔ جو بھی ہو مجھے تو یہاں ہر سو پھیلے سبزوں کے بیچ پھولوں کی کیاریاں، ان کے اوپر رنگ برنگی اڑتی تتلیاں، سفید کرتے پاجامے اور ٹوپیاں پہنے آتے جاتے لوگ، بلند و بالا گنبد،

آکاش کو چھوتے مسجدوں کے مینار، ہر گھنٹے بجنے والے پیتل کے بڑے سے گھنٹے کی گونج، اذان کی مترنم آوازیں، شام کے وقت رنگین پتنگوں سے بھرا آسمان اور برقی روشنی سے جگمگاتی راتوں نے یہ باور کرادیا تھا کہ جنت بھلا اس سے خوبصورت کیا ہوگی۔

کچھ عرصے کی مکمل آزادی کے بعد تھوڑا سا وقت میری پڑھائی کے لیے طے ہوا۔ یہ ذمہ داری منجھلے بھائی کے سپرد کی گئی۔ ہر روز سبق آنا کانی سے شروع ہوتا— ج، ز، س، ش، کے تلفظ پر تکرار ہوتی اور قبل از وقت اٹھا پٹخ پر ختم ہوجاتا۔ کبھی اُن کے چہرے پر میرے ناخنوں کی خراشیں ہوتیں، تو کبھی میرے گالوں پر اُن کی انگلیوں کے نشان۔لیکن ابو جان کی ڈانٹ ہمیشہ منجھلے بھائی جان کو ہی سننی پڑتی تھی۔

ابوجان کے پڑھانے کا انداز بالکل الگ تھا۔ وہ تلفظ درست کرنے کے لیے ضد نہیں کرتے تھے۔غلطیوں پر ڈانٹتے بھی نہیں تھے۔ وہ میری تعریفیں کرتے اور کہتے کہ 'تم بہت ذہین ہو اور خوب اچھا پڑھتے ہو'۔وہ منجھلے بھائی جان کی طرح جھڑکتے نہیں تھے کہ تمھیں ز، ش اور 'غ' نہیں کہنا آتا۔شاید یہی وجہ تھی کہ وہ پہلا یسرنا القران اور اردو کا قاعدہ تھا جنھیں میں نے صحیح حالت میں ختم کرنے کے بعد الماری میں حفاظت سے رکھا تھا، اور ان کی جگہ ابوجان نے اردو کی پہلی کتاب اور عم پارہ شروع کروادیا تھا۔ورنہ اس سے پہلے کے چھے سات مہینوں میں اول الذکر دونوں کتابوں کے نہ جانے کتنے نسخے استاد شاگرد کی جنگ میں شہید ہوچکے تھے جس کے گواہ ہم دونوں بھائیوں کے خراش زدہ چہرے، ہاتھوں پر بنے دانتوں کے نشان، دوات کی سیاہی سے داغدار ٹوپیاں، کرتوں کے ٹوٹے بٹن اور پھٹے ہوئے گریبان تھے۔

ابو جان بچوں سے اپنی محبت کا برہنہ اظہار بالکل نہ کرتے، ہمیشہ ان کی

محبت کا انعکاس ہزار پردوں میں ہوتا۔ بالعموم مزاج کی نرمی کی صورت، اور اکثر سلوک کے حسن میں ڈھل کر۔ ان کی محبت کبھی ہم لوگوں کی خواہشوں کی تکمیل بن کر ظاہر ہوتی اور بیشتر بے پناہ عنایتوں کی بارش کے طور پر۔ کبھی ہم لوگوں کی چھوٹی موٹی کامیابی سے ان کے چہرے پر پھولنے والی شفق میں ان کی محبت کا رنگ جھلکتا تو کبھی ہماری پریشانیوں سے ان کے ماتھے پر ابھر آنے والی لکیریں ان کی پوشیدہ محبت کا اقرار کرتیں۔ لیکن تب مجھے محبت کے اتنے سارے رنگوں کو سمجھنے کا شعور کہاں تھا۔ مجھے تو ابو جان کے مقابلے اپنے دوستوں کے وہ باپ اچھے لگتے تھے جو سب کے سامنے اپنے بچوں کو سینے سے لگاتے، اپنی بانہوں میں لے کر انھیں پیار کرتے، ان کی ذہانت کے قصے سناتے اور انھیں شوخی پر آمادہ کرتے تھے۔ گو کہ بڑے بھائی جان کا میرے ساتھ یہی رویہ تھا لیکن جی چاہتا کاش ابو جان بھی ایسے ہی ہوتے۔ مگر ابو جان کی محبت کا معاملہ تو ان کے طالبعلموں، خاص شاگردوں اور ہم بھائیوں کے ساتھ ایک جیسا ہی تھا، انصاف کی دیوی کے ہاتھوں میں ٹنگی ترازو کے دونوں پلڑوں کی طرح بالکل برابر۔ ہاں ان کے اساتذہ کے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں سے ان کی محبت ان کے اساتذہ کی تکریم کی مانند نمایاں تھی۔ ابو جان کی تمام خوبیوں کے باوجود ان کے برملا جذباتی اظہار کی کمی پر اکثر میرا دل کڑھتا اور کبھی کبھی خود پر ترس اور اُن پر غصہ بھی آتا تھا۔

یوں تو ابو جان آزاد طبیعت کے حامل تھے لیکن بعض معمولات پر پابندی سے عمل کرتے تھے۔ اُن کی رات فجر کی اذان سے دو گھنٹے پہلے ختم ہو جاتی تھی۔ بستر سے اتر کر نیچے اپنے ڈیسک پر بیٹھتے اور سفید رولدار کاغذ پر لکھتے رہتے۔ مسجد جانے سے پہلے ہم دونوں بھائیوں کو جگا جاتے — بہت ہی پیار سے، جیسے امی جان جگاتی تھیں۔ ابو کے کمرے سے نکلنے کے بعد جیسے ہی میں بستر پر دوبارہ لیٹنے کی کوشش کرتا، منجھلے بھائی چیختے، ''خبردار جو سونے کی کوشش کی، ابو جان ناراض ہوں گے۔''

میں ماندی آنکھوں کے ساتھ دروازے کی سیڑھیوں پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتا۔ اور پھر وہی مانوس تحکمانہ آواز کانوں سے ٹکراتی ''میں ذرا سو رہا ہوں، ابو جیسے ہی مسجد سے آتے دکھائی دیں مجھے جگا دینا، ورنہ...''۔ منجھلے بھائی کا یہ وہ حکم تھا جس کی تکمیل مجھے مجبوراً کرنی پڑتی تھی۔ اور جب کبھی کوتاہی یا نافرمانی کرتا تو پہلے منجھلے بھائی کو دیر تک سونے کے لیے ابو جان سے سخت ڈانٹ سننی پڑتی تھی اور بعد میں اپنی ڈیوٹی نہ بجا لانے پر منجھلے بھائی کی ڈانٹ میرا مقدر بنتی۔ فجر کی نماز کے بعد کمرے کے بغل والی کھلی جگہ میں ابو جان تیز تیز قدموں سے چلتے اور بلند آواز سے سورۂ مزمل پڑھتے جاتے۔ ناشتہ ہم لوگ ساتھ کرتے تھے۔ وہی باسی روٹی کا گھی میں تلا ہوا ملیدہ، یا پھر سوجی کے تازہ حلوے کے ساتھ گرم کی ہوئی باسی روٹی۔ صبح کی چائے سب کے لیے دو دو کپ ہوتی تھی۔

یاد نہیں پڑتا کہ ابو جان نے دفتر کا کبھی ناغہ کیا ہو۔ پہلے ہم دونوں بھائیوں کو مدرسے بھیجتے پھر خود جاتے۔ پڑھائی کے دونوں اوقات کمرے کی چابی ابو جان کے پاس ہوتی۔ بقیہ وقت کمرے پر ہم لوگوں کا، یا کہیے کہ منجھلے بھائی کے دوستوں کا قبضہ ہوتا، اور یوں نسیم اختر شاہ قیصر، احمد خضر شاہ مسعودی، عدنان، وہاج الدین منی پوری، احمد حسن، نجم الحسن اور نسیم الدین ہزاری باغوی ہمارے فیملی ممبر کی حیثیت رکھنے لگے تھے۔

گرمیوں کی دوپہر میں ابو جان پابندی سے سوتے، سونے سے پہلے کسی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی ضرور کرتے تھے۔ اس وقت کمرے سے باہر نکلنے کی ہمیں سخت ممانعت تھی۔ پتنگیں اڑانے، چمیلی کی کلیاں جمع کرنے یا تتلیوں کے پیچھے بھاگنے، یا پھر تالاب سے مچھلیاں پکڑنے کی خواہش سے مجبور ہو کر ہم لوگ جب بھی اور جتنے بھی آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھولنے کی کوشش کرتے، ابو جان کی آنکھ کھل جاتی۔ منجھلے بھائی کا تو پکا خیال تھا کہ ابو جان سوتے نہیں بہانہ بنا کر

لیٹے رہتے ہیں، کہ جیسے ہی ہم لوگ کھیلنے کے لیے باہر نکلیں وہ ہمیں پکڑ لیں۔

ظہر بعد مسجد سے لوٹتے تو ساتھ میں رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر از ہر شاہ قیصر، طبیہ کالج کے استاذ حکیم عزیز الرحمان، مولانا بہاری صاحب اور کبھی کبھی 'تاریخِ دیوبند' کے مصنف سید محبوب رضوی اور شعبۂ نشر واشاعت کے ناظم مولانا گل صاحب بھی ہوتے تھے۔ میرا کام ہوٹل سے دودھ لانا اور منجھلے بھائی کا کام چائے بنانا مقرر تھا۔ برسات کے موسم میں دوپہر کو ابوجان ہمیشہ لیموں والی چائے پیتے، کہتے لیموں آدھا ڈاکٹر ہوتا ہے۔ یہ کئی بیماریوں سے بچاتا اور متعدد امراض کا علاج کرتا ہے۔ کلاس شروع ہونے تک کا یہ وقت اخبار کی خبروں پر تبصرے اور سیاسی گفتگو کے لیے مخصوص تھا۔ ابوجان کی گفتگو ہمیشہ حاوی اور حتمی ہوتی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے اچھا لگتا اور ایک طرح کے فخر کا احساس ہوتا کہ ابوجان کے تمام دوست ان کی وسیع معلومات اور سیاسی بصیرت کے قائل ہیں اور ان سے بے حد محبت رکھتے ہیں۔

عصر بعد کوئی موسمی پھل یا پھر گھی لگے نان پر نمک اور سیاہ مرچ کا سفوف چھڑک کر ہم لوگوں کے ساتھ شیئر کرتے۔ ضرورت کے مطابق ہم لوگوں کو جیب خرچ بھی اسی وقت ملتا تھا۔ یہ وقت دیوبند بلکہ پورے ہندوستان کے مدارس میں رہنے والوں کے لیے سیر وتفریح کا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ریلوے اسٹیشن، بازار، کھیل کے میدان اور زیادہ تر باغوں اور کھلے سبزہ زاروں کا رخ کرتے ہیں۔ ٹوپیاں سروں سے اتر کر ہاتھوں میں آجاتی ہیں اور چہرے کی متانت اور تھکن شوخی اور تروتازگی سے بدل جاتی ہیں۔ ابوجان بھی پابندی سے سیر کو جاتے۔ ساتھ میں مولانا معراج صاحب، مولانا بہاری صاحب اور مولانا قمرالدین صاحب ہوتے تھے۔ طویل عرصے سے ایک ساتھ سیر کرنے والے ان تمام لوگوں میں ایک دلچسپ قدر مشترک یہ تھی کہ کسی کا مزاج کسی سے نہ ملتا تھا۔ کچھ عرصے بعد مشائین کی اس جماعت میں فضلو بھائی اور مولانا بدرالحسن قاسمی بھی شامل ہوگئے تھے۔

مغرب سے عشاء تک ہم لوگوں کے پڑھنے کا وقت ہوتا تھا اور کمرے میں حاضری کا بھی۔ کبھی کبھی یہ یقین کر لینے کے بعد کہ ہم لوگ سچ مچ سنجیدگی سے پڑھ رہے ہیں اور ان کے جانے کے بعد کھیل میں نہ لگ جائیں گے، ابوجان پڑوس کے کمروں میں جا بیٹھتے۔ تب دارالعلوم میں استاذ اور شاگرد کے درمیان حائل عقیدت اور نیازمندی کی گہری خلیجوں کو بے تکلفی کے رشتے سے پاٹنے والے ابوجان اکیلے شخص تھے، وہ طالبعلموں کو برابری کی سطح کا احساس دلاتے اور ان سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ ملاقاتی بھی اسی وقت آتے تھے جن میں شناسا طالبعلم، دارالعلوم اور دوسرے مدارس کے اساتذہ، باہر سے آنے والے مہمان، نئے طلبہ اور نیازمند ہوتے جن کی نیازمندی کو بے تکلفی سے بدلنے کی ابوجان نے جیسے قسم کھا رکھی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ مہینوں تک یہ وقت ابوجان کے دوست، بہی خواہ اور دفترِ اہتمام کے پیشکار مولوی عبدالحق صاحب کے صاحبزادے عبداللہ جاوید کے حصے میں آگیا۔

عشاء کی اذان سے نماز تک کا وقفہ رات کے کھانے کے لیے مخصوص تھا۔ عشاء بعد عبدالحق صاحب کے ساتھ مل کر ابوجان اپنی کتابوں کے پروف دیکھتے۔ بالعموم وہ بلند آواز سے پڑھتے اور عبدالحق صاحب کتابت شدہ مسودے سے ملاتے۔ کبھی اس کے برعکس ہوتا۔ عبدالحق صاحب کی غیر موجودگی میں یہ کام مجھ سے لیا جاتا۔ اس کام کے لیے ایک سے ڈیڑھ گھنٹے تک کا وقت مقرر تھا۔ ظاہر ہے اس کام کو ابوجان کے معمولات میں مستقل حیثیت حاصل نہ تھی، تاہم یہ عمل اتنا غیر مستقل بھی نہ تھا، کہ ان دنوں ابوجان کی مرتب کردہ کتاب ''فتاویٰ دارالعلوم'' کی جلدیں شائع ہورہی تھیں۔ یہ تو یاد نہیں کہ 'فتاویٰ دارالعلوم' کی وہ کون سی جلد تھی، لیکن تازہ چھپی ہوئی کتاب کی مہک، اس کے لمس کا عجیب سا احساس، سفید کاغذ پر کالے خوشنما حروف اور ہلکے گرین کلر کے ٹائٹل پیج پر لکھا ہوا ابوجان کا نام 'مفتی محمد

ظفیر الدین مفتاحی' بے شمار یادوں کے دفینے میں اب بھی جگمگا رہے ہیں۔

جمعے کی نماز پڑھنے وہ ہمیشہ شہر کی جامع مسجد جایا کرتے تھے جس کے ایک کمرے میں شعبۂ خوش خطی کے استاذ فضلو بھائی (مولانا فضل الرحمان قاسمی) کرایے پر رہتے تھے۔ ابو جان کا قیام وہاں مغرب تک ہوتا تھا جس کی وجہ سے گرمی کے دنوں میں ہم لوگوں کو میٹنی شو دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نامبارک کام کے لیے کبھی اپنے دوستوں کے ہمراہ ڈرا سہما چھپتا چھپاتا موہن ٹاکیز جاتا اور کبھی منجھلے بھائی کو رشوت دے کر ان کے ساتھ بے خوف اکڑتا ہوا۔ ابو جان اور بڑے بھائی جان سے پوشیدہ ہم دونوں بھائیوں کا یہ ایسا معاملہ تھا جس کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے کے رازدار بن گئے تھے، اس راز کے کھلنے کے ڈر سے ایک دوسرے سے خائف رہتے اور اس راز کو کھولنے کی دھمکی دے کر ایک دوسرے پر حاوی ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے۔

()

نہ جانے کتنے موسم بیت چکے تھے۔ دیوبند کے روایتی کرتے پاجاموں کی تراش خراش اور ٹوپیوں کی وضع بدلنے لگی تھی۔ منجھلے بھائی اور بڑے بھائی جان دور شہروں میں نوکریاں کرنے لگے تھے۔ احمد حسن سرکاری ملازم ہوگئے تھے۔ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور مزے مزے کی باتیں کرنے والوں کے مضبوط جذباتی رشتے سنجیدہ مراسلوں، نیک خواہشات کے اظہار، کامیابی کی دعاؤں اور جدائی کا کرب بیان کرنے والے خطوط کی صورت باقی رہ گئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایشیا کی سب سے بڑی دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند پر اسعد مدنی صاحب کا جبری قبضہ ہوچکا تھا اور مہتمم قاری محمد طیب صاحب کو غیر منصفانہ طریقے سے برطرف کرنے کے بعد بڑی تعداد میں وہاں کے اساتذہ اور دوسرے شعبوں کے کارکنان نکال دیے گئے تھے۔ ستم یہ کہ اس دردناک حادثے یا قبضے کو ''انقلاب'' کا نام دیا

گیا تھا۔ جیت کے ایوارڈ کے طور پر طلبہ کے لیڈر حافظ محمد عثمان کے ہاتھوں میں دارالعلوم کی چابیاں سونپتے ہوئے بعض برگزیدہ اساتذہ نے انھیں ''فاتحِ مکہ'' کہہ کر مخاطب کیا تھا اور مولانا وحیدالزماں صاحب کیرانوی کو اس انقلاب کے ہیرو اور کمانڈر کے خطابوں سے نوازا گیا تھا۔ غالباً مذہبی تاریخ میں کسی مدرسے پر اس طرح قبضہ کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ بعد میں اس نوع کے ناخوشگوار واقعے دوسرے کئی بڑے مدارس میں بھی دہرائے گئے۔ شاید یہ وہ مرکزی نقطہ تھا جہاں سے از ہر ہند دارالعلوم میں اصحابِ صُفّہ کا روایتی نظام تعلیم اپنی انتہا پر پہنچنے کے بعد سیاست سے آلودہ ہو چکا تھا اور ترقیِ معکوس کی طرف گامزن بھی۔

تب دینی اقلیم میں بدظنی، بدگمانی اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی، علم پر امارت غالب آگئی تھی، روحانیت کو سیاست نے مغلوب کرلیا تھا، تصنع پسند نے تصوف کا خرقہ زیبِ تن کر رکھا تھا اور صوفی ایک بار پھر مصلوب ہوا تھا۔ محسوس کرنے والے وثوق سے کہتے تھے کہ علمی حلقوں میں جبس کا زبردست عالم ہے۔ جانب داری ضرورت بن گئی ہے اور غیر جانب داروں کا دم گھٹتا ہے۔ لیکن ابو جان کے اعصاب کمزور نہ تھے۔ جنگِ آزادی میں شرکت سے انھیں تجربات اور حوصلے کی دولت ملی تھی اور تاریخِ عالم کے مطالعے نے انھیں مستقبل کی بصیرت دی تھی۔ صاحبِ اقتدار کے حربے، بالادستی قائم رکھنے کی کشمکش اور خاندانی اور گروہی اختلافات کے وہ اتنے انجام دیکھ چکے تھے کہ لوگوں کے مزاج سمجھنے اور وقت کی نبض پہچاننے میں انھیں دیر نہ لگتی تھی۔ وہ جتنی زیادہ منافقت سے نفرت کرتے تھے اتنی ہی زیادہ بزدلی سے۔ صاحبِ رعونت کو ناپسند کرتے تھے، محدود فکر کے لوگوں سے انھیں چڑھ تھی اور خوشامد پسندوں کو سماج کا ناسور کہتے تھے۔ لالچ اور مرعوبیت سے عدم واقفیت نے انھیں نڈر اور بے باک بنا دیا تھا، اور بے ریائی اور رائے کی پختگی ان کے عزم وحوصلے کا طلسم تھے۔ دارالعلوم پر اقتدار کے قضیے کے معاملے

میں ان کا ذہن صاف اور رائے مستحکم تھی۔ انھوں نے نہ تو دارالعلوم سے الگ ہونے والوں کے دباؤ میں نوکری چھوڑی اور نہ قابضوں کے چاہنے پر استعفیٰ دیا۔ اس دوران متعدد اہم اداروں سے پیش کیے گئے عہدوں کو بھی وہ قبول کرنے سے انکار کرتے رہے۔ علی الاعلان کہتے کہ میں نے دارالعلوم کی ملازمت درخواست دے کر حاصل نہیں کی، دفتر اہتمام کی جانب سے بلاکر لایا گیا تھا۔ موجودہ مہتمم چاہیں تو اسی صورت مجھے جانے کے لیے لکھ سکتے ہیں۔ میں ادارے کی ملازمت کرتا ہوں کسی فرد یا جماعت کی نوکری نہیں۔

جانے سلسلۂ روز وشب کا یہ کون سا عرصہ تھا جس میں بیشتر علماء کسی نہ کسی انتہا پر تھے۔ معتدل مزاجی معدوم ہوگئی تھی اور ایک دوسرے کی تذلیل معیوب نہ سمجھی جاتی تھی۔ شکست وفتح کے احساس سے جنم لینے والی مایوسی اور انا نے لوگوں کے اندر جورِدِعمل کی نفسیات پیدا کی تھی اس کا اظہار تضحیک وتحقیر کی صورت عام تھا۔ لیکن کیا مجال جو ابوجان نے اپنی زبان یا قلم سے کسی کی، یا کسی نے ابوجان کی شان میں کوئی نازیبا لفظ استعمال کیا ہو۔ اس عرصے میں صاحب علم وفن کے آپسی رشتے تیزی سے بگڑ رہے تھے، تعلقات ختم ہورہے تھے اور رواداری زوال پذیر تھی۔ لیکن ابوجان نے نظریاتی اختلافات کے باوجود رشتوں کی حرمت کو قائم رکھا، اپنی رواداری پر ذرا بھی آنچ نہ آنے دی اور سابقہ تعلقات کو اس طور نبھایا کہ حالات معتدل ہونے کے بعد شناساؤں سے صاحب سلامت یا ملاقات میں شرمندگی کبھی دامن گیر نہ ہوئی۔

ابوجان سچی اور صحیح بات کہنے میں بے باک ہی نہیں، کافی حد تک بے احتیاط بھی تھے۔ ممکن ہے یہ سادگی، صاف گوئی اور بے خوفی کی زائیدہ ہو جو ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھے۔ مارچ 1982 میں رونما ہونے والے دارالعلوم کے اس سانحے کے بعد جب بہتوں نے اپنی بیعتوں میں تبدیلی اور اپنے نظریات سے

روگردانی کو مباح قرار دے لیا تھا اور کئیوں نے خاموشی اور مصلحت پسندی کو اپنا شعار بنا لیا تھا، ابوجان تب بھی اپنی رائے اور مطالعے اور مشاہدے کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ان کے سامنے جب بھی نام نہاد انقلابیوں کو نوازے جانے اور غاصبوں کے دبدبے اور تدبر کا گن گان کیا جاتا، ابوجان نہایت نرمی اور اعتماد کے ساتھ کہتے: ''مولانا! دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ انقلاب کے بعد کی حکومت نے اپنا پہلا نشانہ انقلاب لانے والے لیڈروں کو ہی بنایا ہے، اور غاصبوں کی حکومت زیادہ دنوں تک نہیں رہتی۔''

تب ابوجان کی باتوں پر نہ تو یقین آتا تھا اور نہ دور تک اس کے آثار نظر آتے تھے۔ لیکن وقت کا نہ دکھائی دینے والا سست رفتار پہیا اپنی یکساں رفتار سے گھوم رہا تھا اور تاریخ کا اٹل اصول ایک بار پھر سچ ثابت ہونے والا تھا۔ سال بھر بعد ہی حافظ محمد عثمان اور دارالعلوم کو 'فتح' کرنے والے نمایاں طالبعلموں نے اس شک کا اظہار کرنا شروع کیا کہ نئی انتظامیہ دارالعلوم کے فنڈ، اس کی املاک کے تحفظ اور ملازمین کی بحالی میں ایمانداری نہیں برت رہی ہے۔ چنانچہ اہل اقتدار پر دباؤ ڈالنے کے لیے انھوں نے انتظامیہ کو طلبہ کی یونین بنانے پر مجبور کیا۔ یوں دارالعلوم کی تاریخ میں پہلی بار جمعیۃ الطلبا (Students' Union) کا باقاعدہ الیکشن بیلٹ پیپر پر مہر کا ٹھپہ لگا کر ہوا— ایک صدر، ایک جنرل سکریٹری اور گیارہ ممبران کے لیے۔ الیکشن میں صرف دو جماعتیں تھیں۔ ایک کا انتخابی نشان 'الف' تھا جس کی طرف سے صدارت کے امیدوار حافظ محمد عثمان تھے اور سکریٹری اور ممبران کے امیدوار ان کے وہ رفقاء جن کی وجہ سے دارالعلوم کا 'انقلاب' آیا تھا اور اب انتظامیہ ان لوگوں سے خوش نہ تھی کہ یہ لوگ معاملات میں شفافیت کا مطالبہ اور انتظامیہ پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ دوسری جماعت کا چناؤ نشان ''ب'' تھا۔ اس کی طرف سے صدارت کے امیدوار افضل افریقی تھے اور بقیہ عہدوں کے لیے ان کے رفقاء۔

اس جماعت کو در پردہ انتظامیہ کی حمایت حاصل تھی۔ دارالعلوم میں اور آس پاس امیدواروں کے نام کے بڑے بڑے بینر لگائے گئے تھے اور بعض جگہوں پر ووٹروں کو راغب کرنے کے لیے وال پینٹنگ بھی کی گئی تھی۔ ایک سے زیادہ پولنگ اسٹیشن پر ووٹ ڈالے گئے۔ اور جب دوسرے دن الیکشن کا نتیجہ آیا تو حافظ محمد عثمان اور ان کے تمام رفقاء زبردست اکثریت سے کامیاب ہوگئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یونین نے طلباء کی خودداری، خوداعتمادی اور وقار میں اضافہ کیا، ہاسٹل اور ڈائننگ ہال کے انتظام کو بہتر بنایا، اخبارات کے ذریعے باہر کی دنیا سے طالبعلموں کو واقف کرانے کی کوشش کی اور انتظامیہ پر کافی حد تک نگرانی رکھی۔

اس دوران کئی طویل نامعلوم پوسٹر آئے جن میں اہلِ اقتدار کے بڑھتے سرمائے اور املاک، ان کی ایمانداری اور دارالعلوم چلانے کے طریقۂ کار سے متعلق سوالات پوچھے گئے تھے۔ ظاہر ہے اس جرأتِ رندانہ کے لیے انتظامیہ کی نظروں میں یونین مشکوک ٹھہری اور پھر حافظ محمد عثمان کے خلاف ایسا چکر وِیوہ تیار کیا جس سے نکلنا ان کے لیے ممکن نہ ہوسکا۔ 'انقلاب' کے اہم ستونوں پر مبنی اور حافظ عثمان کو 'فاتح مکہ' کہہ کر خوش کرنے والی اساتذہ کی مختصر سی جماعت نے انھیں صرف بزرگوں اور اساتذہ کی شان میں گستاخی کا مجرم ہی قرار نہیں دیا بلکہ ان کے دین اور ایمان پر بھی شبہے کا اظہار کیا۔ اور ایک دن جب یونین کے تمام ارکان دارالعلوم سے باہر شہر کی عیدگاہ میں میٹنگ کر رہے تھے، ٹھیک اسی وقت دارالعلوم کے چاروں گیٹ بند کر کے طلبہ کو جمع کیا گیا اور ان کے سامنے ایک دو مختصر سی جذباتی تقریروں کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ دارالعلوم کے مفاد میں یونین کے تمام ارکان کا مدرسے سے اخراج (rustication) کر دیا گیا ہے، ان کے مدرسے میں داخل ہونے پر پابندی عائد ہے۔ ان لوگوں سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھنے یا ان سے ملنے والے طالبعلم بھی اخراج کے مجاز ہوں گے۔

حافظ محمد عثمان اپنے دوستوں کے ساتھ شہر کے ایک محلے (غالباً ابوالمعالی) میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ انتظامیہ کی طرف سے سخت تنبیہہ اور دھمکی بھرے اعلانات جاری ہونے کے باوجود طلبہ کثیر تعداد میں یونین کے ارکان سے ملتے رہے جس کی وجہ سے وہاں چار پانچ دنوں تک میلے کا سا سماں رہا۔ غالباً چوتھے یا پانچویں دن پلان کے مطابق دو بند کاروں میں بھر کر یونین کے ارکان دارالعلوم کے جنوبی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ ان کے داخل ہوتے ہی پٹاخہ چھوڑا گیا جس کی آواز سنتے ہی چاروں گیٹوں کے آس پاس پہلے سے موجود طالبعلموں نے دربانوں کو قابو میں کر کے کمروں میں بند کر دیا اور چاروں گیٹوں پر اپنے تالے ڈال دیے۔ ہر طرف جمعیۃ الطلباء زندہ باد، حافظ عثمان زندہ باد کے نعرے سنائی دینے لگے۔ مسجد کے مائک سے اعلان کیا گیا: ''قوم کی امانت دارالعلوم کو غاصبوں سے آزاد کرالیا گیا ہے، تمام اساتذہ اور طلبہ اپنے کمروں میں رہیں، کسی طرح کی کوئی مزاحمت نہ کریں۔ ہم لوگوں کا مقصد لڑائی جھگڑا یا خلفشار پیدا کرنا نہیں ہے۔ بقیہ سارے معاملات مجلس شوریٰ کی ہنگامی میٹنگ میں طے ہوں گے۔''

اس میں شبہ نہیں کہ 1983 کے دسمبر کی یہ دوپہر ایک تاریخی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ ہم لوگ باہر بیٹھے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہنگامے کی آواز سن کر ابوجان بھی کمرے سے نکل آئے، جب انھیں صورتِ حال بتائی گئی تو انھوں نے کہا، ''یہ کمبخت خودکشی کرنے کیوں آئے ہیں۔'' ایک طالبِ علم نے کہا، ''حضرت خودکشی نہیں، دارالعلوم پر دوبارہ قبضہ ہوگیا۔'' ''ارے قبضہ ایسے نہیں ہوتا۔ جس کے ساتھ حکومت اور پولس ہو قبضہ اسی کا رہتا ہے۔'' طالبعلموں نے کہا، ''لیکن حضرت اب تو قبضہ ہوگیا۔'' ''قبضہ وبضہ کچھ نہیں، سب مارے جائیں گے۔ لگتا ہے سب کی عقلیں گھاس چرنے گئی ہیں۔'' ابوجان نے قدرے ناگواری اور فکرمندی سے کہا، ''اور تنبیہہ کی خبردار! تم لوگ ادھر بالکل مت جانا۔'' پھر بے حد پریشانی کے عالم میں

مجھے حکم دیا ''رضوان اور آفاق کو لے کر فوراً میرے کمرے میں آجاؤ۔'' (یہ دونوں علی الترتیب میرے بھتیجے اور بھانجے ہیں۔ اس وقت پہلے کی عمر غالباً سات اور دوسرے کی نو برس رہی ہوگی)۔

کوئی گھنٹے بھر بعد ایک بزرگ آتشیں اسلحہ لیے ہوئے اپنے مکان اور دارالعلوم کے شمالی دروازے کے درمیان بیس پچیس طالبعلموں کے ساتھ کھڑے غالباً اندر داخل ہونے کی ترکیب سوچ رہے تھے۔ اور چند منٹوں بعد جہاں ابھی مسجد رشید ہے، اس سے ملے ہوئے دارِجدید کے بیت الخلاء کے پاس بنی گارے مٹی کی عارضی دیوار کو توڑ کر سب اندر داخل ہوگئے۔ اب صورتِ حال یکسر بدل چکی تھی۔ گولیوں کی آوازیں، ارشد مدنی زندہ باد، اسعد مدنی زندہ باد کے بلند ہوتے نعرے، مارو پیٹو کا شور اور بھاگ دوڑ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ہاتھوں میں اینٹ پتھر، لاٹھیاں اور سلاخیں لیے ہر طرف بھاگتے لوگ۔ باب الظاہر اور دارالحدیث کے درمیانی حصے میں خون سے لت پت کم از کم دو طالبعلموں کے تڑپتے جسم، نرغوں میں لے کر کل کے ہیرو اور آج کے باغیوں کو سفاکی سے زدوکوب کرنے کے دلدوز مناظر۔ اف ....کیا استاد اور کیا شاگرد۔ ایسا لگا جیسے تھوڑی دیر کے لیے ان سب کے اندر کا عالمِ تو کیا، انسان بھی سو گیا ہو۔ اور ان کے اندر جو جاگ اٹھا تھا یقیناً انسانیت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے دن خبر آئی کہ حافظ محمد عثمان اور ان کے ساتھیوں کی حالت انتہائی نازک ہے اور سب زخمی حالت میں سہارنپور اور دہلی کے اسپتالوں میں بھرتی ہیں۔

یوں تو کچھ دنوں پہلے سے ہی دارالعلوم کے مقبول اور ہردلعزیز استاد اور 'انقلابِ دارالعلوم' کے ہیرو اور کمانڈر مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے ساتھ بدسلوکیاں اور ان کے خلاف سازشیں تیز ہوچکی تھیں لیکن اِن دنوں انھیں بدنام اور پریشان کرنے کے لیے لایعنی باتیں کچھ زیادہ ہی مشتہر کی جارہی تھیں اور ان کی

تحقیر و تذلیل کے عجیب وغریب طریقے وضع کیے جارہے تھے۔ بالآخر تنگ آکر انھوں نے دارالعلوم سے کنارہ کشی کرلی اور گوشہ نشین ہوگئے۔

ایک دن عشاء کی نماز کے بعد ابوجان کمرے پر آئے تو بے حد افسردہ تھے۔ بستر پر دراز ہوگئے اور کسی سے کوئی بات نہ کی۔ رات کا کھانا بھی برائے نام کھایا۔ بظاہر اس قدر غمزدہ کرنے والی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ دوسرے دن پوچھنے پر بتایا کہ کل مسجدِ قاضی سے مغرب کی نماز پڑھ کر باہر نکل رہا تھا تو مولانا وحیدالزماں صاحب ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے کہ آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ چائے کے دوران انھوں نے کہا، 'مفتی صاحب! مجھے پورا یقین ہے کہ قاری طیب صاحب کے صبر اور خاموشی کا مجھ پر عذاب پڑ رہا ہے۔' اور پھر اپنے ساتھ کی گئی اپنے لوگوں (نئی انتظامیہ/اہل اقتدار) کی زیادتیوں اور بدسلوکیوں کا ذکر کرتے رہے۔ اس تمام عرصے میں ان کی آنکھوں سے بارہا آنسو چھلکے۔ وہ حد سے زیادہ پشیمان اور افسردہ ہیں، بیچارے تنہائی کی اذیت جھیل رہے ہیں۔ ان کی حالت سے مجھے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ خدا انھیں صبر دے۔'' میں نے کہا کہ تب انھیں خیال نہ آیا کہ وہ کن لوگوں کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ ابوجان کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا، '' اپنے سے بڑوں کے بارے میں اس طرح کے الفاظ اور لہجے سے پرہیز کرنا چاہیے، بات کہنے کے اور بھی طریقے ہیں۔''

غالباً 2006 کے پہلے مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ ابوجان اسلامک فقہ اکیڈمی کے صدر کی حیثیت سے کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول میں انھیں گھر لانے کے لیے اکیڈمی کے دفتر گیا ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ابوجان نے کہا، ''تمھارے یہاں جانے سے پہلے مولانا اسعد مدنی کو دیکھ آتا ہوں، کافی دنوں سے بیمار ہیں۔ نہ لوگوں کو پہچانتے ہیں اور نہ بات چیت ہی کرسکتے ہیں۔ یہیں اپولو اسپتال میں بھرتی ہیں۔'' ابوجان پر حد سے زیادہ

حیرت مجھے اس لیے ہوئی کہ وہ اس زمانے میں بھی اسعد مدنی صاحب سے کبھی نہ ملے تھے جب دارالعلوم کے اساتذہ کے لیے کسی نہ کسی بہانے ان سے ملاقات تقریباً لازمی سمجھی جاتی تھی اور ان کی خوشنودی کا حصول ترقی اور استقلال کی ضمانت ۔''میرے ساتھ امتیاز جا رہے ہیں۔ چاہو تو تم بھی چلے چلو۔'' میں نے ابوجان سے معذرت کر لی تھی۔ واپس آ کر بتانے لگے کہ وہاں بے چارے محمود مدنی ان کی دیکھ بھال کے لیے بالکل اکیلے رہتے ہیں۔ وہی ساری خدمت کرتے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ کبھی کبھار ہی کوئی ملنے آتا ہے۔ ارشد مدنی صاحب بھی نہیں آتے:

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز ، نہ جوش و خروش ہے

اس میں شبہ نہیں کہ ابوجان رجائیت پسند تھے اور مایوسی کو کفر جانتے تھے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ دارالعلوم کے ان دونوں سانحوں کے بعد ان کی طبیعت ذرا بجھ سی گئی تھی جس میں انھوں نے علم، اصول اور اخلاق کی پامالی دیکھی اور عظیم روایات ، صدیوں کی وراثت اور اسلاف کی بے توقیری محسوس کی تھی— اور کسی حساس آدمی کے لیے یہ ممکن بھی تو نہ تھا کہ اتنا سب کچھ دیکھنے اور محسوس کرنے کے بعد بھی وہ تبدیلی کے عمل سے دوچار نہ ہو۔ اب ابوجان کے معمولات پہلے جیسے نہ تھے۔ نہ صبح کی چہل قدمی کرتے ، نہ شام کی سیر کو جاتے۔ علی الصبح لکھنے کا معمول ترک کر چکے تھے۔ دوستوں کی محفلیں جمے عرصہ بیت چکا تھا۔ حکیم عزیز الرحمٰن صاحب دیو بند سے جا چکے تھے۔ ازہر شاہ صاحب کو دارالعلوم چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، پیشکار عبدالحق صاحب برطرف کر دیے گئے تھے، اور سید محبوب رضوی اور مولوی گل بکھراؤ اور انتشار کی یہ حالت دیکھنے کو زندہ نہ رہے تھے۔ بس مولانا بہاری صاحب ابو کے مونس اور فضلو بھائی غم خوار بچے تھے۔

ابوجان جب بھی دیو بند سے گاؤں پہنچتے ، پہلے مسجد میں رکتے ، نماز

پڑھتے ، لوگوں سے ملاقاتیں کرتے ، پھر گھر آتے۔ دوسرے دن عصر بعد قبرستان جا کر اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ اس عرصے میں فوت ہونے والوں کے لواحقین سے تعزیت اور بیماروں کی عیادت ضرور کرتے۔ ابوجان نے امیر غریب، عالم جاہل، مالک مزدور اور اپنے پرایوں میں کبھی کوئی تفریق نہ کی۔ گھر پر کوئی کام لگا ہوتا تو دسترخوان پر مزدوروں کو اپنے ساتھ ناشتہ کراتے ، ساتھ میں ہم بھائیوں کو بھی بٹھاتے۔ ان پڑھ لوگوں سے گھنٹوں باتیں کرتے ، غریبوں کو کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونے دیتے۔ نہ جانے کن کن تدبیروں سے ایسے بچوں کو بھی عالم بنا دیا جن کی پچھلی کئی نسلوں میں کبھی کوئی حرف شناس تک نہ تھا۔

امی جان کے انتقال کے بعد گھر کے تمام لوگوں نے ایک ساتھ محسوس کیا کہ ابوجان کافی کمزور اور مضمحل نظر آنے لگے ہیں۔ اب گھر آنا انھوں نے کافی کم کر دیا تھا، آتے تو کھوئے کھوئے سے رہتے ، جیسے ان کی نگاہیں کسی کو ڈھونڈ رہی ہوں، اندرونِ خانہ جانے سے گھبراتے۔ ہم لوگ کسی موقعے یا بہانے سے لے جاتے تو چہرے کی جلد پر کھنچاؤ آ جاتا اور ہونٹ بھنچنے لگتے۔ صاف پتا چلتا کہ وہ جذبات کو چھپانے اور آنکھوں کے گُہر کو آشکار ہونے سے بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ طے یہ کیا گیا کہ ابوجان کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے تاکہ امی کی جدائی کا تکلیف دہ احساس انھیں کم سے کم ہو۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ انھوں نے اپنے برسرِ روزگار بیٹوں اور گھر گرہستی والی بیٹیوں اور ان کے بچوں کا اس طرح خیال رکھنا شروع کر دیا تھا جیسے ہم سب ایک بار پھر کسی سہارے کے بغیر نہ رہ پانے والے بچے بن گئے ہوں۔ اب وہ پابندی سے ہم سبھوں کو فون کرنے لگے تھے، خیریت معلوم کرتے ، خواہشیں جاننا چاہتے ، ضرورتیں پوری کرتے اور ملنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع نکالتے۔ سال میں چار پانچ بار ہم لوگوں کو دیکھنے

آجاتے۔علی گڑھ آتے تو میرے اساتذہ پروفیسر قاضی افضال حسین اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کے علاوہ حکیم کلیم اللہ صاحب اور پروفیسر سعود عالم قاسمی سے تقریباً ہر سفر میں اور کبھی کبھی ڈاکٹر مودود اشرف اور ڈاکٹر مسعود اشرف سے ضرور ملتے۔حکیم کلیم اللہ صاحب کی نیکی، وضعداری، ان کے حسن سلوک اور ان کے علاج کے بے حد قائل تھے۔حکیم کلیم اللہ صاحب ابو جان کو الگ سے دیکھتے تھے،مطب والوں سے کہہ رکھا تھا کہ دواؤں کے پیسے نہیں لینے ہیں، ضیافت ضرور کرتے تھے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی تحفہ بھی پیش کرتے تھے۔حکیم صاحب جیسا عالموں کا اکرام کرنے والا میں نے کم ہی لوگوں کو دیکھا ہے۔ابوجان قاضی افضال صاحب کو بھی بہت چاہتے تھے۔ وہ مجھے جب بھی خط لکھتے یا فون کرتے تو قاضی افضال صاحب کی خیریت ضرور پوچھتے اور ان کو سلام کہلواتے، ہمیشہ ان کا ذکرِ خیر کرتے، یہاں تک کہ جب آخری دنوں میں باتیں بھولنے لگے تھے تب بھی ان کے بارے میں باتیں اور ان کی تعریفیں کرتے تھے۔

روشن کی مہمان نوازی اور اس کی خدمت گزاری سے بے حد خوش ہوتے۔ اور اس کے طور طریقے اور سلیقے کو کافی سراہتے تھے۔علی گڑھ میں کسی سے ملنے جاتے تو عادل کو بھی ساتھ لے جاتے۔گھر پر عادل ابو جان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے،لیکن تابی (تابندہ ظفیر) دادا دادا کہتے ہوئے کبھی ان کی گود میں جا بیٹھتی،کبھی ان کے کندھوں پر چڑھ جاتی،کبھی ابو جان کی ٹوپی اوڑھ کر اور ان کی چھڑی لے کر ان کی طرح چلنے کی نقل کرتی۔ابوجان کہتے، یہ تو میری سنتی ہی نہیں۔ تم اسے تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے ہٹالو، گھڑی بھر بھی یہ سکون سے نہیں رہتی ہے۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ ایسے لمحے میرے لیے بڑے ہی مسرت آمیز اور انتہائی سکون بخش ہوتے تھے۔ مجھے لگتا جیسے ابوجان کے کندھوں پر چڑھنے اور ان کے ساتھ اتنے پیار اور ایسی بے تکلفی سے کھیلنے والی ننھی سی بچی میری بیٹی نہیں، میرا

بچپنا ہے۔

ابوجان ٹالنا چاہتے تھے لیکن ان کی کمزوری کے ساتھ ساتھ بڑے بھائی جان کا اصرار بھی بڑھتا جارہا تھا۔ بالآخر انھوں نے مجھ سے پوچھا ''تمھاری کیا رائے ہے، سجاد کا بار بار فون آتا ہے کہ اب آپ کی عمر آرام کرنے کی ہے، گھر آکر رہیے۔'' ساتھ ہی یہ بھی کہا،'' لیکن گھر پر میرا جی نہیں لگے گا۔ وہاں طبیعت گھبرائے گی۔'' ''نہیں ابو۔آپ دیوبند ہی رہیں، ماشااللہ آپ کی صحت بہت اچھی ہے، وہاں آپ کا خیال رکھنے والے کافی لوگ ہیں۔ ہر وقت ملنے جلنے والے آتے رہتے ہیں جس سے آپ کا جی بہلتا ہے، پڑھے لکھوں کا ماحول ہے۔'' بہت خوش ہوئے ،بولے'' ہاں یہ سب تو ہے۔تو کیا تمھاری رائے ہے کہ ابھی کچھ دن مجھے یہیں رہنا چاہیے''۔''نہیں ابو جان! جس دن یا جس لمحے آپ کا دل گھر رہنے کو آمادہ ہو جائے آپ دیوبند چھوڑ دیجیے، ہم سب تو آپ کو خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتے ہیں۔'' ابوجان خاموش ہوگئے۔ کچھ ہی دنوں بعد پھر فون آیا،'' تمھاری کیا رائے ہے۔ سجاد تو بضد ہیں کہ صحت کے اس عرصے میں مجھے گھر رہنا چاہیے۔'' پھر اپنی رائے ظاہر کی— ''لیکن وہاں تو میں بالکل اکیلا ہوجاؤں گا۔''''نہیں ابوجان آپ اکیلے کہاں ہوں گے، پورا گھر ہے، آپ کے پوتے پوتیاں ہیں، بھائی جان اور ریحانہ باجی ہیں۔اور گاؤں کے لوگ بھی تو ہوں گے!''۔'' تو تمھاری بھی یہی رائے ہے؟ ''''جی ابو اچھا رہے گا۔'''' تو ٹھیک ہے'' ابو نے پرسکون لہجے میں کہا تھا۔ابوجان کی ذہنی کشمکش کا اندازہ مجھے ذرا بعد میں ہوا۔جس باپ نے اپنے بچوں کی کوئی خواہش کبھی رد نہیں کی تھی، یہ خواہش کیسے ٹھکراتا۔ دو بیٹوں کی الگ الگ رائے تھی اور ماننے کی صورت میں کسی ایک کی خواہش رد ہوتی تھی۔ زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب ابوجان کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے بجائے تذبذب کا شکار تھے۔یا شاید ہم لوگوں کی اتفاقِ رائے کے منتظر یا خواہش مند تھے۔ شاید مجھے بھائی جان کے

مشورے کی تائید پہلے کرنی چاہیے تھی۔ یا شاید بھائی جان کو ابو کے گھر آنے پر اس قدر اصرار نہ کرنا چاہیے تھا۔

ابو نے فون پر پہلے ہی بتا دیا تھا کہ دیوبند سے پہنچنے والی اور دربھنگہ کو جانے والی ٹرینوں کے درمیان صرف دو ڈھائی گھنٹے کا وقفہ ہوگا۔ اتنے کم وقت میں بچوں سے ملاقات ممکن نہیں۔ تم اسٹیشن پر آجانا، اور ہاں بچوں کو ہرگز مت لانا، انھیں پریشانی ہوگی۔ سنہ 2008 کے ستمبر کی اکیس تاریخ تھی۔ اسٹیشن پر میرے ساتھ شعبے کے میرے رفیقِ کار ڈاکٹر محمد کاظم بھی تھے۔ حسبِ معمول ابو کے ساتھ دو تین طالبِ علم بھی آئے تھے، لیکن ابو کی حالت یقیناً حسبِ سابق نہ تھی۔ بیس پچیس دنوں میں کوئی اس قدر کمزور کیسے ہوسکتا ہے۔ پچھلی ملاقات میں تو وہ خاصے تندرست اور بشاش تھے۔ اور سفر میں یوں کبھی کھوئے کھوئے سے بھی نہ ہوتے تھے۔ کاظم کو دیکھ کر کہا، ''اچھا ہوا آپ بھی آ گئے، ملاقات ہوگئی۔'' یہ پہلا موقع تھا جب ابو جان کی گفتگو کا وقفہ مختصر اور سوچ کا عرصہ طویل تھا۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا۔ چہرے کے رنگوں اور تاثرات کی یہ تبدیلی شاید اس مدینۃ العلم کی سرد و گرم یادوں کا عکس تھا جہاں انھوں نے عمرِ عزیز کے 53 سال گزارے تھے۔ ٹرین روانہ ہونے سے پہلے ابو جان نے گھر کی مٹھائی، ہم لوگوں کی چائے، اور عادل اور تابی کی سرکاری فیس دینے کے بعد مصافحہ کرتے ہوئے کہا ''اب آپ لوگ جائیے، خدا سلامت رکھے۔''

ابو جان کے پہنچنے کے بعد گاؤں میں خوشی کا ماحول تھا، وہ بھی مطمئن تھے۔ ملنے آنے والوں اور پاس بیٹھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ صبح کے ناشتے اور شام کی چائے پر کئی لوگ ہوتے۔ مذہبی مسائل اور مقامی سیاست سے لے کر فصل کی حالت اور کھیتی باڑی کے طریقوں تک پر گفتگو ہوتی۔ مسجد کی تعمیر اور مدرسے کی ترقی کے منصوبے باندھے جاتے اور معاشی اعتبار سے کمزور لوگوں کے احوال جاننے کی

کوشش کرتے۔ بعد میں بڑے بھائی جان کے ہاتھوں کسی کے علاج کے پیسے، کسی کی آنکھوں کے آپریشن کے لیے پیسے، تو کسی کو عید کے کپڑے اور کسی کو پُرسہ کے کپڑے بھجواتے۔ کسی بھی غریب کے گھر کی تعمیر اور بیٹی کی شادی میں ضرور مدد کرتے، کہتے، ''یہ میرے والد کی سنت ہے۔''

چھ سات مہینے بعد ملنے والوں اور پاس بیٹھنے والوں کی تعداد بتدریج کم ہوتی گئی، اور ابو جان کا ایک مخصوص اور مانوس ماحول سے بچھڑنے کا احساس بڑھتا گیا۔ چھوٹے چچا ابو محمد، امین صاحب، پنڈت ولی محمد، میرا چھوتا بھانجہ آفتاب عالم راجہ، ڈاکٹر امیش اور ماسٹر دنیش گانو سے، اور شکری سے میرے چھوٹے بہنوئی مولانا عابد حسین رحمانی اور روپس پور سے میرے بھانجے شکیل احمد پابندی سے ملنے آتے تھے۔ ریحانہ باجی گاؤں ہی میں رہتی ہیں، وہ روزانہ آتیں اور کچھ وقت ابو جان کی خدمت میں گزارتیں۔ وہ ابو جان سے بڑی بے تکلفی سے خوب باتیں کرتیں اور ان کے ہاتھ پاؤں کی مالش کرتیں۔ خدمت کرنے کی یہ خوش نصیبی ریحانہ باجی کو ابو جان کے آخری ایام تک حاصل رہی۔ ابو جان کی چھوٹی پوتیاں پنکی، رنکی، اور پنجم ان کی خدمت میں مصروف ہوتیں، زیادہ تر کام یہی بچیاں کرتی تھیں۔ اور پوتے رضوان، عرشی (فیصل) اور عمران انھیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔

ابو جان کا لکھنا پڑھنا بالکل ختم ہو چکا تھا، اور جو زندگی وہ گزار رہے تھے یقیناً ان کی نہ تھی۔ غالباً جنوری 2010 میں ان کی طبیعت پہلی بار زیادہ خراب ہوئی۔ تین چار دنوں بعد جب طبیعت ذرا سنبھل گئی تو رضوان سے کہا کہ میرے بیٹوں اور بیٹیوں کو فون کر کے کہو کہ دادا جان بیمار ہیں، آ کر مل لیں۔ اگلے ہفتے ان کے تمام بیٹے بیٹیاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ ابو جان کے پاس موجود تھے۔ ناشتے کے بعد ابو جان اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز تھے، اور ہم سب ان کے ارد گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میری بھتیجی ڈولی (عصمت ساجدہ) جو گھر میں

سب سے زیادہ شوخ اور بے تکلف ہے، بولی، ''دادا جان! آپ نے تو ہم سب کو ڈرا دیا تھا۔ ہر کوئی اپنی ملازمت کی جگہوں اور سسرالوں سے ڈرتا اور دعائیں کرتا ہوا آیا کہ خدا کرے آپ سلامت ہوں۔'' ابو جان ہنسے، ''تو کیا دادا جان ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ چلو اچھا ہوا میری بیماری کے بہانے سب آ تو گئے۔ خواہش تھی کہ مرنے سے پہلے سب کو ایک ساتھ اپنے پاس دیکھ لوں، پتہ نہیں اس وقت سب آ پائیں گے یا نہیں۔'' پھر خوش ہو کر کہنے لگے دیکھو عباد بھی آ گیا، اس کی مجھے زیادہ فکر تھی۔

چار یا پانچ مہینے بعد جب دوسری دفعہ گھر گیا تو میرے ساتھ تابی اور ڈاکٹر ارجمند آرا بھی تھیں۔ ابو جان ہم لوگوں کو دیکھ کر بیحد خوش ہوئے۔ کہنے لگے گھر آتے رہنا چاہیے، اس سے محبت بڑھتی ہے۔ جگہ بدلنے سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ پھر ارجمند سے بولے، ''اب کی بار آیئے گا تو مجھے بھی ساتھ لے چلیے گا۔ گاؤں میں جی اوبنے لگا ہے۔'' دو تین دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ ابو جان اپنی زندگی اور صورتِ حال سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنوں کے درمیان بھی اجنبیت اور اپنے ہی گھر میں قید کے احساس سے گزر رہے ہوں۔ اور شاید ان کا یہ احساس غلط بھی نہ تھا کہ جس شخص کا مسکن سیمنار، سمپوزیم، کانفرنس، میٹنگ، دارالعلوم دیوبند، اسلامک فقہ اکیڈمی اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی نمائندگی، اور مختلف دینی، علمی اور اصلاحی اداروں اور تنظیموں کے اجلاس میں شرکت کے حوالے سے ہندوستان کے بیشتر شہر رہے ہوں، اور جس کے اپنوں کا شمار ممکن نہ تھا وہ خاندان کے چند افراد کے ساتھ ایک چھوٹے سے گاؤں، گاؤں سے گھر اور چلنے پھرنے کی حد تک محض ایک کمرے اور اس کے لان تک محدود ہوتا چلا گیا تھا۔ شہرِ علم کے باشندے کو قریے کی محدود فضا راس نہ آئی تھی، اور آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنے والے پنچھی کا پنجرے میں دم گھٹتا تھا۔ ابو کی اس کیفیت کو دیکھ کر مجھے

گیبریل گارسیا مارکیز کی کہانی کا وہ فرشتہ کردار یاد آیا جو پنکھ بھیگ جانے کی وجہ سے فرشتوں کے دیس کو نہ لوٹ سکا تھا اور اپنے دوستوں اور ہم زبانوں سے بچھڑ کر گاؤں والوں کے رحم و کرم پر رہنے کو مجبور تھا۔

دیوبند سے آئے ہوئے ابو جان کو تقریباً دو سال ہو گئے تھے۔ کمزوری ان پر غالب آ چکی تھی۔ انھیں بوریت اور تنہائی کا شدید احساس ہوتا، طبیعت الجھنے اور باتیں بسرنے لگی تھی۔ نماز میں سجدوں کی تعداد یاد نہیں رہتی، کبھی ایک وقت کی نماز دوبارہ پڑھ لیتے، کبھی نماز کا وقت بھول جاتے۔ علم کی وسعت، ذہن کی کشادگی، یادوں کا ذخیرہ اور باتوں کی بہتات محدود جملوں کے پیمانے میں سما کر رہ گئے تھے۔ باتوں کی تکرار اور ابو کے نسیان کو لوگ عمر کا تقاضا اور مرض کا عارضہ سمجھتے تھے۔ لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ خود پر عائد تمام فرائض کو پورا کرنے کے بعد ابو جان ایک بار پھر ننھے سے بچے بن گئے تھے— انتہائی معصوم، دنیا کی تمام کثافتوں سے پاک۔

ایک دن مغرب بعد رضوان، افضل، میں، مولانا نصر اللہ اور حافظ رحمت اللہ ابو جان کے پاس بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ابو جان نے اپنے پوتے رضوان کو مخاطب کیا ''سنو رضوان! میں چاہتا ہوں کہ میری قبر مدرسے والی زمین میں بنے۔ بچے روزانہ قرآن پڑھیں گے تو مجھے بھی ثواب ملے گا۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے لوگوں کو بھی زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔ میں نے تمھارے باپ سے بات کر لی ہے۔ وہ جگہ دینے کو تیار ہیں، لیکن زمین تمھارے نام ہے اس لیے تمھاری مرضی اور اجازت ضروری ہے۔'' رضوان نے ہنستے ہوئے کہا ''دادا جان! وہ زمین کیا، آپ حکم دیں تو آپ کی قبر میں اپنے گھر میں بنوانے کو تیار ہوں۔'' ابو جان کو بھی ہنسی آ گئی۔ کہنے لگے ''گھر میں تم رہنا، اس زمین کے بارے میں بتاؤ۔'' ہاں دادا جان میں راضی خوشی زمین دینے کو تیار ہوں۔'' اب ابو جان نے میری رائے پوچھی۔ میں

نے ابو جان کی تائید کی اور کہا آپ کی خواہش کا احترام ہم سب پر لازم ہے۔ ظاہر ہے میں اسے بس بات برائے بات سمجھ رہا تھا، کیونکہ یہ بات ابو جان آج پہلی بار نہیں پچھلے کئی دنوں سے کر رہے تھے۔ ابو جان نے مجھ سے کہا ''سجاد کو بلاؤ، اس سے بھی رائے لے لی جائے۔'' بڑے بھائی جان بلائے گئے اور یہ بات طے ہوگئی کہ ابو جان کی قبر اُن کے قائم کیے ہوئے مدرسے کے پاس بنائی جائے گی۔ مولانا نصراللہ نے قبر کی مخصوص جگہ کے بارے میں پوچھا، تو ابو جان نے جواب دیا ''میرے انتقال کے بعد مناسب جگہ کا انتخاب یہ لوگ مل کر کر لیں گے۔ وہاں دفن ہونے کا منشا صرف تلاوت کلام پاک کی برکت کا حصول ہے۔''

سردیاں شروع ہوتے ہی تابی کی ضد شدید ہوتی گئی کہ اب کی بار پھر دادا جان کے پاس جانا ہے، میں نے دادا جان سے وعدہ کیا تھا کہ پاپا کو لے کر ضرور آؤں گی۔ اس لیے جاڑے کی پوری چھٹیاں ابو جان کے ساتھ گزارنے کے لیے میں اور تابی گاؤں پہنچ گئے تھے۔ یقین نہ آتا تھا کہ ساری چھٹیاں اتنی جلد ختم ہو جائیں گی اور آج ہی ہم لوگوں کو دہلی واپس جانا ہوگا۔ صبح کی چائے کے بعد ابو جان نے کمرے میں بلا کر اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ ''آج ہی کا ٹکٹ ہے؟''۔ ''جی ابو جان''۔ ''ٹرین کتنے بجے ہے؟'' ساڑھے تین بجے۔'' میں نے انھیں بتایا۔ ''خدا خیر و عافیت سے پہنچائے۔'' ابو جان نے کہا، اور پھر کندھے سے اپنا اونی رومال اتار کر مجھے دیتے ہوئے کہنے لگے ''اسے رکھ لو، سردیوں میں اوڑھنے کا ہے۔'' میں نے رومال ابو جان کے کندھوں پر واپس ڈال دیا۔ ابو جان اس کی ابھی آپ کو ضرورت ہے۔ اور پھر آپ تو جانتے ہیں میں کبھی رومال یا مفلر استعمال نہیں کرتا ہوں۔'' جانتا ہوں۔ پھر بھی میری طرف سے رکھ لو۔ اور یہ لو میری ٹوپی بھی رکھ لو، میرے پاس کئی ایک ہیں۔'' رومال تہہ کر کے اور سرہانے سے اپنی دو پلی ٹوپی اٹھا کر انھوں نے میرے ہاتھوں پر رکھ دی۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔ ابو جان یہ ٹوپی کیا

ہوگی۔'' پہننا مت، بس تمھارے پاس رہے گی۔'' ابو جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے دونوں چیزیں لے کر بیگ میں ڈال لیں۔

رخصت ہونے سے پہلے ابو جان کے کمرے میں ان سے ملنے گیا تو میرے ساتھ تابی، بڑی بھابی، رضوان، عرشی، پنجم، ڈولی اور گھر کے دوسرے بچے بھی تھے۔ میں نے ابو جان کو سلام کیا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور دیر تک خالی نظروں سے مجھے یوں دیکھتے رہے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں، یا شاید آنکھوں میں بسا لینا چاہتے ہوں۔ کچھ دیر تک ابو جان کے پاس رکا رہا پھر ان سے مصافحہ کر کے چلنے لگا تو وہ بھی میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ نقاہت کی وجہ سے وہ خود کو بمشکل سنبھال پا رہے تھے۔ ابو جان آپ لیٹ جائیے، میں چلا جاؤں گا۔'' مجھے تو لیٹنا ہی ہے بیٹا، دروازے تک تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔'' مجھے محسوس ہوا کہ ابو جان کی آواز میں کپکپاہٹ ہے۔ نظر اٹھا کر چہرے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ابو جان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بڑی بھابی اور گھر کے دوسرے افراد بھی رونے لگے۔ خود پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا، ''ابو جان دعائیں دیجیے گا... انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔'' ابو جان اب بچوں کی طرح آواز سے رونے لگے تھے۔ ''دعا تو بہت کرتا ہوں.. معلوم نہیں تمھیں دیکھ پاؤں گا یا نہیں... خدا تم لوگوں کو خوش رکھے۔'' ابو جان کو اس طرح روتے ہوئے ہم لوگوں نے پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ جب دیوبند میں ان کے استاد مولانا عبداللطیف صاحب نعمانی کے انتقال کی خبر آئی تھی تب بھی ابو جان اس طرح نہ روئے تھے۔ بس دو دنوں تک بغیر کھائے پیے بستر پر لیٹے چادر میں چھُپ کر آنسو بہاتے رہے تھے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ دنیا کے سبھی باپ اپنے بچوں سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں یا نہیں، لیکن یہ یقین ہے کہ ایسی محبت صرف ابو جان ہی کر سکتے تھے۔

جانے ابو جان نے بچپن سے اب تک مجھے کتنی بار رخصت کیا تھا لیکن ان

کے چہرے پر غم کا تاثر تک پڑھنا آسان نہ تھا۔ یہ تو بعد میں دوستوں سے معلوم ہوتا تھا کہ پہنچنے کا خط یا فون نہ آنے تک وہ کس قدر فکرمند رہا کرتے تھے۔ لیکن آج ابوجان کے آنسوؤں، ان کی تڑپ اور بچوں کی سی معصومیت نے ان کی شخصیت کا آخری اسرار — جسے میں بچپن سے جاننا چاہتا تھا کہ 'ابو جان مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں'؟— کھول دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور وہ ہم سب کو چھوڑ کر بہت جلد ایک ایسی ان دیکھی لیکن سچی دنیا میں ہمیشہ کے لیے چلے جانے والے ہیں جہاں صرف دنیا کی کثافتوں سے پاک اور بچوں جیسے معصوم لوگ ہی رہتے ہیں۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب - سادگی کے پیکر

مولانا نور عالم خلیل امینی ☆

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب سے ہم وطن اور ''مئوناتھ بھنجن'' میں تعلیم پانے اور وہیں کے ایک مدرسہ ''مفتاح العلوم'' میں کسبِ علم و کمال کرنے کے حوالے سے، تعلیمی ہم وطنی کے باوجود راقم الحروف کو دارالعلوم دیوبند ہی میں داخلہ لینے کے بعد متعارِف ہونے کا موقع ملا، نہ صرف متعارِف ہونے؛ بلکہ دگر محنتی اور ذوقِ تعلّم و مطالعہ سے سرشار اپنے کئی معاصر دوستوں اور ہم درس ساتھیوں کے ہم راہ بہت زیادہ گھلنے ملنے اور بے شمار علمی فائدہ اٹھانے کی سعادت حاصل رہی۔

مفتی صاحب سے جس چیز نے ہم لوگوں کو، اس وقت اور بہت سارے طلبہ کو ہمیشہ، بہت زیادہ قریب ہوجانے اور بہت بہت فائدہ اٹھانے کا موقع دیا، وہ اُن کی مثالی سادگی، مومنانہ اُنسیت، پدرانہ اپنائیت، بزرگانہ شفقت، اِسلامیانہ ہمدردی؛ ہر ایک کے لیے خلوص اور ظاہر و باطن کی یکسانیت تھی اور ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، اُن سے کوئی مشورہ کرکے، کسی طرح کی طالبِ علمانہ گفتگو، یا کسی موضوع پر استفادے کے لیے تبادلۂ خیال کرکے، کبھی بھی بے مزہ نہ ہوا، نہ یہ خدشہ ہوا کہ فلاں لفظ یا جملہ ان کی علمی شان، بزرگانہ مقام اور راہِ علم و آگہی پر اُن کے طویل تجربہ کارانہ سفر کے حوالے سے، ان کی عظمت کے خلاف تھا؛ اِس لیے خدا نہ خواستہ، اب وہ دوسری ملاقات میں مجھے منھ نہ لگائیں گے۔

☆ استاذ ادب عربی وایڈیٹر الداعی، دارالعلوم دیوبند

اُن کی اس اُفتادگی کی وجہ سے -جس پر خالق نے مصلحت اور حکمت ہی کے تحت ان کو پیدا کیا ہے- ان کی طرف ہر ملنے والے کا دل کھنچتا ہے اور وہ بار بار ملنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ وصف میرے نزدیک، ان کے سارے علمی وعملی اوصاف پر بھاری ہے؛ کیوں کہ یہ نبوی وصف ہے۔ حضور ﷺ -فداہ ابی و امّی- کے پیارے ساتھی بھی اِسی وصف کے حامل تھے، اسلام میں علم وعمل کے قافلے نے اسی ہتھیار سے جہاں گیری و جہاں داری و جہاں بانی کی ہے۔ خود اسلام نے دلوں کو نرم خوئی و دل جوئی، اخلاقِ کریمانہ اور خلوصِ دل برانہ کے ذریعے ہی فتح کیا ہے۔ اسلام کے سارے اکتسابات کا سہرا ''فاتحِ عالم'' محبت و خلوص اور مسخّرِ عقل وقلب ہم دردی وغم گسای کے سر جاتا ہے۔

مفتی صاحب سے ہم لوگوں کے بہت زیادہ گھلنے ملنے کی اصل وجہ یہی تھی۔ کسی وقت، کسی بھی حال میں اُن کے پاس چلے جایئے، وہ آپ کو خند پیشانی سے خوش آمدید کہیں گے اور اِس طرح خوش ہوں گے جیسے وہ آپ ہی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ اگر لکھنے پڑھنے میں لگے ہوں، تب بھی وہ آپ کے آدھمکنے سے ذرا بھی کبیدہ نہ ہوں گے؛ بلکہ وہ انتہائی ضروری مشغلے کو، جس کو وہ چھیڑے بیٹھے ہوں گے، ایک طرف کو ڈال کر، اب صرف آپ کے لیے خالی ہوجائیں گے۔ ان کے رہن سہن، رفتار وگفتار، زندگی کے سارے جھمیلوں اور شب و روز کے سارے کاموں میں یہی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی نظر آئے گی۔ نستعلیقیت، تہذیب، متانت، نفاست، رکھ رکھاؤ اور ترتیب و تنظیم، ہے تو اپنی جگہ اچھی چیز اور جو لوگ اِن اوصاف کو سلیقے سے برتنا جانتے ہیں، وہ واقعی قابلِ تعریف ہیں؛ لیکن بہ ہر کیف ان کے برتنے میں ذرا سی ''بدسلیقگی'' اور ''بے ڈھنگے پن'' کے در آنے سے، دوسروں کے ساتھ ساتھ، برتنے والے کو بھی اذیّت ہوتی ہے، خواہ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔ مفتی صاحب کو آپ اپنی ذات کی طرح برت سکتے ہیں،

فطرت کی عام بخششوں کی طرح استعمال کر سکتے ہیں، جہاں چاہیے بیٹھا دیجیے، جو چاہیے کھلا دیجیے، جس سواری پر چاہیے سفر کرا دیجیے، اچھے بُرے جس انداز میں پیش آیئے، وہ اپنی بے نفسی اور پیدائشی سادگی کی وجہ سے، ذرا بھی بُرا نہ مانیں گے۔

شخصیت کی طرح تحریر وتقریر میں سادگی

ان کی یہی سادگی، بے ساختگی، نرمی اور گدازی؛ اُن کی تحریر وتقریر میں نظر آتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے عام فہم مُفردات و مرکّبات سے ان کی تحریر وتقریر کے جملے اِس طرح ڈھلے ہوتے ہیں کہ آپ کو، اُن کے جیسے کسی بھی کثیر التصانیف عالم اور اہلِ قلم کی تحریر میں یہ چیز دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ وہ نہ لفظیّات کی شوخی سے قاری کے لیے باعثِ تکان ہوتے ہیں، نہ اسلوب کی شوکت کے باعث مرعوبیّت، نہ ساختیات کے بناؤ سنگار سے باعثِ الجھن، نہ فصاحت و بلاغت کی بے جا زور آوری سے باعثِ اذیت، نہ جملوں کی درازی اور پُر پیچ ہونے کی وجہ سے ہمت شکن۔ آپ پڑھتے اور سنتے جایئے، آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کو، آپ ہی کی بات، آپ ہی کی زبان میں، کہی جارہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں ہم لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ میں نے لکھنے کے لیے کسی تکلف کو راہ نما نہیں بنایا۔ بس بلا ارادہ اور بے تکلف، اپنی بات کو اپنی زبان میں، کسی آورد اور گہری سوچ کے بغیر، لکھنے کا میں نے اپنے آپ کو عادی بنایا۔ لفظوں اور ترکیبوں کی تحسین وتزیین کی کبھی نہیں سوچی، نہ اِس پر توجہ دی، نہ اِس کو مسئلہ بنایا۔ غالباً اچھا اور سچّا اور کھرا لکھنے کے لیے، یہ بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والا کسی بھی مرحلے میں اپنے کو تھکاتا ہے، نہ قاری کو۔ اِس کے سوا جتنے طریقے ہیں، بے شمار خوبیوں کے باوجود، بے شمار خرابیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب کا اُصول طبعی ہے، بے ساختہ ہے، سہل العمل ہے، سہل التقلید

ہے۔ نوآموز اور نو واردِ بساطِ تحریر کو، آپ اس سے زیادہ سیدھی، فطری، سچی اور حقیقت سے سوفی صد ہم آہنگ راہ کی راہ نمائی کر بھی نہیں سکتے؛ اسی لیے مفتی صاحب کی تحریر میں، طوالت ہے نہ تکرار، الفاظ کا الجھاؤ ہے نہ جملوں کا، ترادف کی بھرمار ہے نہ الفاظ وتعبیرات کا اِسرافِ بے جا۔

مفتی صاحب کا تحریری امتیاز

ان کی طبعی نرمی وگدازی، سادگی وخوش اَخلاقی ہی کا اثر، اُن کی طرزِ تحریر پر بھی ہے: وہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور خوب صورت حروف میں اپنی بات لکھتے ہیں۔ سطریں بالکل سیدھی جیسے اسکیل سے لکیر ڈال کر لکھی گئی ہوں، ہر لفظ؛ بلکہ ہر حرف سے جیسے ندا آرہی ہو کہ یہ سادہ مزاج اور تکلف نا آشنا عالم کی تحریر ہے۔ مفتی صاحب بہت سے علما اور ''تعلیم یافتہ'' کہے جانے والے بدسلیقہ لوگوں کی طرح اپنی تحریر کے بھدّے پن، شکستگی، سطروں کی کجی، حروف کی نامانوس صورت گری، یا اُن کے بھاری بھرکم پن اور بڑے ''ڈیل ڈول'' کے ذریعے یا بہت باریک اور چھوٹے ہونے کی وجہ سے ناقابلِ قراءت ہونے کی بنا پر؛ آپ کے لیے باعثِ اذیّت نہ ہوں گے۔ وہ کوئی خط لکھیں، درخواست لکھیں، مضمون تحریر کریں، کسی کتاب کی تالیف کریں؛ ہمیشہ اُن کی تحریر قلم برداشتہ، کاٹ چھانٹ سے پاک اور تبییض کی ضرورت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ میں نے جن مُعاصر اہل علم وکمال اور صاحب تالیف کو دیکھا ہے اور ان کی صحبت سے فیض پایا ہے، ان میں تحریر کی صفائی؛ بلکہ خوش خطی کے حوالے سے علامہ، مفتیِ اعظم مولانا محمد کفایت اللہ شاہ جہاں پوری، ثم الدہلویؒ (متوفی ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء) کے صاحب زادے، ادیب و شاعر وعالم وفقیہ مولانا حفیظ الرحمٰن واصفؔ (متوفی ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء) کے بعد حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اول الذکر تو اپنے علمی کمالات کے ساتھ ساتھ باقاعدہ خطّاط اور خوش خطی کے ماہرین میں تھے؛ لیکن مفتی

صاحب نے خوش خطی کے فن پر شاید کبھی بھی توجہ نہ دی ہوگی، مگر طبعی طور پر اُن کی تحریریں، اُن تمام خوبیوں کی حامل ہوتی ہیں، جن کی کسی باذوق قاری کو نہ صرف تلاش ہوتی ہے؛ بلکہ جن سے، ہر قاری کا جی خوش ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس کے قلب و ذہن کو پڑھتے وقت راحت محسوس ہوتی ہے اور دعا دیتا ہے کہ اللہ صاحبِ تحریر کو جزائے خیر دے کہ اُس نے راحت بخش طرزِ تحریر سے بھی فائدہ پہنچایا۔

مفتی صاحب نے اچھا کیا کہ اپنی سوانح بھی، اپنی زندگی ہی میں اپنے ہاتھ سے ''زندگی کا علمی سفر'' کے نام سے لکھ کر علماء، طلبہ، اہلِ قلم اور تاریخ کے شائقین کو علمی تحفے سے نواز کر، اُن پر بڑا احسان کیا۔ آدمی اپنے حوالے سے جتنی سچی بات خود کہہ سکتا ہے، دوسرا آدمی نہیں کہہ سکتا۔ بنیادی اور اصل معلومات بھی جن کے بغیر کسی تاریخ، سوانح اور سیرت کی اَساس قائم نہیں ہوسکتی، آدمی اپنے حوالے سے خود ہی فراہم کرسکتا ہے۔ دوسروں کی فراہم کردہ معلومات اتنی لائق اعتماد نہیں ہوسکتیں، جتنی خود کی فراہم کردہ، نیز دوسروں کے لیے کسی کے متعلق اَساسی معلومات تک پہنچنا مشکل بھی ہوتا ہے؛ اسی لیے آج کل ''بایوڈاٹا'' (ذاتی بنیادی معلومات) کا جو سلسلہ چلا ہوا ہے، بہت مفید ہے۔

مفتی صاحب کے پاس چند منٹ بیٹھیے، آپ اُن کی گفتگو سنیے، چھوٹے چھوٹے اور سادہ جملوں میں آپ کو زندگی کی ایسی حقیقتوں سے روشناس کرادیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی اور آپ عَش عَش کرتے رہ جائیں گے اور حیرت ہوگی کہ دیکھنے میں ایسا سیدھا سادہ بوڑھا زندگی، انسان اور کائنات کا اتنا کچھ تجربہ کیوں کر رکھتا ہے۔ اِس کے بعد اپنی زندگی میں جتنا کچھ تجربہ کریں گے آپ کے نزدیک مفتی صاحب کی کہی ہوئی بات کی سچائی کی تہیں ایک ایک کرکے کھلتی چلی جائیں گی اور یقین ہوجائے گا کہ جس حوالے سے، انھوں نے جو بات کہی تھی، وہ حرفِ آخر یا پتھر کی لکیر تھی، اب اُس سے آگے یا اُس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔

ظاہر و باطن کی یکسانیت

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مفتی صاحب، صرف ظاہر کے سادہ اور نرم خو ہی نہیں، وہ دل کے بھی بہت صاف اور اس کی بیماریوں سے میرے تجربے کے مطابق خاصے پاک ہیں، کینہ، بغض، دشمنی کے جذبات کی پرورش اور انسانوں سے نفرت کا ان کے ہاں کوئی گزر نہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اگر کسی سے، کوئی تکلیف پہنچتی ہوگی، تو میرا دل کہتا ہے کہ اس کی وجہ سے بھی ان کے دل میں پیدا ہونے والا تأثر، آنے اور گزر جانے والے خیال کی طرح آتا اور گزر جاتا ہوگا۔ اِنسان کا چہرہ اُس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے، مفتی صاحب کے چہرے کو پڑھنے والا ہر آدمی میری بات کی تصدیق کرسکتا ہے۔

یہ وصف ہے جو تھوڑے علم، علمی تحقیقات اور علمی اِفادے اور فکری نفع رسانی سے تہی دامنی؛ بلکہ بالکل جہل کے ساتھ بھی انتہائی محبوب ہوتی ہے؛ لیکن اگر یہ مفتی صاحب جیسے علمی، فکری، تالیفی اور تدریسی خدمات کے بڑے سرمایے کے حامل میں پائی جائے، تو اور بھی لائقِ محبت اور قدر دانی ہے؛ کیوں کہ عموماً ان سے بہت چھوٹے قد کے، بہت سے لوگ علمی پندار کی وجہ سے دل کے میلے، ظاہر کے برّاق اور باطن کے انتہائی تاریک ہوتے ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ اکثر ''اہلِ علم'' اور ''باکمال'' سے مل کر جی خوش نہ ہوا۔ انھیں بَرَت کر، انھیں سمجھ کر، دل نے کہا کہ واقعی دور کا ڈھول سہانا ہوتا ہے۔ مفتی صاحب سے مل کر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان سے گفتگو کرکے، ان سے فائدہ اٹھا کر، کبھی بھی کدورت نہ ہوئی۔

مخلص و تجربہ کار مُشیر

مفتی صاحب کا ایک اور وصف بھی بہت قدر کے لائق ہے کہ آپ اُن

سے کسی مسئلے میں مشورہ کیجیے، تو بہت صحیح اور ٹھوس مشورہ دیں گے مشورے کے حوالے سے یہ بتایا گیا ہے مشورہ مخلص، صالح اور سن رسیدہ و تجربے کار سے کرنا چاہیے۔ مفتی صاحب میں یہ سارے اوصاف بہ تمام و کمال پائے جاتے ہیں۔ اُن سے جب بھی کوئی مشورہ کیا اور مشورے کے بعد اٹھا، تو دل میں انشراح محسوس ہوا اور بعد میں اُس پر عمل کیا، تو خیر ہی خیر نظر آیا اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ اپنے اس بندے کو بہت نوازے کہ اِس نے مجھے میرے مطلب اور مفاد کی صحیح راہ دکھائی۔

خُردوں کی کامیابی کو اپنی کامیابی تصور کرنے والے

مفتی صاحب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ خردوں کی کامیابی اور ترقی سے بہت خوش ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ان کی کامیابی کو وہ اپنی ہی کامیابی تصور کرتے ہیں، یہ بھی ان کے مخلص ہونے کی دلیلوں میں سے ایک ہے اور صحیح انسان، سچا مسلمان اور حقیقی معنی میں مربی ہونے کی ٹھوس شہادت بھی۔ جب کہ بہت سے ''بڑے'' چھوٹوں کی ترقی کو اپنی تنزلی سمجھ کر بے حد رنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ بہت سے خرد اور واقعتاً ناچیز قسم کے لوگ بھی نہ صرف اپنے ہم عمروں اور ہم سفروں کے آگے بڑھنے سے ملول ہوتے ہیں؛ بلکہ اپنے بڑوں کے اکتسابات سے بھی بہت افسردہ ہوتے ہیں، جیسے اِں بڑوں نے ان کا کوئی حق مار لیا ہو، یا ان کی راہ روک کے بیٹھ گئے ہوں۔

دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی کی طالب علمی سے، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تدریس کے دوران، حضرت مفتی صاحب سے میں اور میرے بہت سے ساتھی اِس طرح جُڑے رہے، جیسے ایک بیٹا شفیق باپ سے اور ایک سچی طلب رکھنے والا مرید اپنے حلیم و کریم و تجربے کار و خلوص شعار شیخ سے۔ اُن سے غیبو بت کے دوران خط و کتابت بھی رہی اور انھوں نے خطوط کے ذریعے بھی ہمیشہ ایسے

خلوص ومحبت کا ثبوت دیا، جس کا اب کسی سے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کے بہت سے خطوط میرے پاس محفوظ تھے، جو زمانے کی خُرد برد سے محفوظ نہ رہ سکے، اب چند خطوط رہ گئے ہیں، طوالت کے خوف سے صرف ایک خط پر اکتفا کیا جاتا ہے، زندگی نے وفا کیا اور خدائے کریم کی توفیق نے ساتھ دیا، تو انشاء اللہ اپنی خودنوشت میں اُن کے باقی ماندہ خطوط بھی درج کیے جائیں گے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میری تدریس کے اولیں دنوں میں انھوں نے اپنے ایک شفقت نامے کے ذریعے، ناچیز کا حوصلہ بڑھایا اور اپنے تعلقِ خاطر کا اِس طرح اظہار فرمایا:

عزیز مکرم! **أیّدکم اللہ تعالی بروح منہ**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ محبت نامہ ملا، دلی مسرت ہوئی، آپ نے فراموش نہیں کیا، یاد رکھا۔ یہ آپ کے انتہائی خلوص ومحبت کا نتیجہ ہے۔ آپ کے پہلے خط کا جواب لکھا تھا، حیرت ہے نہیں ملا۔ یہ کیوں کر ہوسکتا تھا کہ آپ کا خط آتا اور اس کے باوجود میں خاموش رہ جاتا۔ یقیناً آپ کو اس سے تکلیف پہنچی ہوگی۔ مگر اس میں میری کیا کوتاہی ہے؟۔ میں تو ہر تذکرے کے بعد، خود ہی سوچتا ہوں کہ کب آپ کا خط آئے گا؟ اِس صورت میں ناراضی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟۔ بہ ہر حال اس کا احساس ہے کہ آپ کے قلب میں اِس خاکسار کی محبت ہے۔ آپ کے خط سے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ آپ پڑھانے بھی لگے ہیں، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور اسے ترقی کا زینہ بنائے۔ انشاء اللہ آپ کی طلب ومحنت رائیگاں نہ جائے گی، ثمرہ مل کر رہے گا۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ آپ لکھنؤ میں ہیں تو ابھی میں ۸/دسمبر ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ سے گزرتا ہوا دیوبند آیا ہوں ضرور لکھنؤ اُتر کر ملتا، میں نے سمجھا کہ جب آپ رمضان میں دہلی اور دیوبند نہیں آئے، تو گھر گئے ہوں گے۔ آپ یقین کریں جس قدر خواہش آپ کو ملنے کی ہے، اُس سے زیادہ

قلبی طلب اِدھر بھی ہے اور اِسی کا غالباً نتیجہ ہے کہ جواب نہ پہنچنے کے بعد بھی آپ نے پھر یاد کیا۔

عزیزم سجاد احمد سلمہ فراغت کے بعد گھر گئے تھے، ابھی شوال میں ان کو ''سانحہ'' بھیج کر آیا ہوں، وہاں وہ میٹرک کی تیاری میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب فرمائے اور میاں حماد سلمہ کو جامعہ رحمانی مونگیر بھجوادیا ہے؛ اس لیے کہ ''سانحہ'' سے قریب ہے۔ میاں احمد سجاد اس کی نگرانی بھی کریں گے۔ البتہ عبّاد سلمہ کو اپنے ساتھ یہاں لایا۔ وہ یہاں حفظ کررہے ہیں

مولانا علی میاں مدظلہ، مولانا سعید الرحمٰن سلمہ اور مولانا شمس تبریز سے سلام مسنون عرض ہے۔ اپنی خیریت سے برابر مطلع کرتے رہیں۔ میرا علمی تعلق ندوہ سے بھی ہے؛ اس لیے کہ میں وہاں کچھ دنوں طالب علم رہ چکا ہوں، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمہ اللہ اور مولانا محمد ناظم صاحبؒ اور مولانا اسحاق صاحب دامت برکاتہم، یہ سب ہمارے اساتذہ رہے ہیں، گو ندوہ والے یہ نہیں جانتے۔

طالب دعا

محمد ظفیر الدین، دارالعلوم دیوبند

شب ۶/ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ

●●●

(یہ مضمون ''پس مرگ زندہ'' سے ماخوذ ہے)

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ
ایک جامع شخصیت

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

دوہرا بدن ، اوسط قد و قامت ، کھلا ہوا رنگ ، کشادہ پیشانی ، سفید اور ہلکی داڑھی ، آنکھیں بڑھاپے کی غماز اور موٹے چشمہ کی حامل ، دو پلی ٹوپی ، سفید کرتا نصف پنڈلی تک اور اس سے کچھ نیچے تک پائجامہ ، گاہے اس کرتے پر شیروانی بھی زیب تن ، ہاتھ میں عصائے پیری ، مہمان نواز ، نرم خو ، نرم گفتار ، بڑوں کا بے حد احترام کرنے والے ، خوردوں پر نہایت شفیق و مہربان ، تواضع وانکسار کا پیکر ، ذکر اور اتباعِ سنت کا خاص اہتمام ، سادہ مزاج ، سادہ دل اور سادہ زبان ، اچھے مقرر اور اس سے بڑھ کر مایۂ ناز مصنف ، زود قلم اور خوش رقم ، زندگی بھر لوح و قلم کی رفاقت رکھی اور مختلف موضوعات پر ہزاروں صفحات لکھے ، وقت کی حفاظت کے باب میں علماء کے لئے اسوہ اور سادہ و خاموش طریقہ پر علم و تحقیق کے کام کے لئے بہترین نمونہ ، ان شمائل و خصائل کو اپنے ذہن میں ترتیب دیں ، یہ تھے مخدوم محترم حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ ۔

دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم الشان درسگاہ کے سینئر مفتی ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رکین ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے صدر عالی قدر ، امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ و جھارکھنڈ کے معزز رکن شوریٰ اور مختلف

دینی درسگاہوں کے سرپرست اور نہ جانے کتنے علماء ، ارباب افتاء اور اہل قلم کے استاذ و مربی ۔

آپ کی تاریخ پیدائش ۲۱/شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۷/مارچ ۱۹۲۶ء ہے ، دربھنگہ شہر سے پانچ کیلومیٹر کے فاصلہ پر پورا نوڈیہہ نامی گاؤں آپ کا وطن ہے ، والد ماجد کا اسم گرامی منشی شمس الدین مرحوم ، جو ریلوے ملازم تھے اور اپنی دین داری میں علاقہ میں معروف ، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی ، عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ محمودیہ راج پور نیپال اور مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں حاصل کی ، متوسطات اور منتہی کتابیں مدرسہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ میں پڑھیں اور یہی نسبت آپ کے نام کا جزو ہے ، پھر کچھ دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیر تعلیم رہے ، مدرسہ محمودیہ اور مدرسہ وارث العلوم میں حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس بہار و اُڑیسہ ، جامعہ مفتاح العلوم مئو میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اور مولانا عبد اللطیف نعمانیؒ ، نیز ندوہ میں حضرت مولانا عطا شاہؒ ، حضرت مولانا محمد ناظم ندویؒ ، حضرت مولانا حمید الدین صاحبؒ اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی آپ کے خاص اساتذہ تھے ، اس کے علاوہ آپ کو علامہ سید سلیمان ندویؒ سے بھی استفادہ کا موقع ملا ۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی طبیعت میں اپنے اکابر کا بڑا احترام و اکرام تھا ، آپ کی زبان ہمیشہ ان کے ذکر خیر سے تر رہتی تھی ، اسی لئے آپ بھی ہمیشہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے محبوب اور منظور نظر رہے ، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی آپ کے ساتھ خاص شفقت و عنایت تھی ، آپ محدث اعظمیؒ کے بہت چہیتے تھے ، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ بھی آپ سے بے حد محبت کرتے تھے اور آپ کو خاص کر اخیر زمانے میں ان کا خاص اعتماد و اعتبار حاصل تھا ، اپنے ان بزرگوں کے بعد بھی آپ نے اُن مراکز سے اپنے تعلقات کو پوری طرح استوار رکھا ، جو ان

حضرات سے منسوب تھے، مئو ہمیشہ آمد و رفت رکھا کرتے اور خانقاہ رحمانی مونگیر ابھی تک اہتمام کے ساتھ آتے جاتے اور بعض دفعہ اعتکاف بھی فرماتے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، ندوہ میں مزید کسب علم کے لئے مقیم تھے کہ ان ہی دنوں مولانا محمد اویس ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے وطن کی ایک دینی عربی درسگاہ مدرسہ معدن العلوم نگرام میں صدارت تدریس کی پیشکش کی، مفتی صاحب نے اپنے بزرگوں کے مشورہ سے اس پیشکش کو قبول کرلیا؛ لیکن جلد ہی ملک آزاد ہوا اور فتنہ وفساد کا ایسا دور دورہ ہوا کہ لوگ امن وآشتی کے لئے ترسنے لگے، ان حالات میں آپ کے اعزہ اس بات کے لئے بالکل تیار نہیں ہوئے کہ آپ کو دور جانے دیں؛ چنانچہ بہار ہی میں تدریس کی خدمت انجام دینی شروع کی، بہار کے ضلع مونگیر میں سادات کا ایک قصبہ ''سانحہ'' کے نام سے ہے، یہاں آپ نے تدریس شروع کی، درمیان میں کچھ دنوں آپ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل بھی گئے، یہاں آپ نے مدرسہ کو ترقی دی اور یہیں سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۳۷۵ھ کی بات ہے، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے خانقاہ رحمانی کے عظیم الشان اور خوبصورت کتب خانہ کی تعمیر مکمل کرائی، اس موقع سے آپ نے کتب خانہ کی افتتاحی تقریب رکھی، جس میں ملک کے ممتاز علماء کو مدعو فرمایا، ان مہمان علماء میں سب سے نمایاں نام حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا ہے، اس موقع سے امیر شریعت حضرت مولانا رحمانیؒ کی خواہش پر مفتی صاحبؒ نے ایک مقالہ پڑھا، جو اہل علم موجود تھے، انھوں نے اس کی بہت پذیرائی کی، حضرت قاری صاحبؒ بھی اس تحریر سے بہت متاثر ہوئے اور آپ سے دارالعلوم دیوبند آنے اور خدمت کرنے کی خواہش فرمائی --- یہاں سے مفتی صاحبؒ کی زندگی میں نیا باب کھلتا ہے، جس نے ان کے علمی افادہ کے دائرہ کو وسیع

سے وسیع تر کردیا۔

۴؍صفر ۱۳۷۶ھ کو دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تبلیغ میں آپ کی تقرری عمل میں آئی اور آپ کو'' جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' کے عنوان پر لکھنے کو کہا گیا؛ چنانچہ آپ نے اس موضوع پر دو حصوں میں ایک تحریر مرتب کی، جو معتدل اور متوازن لب ولہجہ کی حامل ہے، پھر چند ہی ماہ بعد آپ کا تبادلہ دارالافتاء میں کردیا گیا اور فتاویٰ نویسی کی خدمات آپ سے متعلق ہوئی، دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ بہت ہی غیر مرتب شکل میں تھا، عام طور پر اہل علم کو اس کی شکایت تھی، حضرت مہتمم صاحب بھی اس کے لئے فکر مند تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کی کتابوں پر نظر اور مطالعہ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے ۱۳۸۲ھ میں کتب خانہ کی ترتیب کی ذمہ داری آپ سے متعلق ہوئی، اسی دور میں آپ نے اس کتب خانہ کے مخطوطات کا تعارف لکھا، جو دو ضخیم جلدوں میں ہے اور طبع ہو چکا ہے، بحمد اللہ مفتی صاحبؒ نے اس کام کو بھی بہتر طور پر انجام دیا اور بکھری ہوئی موتیوں کو خوبصورتی کے ساتھ پرونے کی خدمت سرانجام دی، مفتی صاحب نے کتب خانہ کی ترتیب کا کام اس خوش اُسلوبی سے انجام دیا کہ دوسرے ادارے بھی آپ سے اس بارے میں مشورہ لیا کرتے تھے، ۱۹۷۵ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ۸۵ سالہ جشن منایا تو مخطوطات کی فہرست سازی میں تعاون کے لئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کو کئی ماہ کے لئے ندوہ بلایا اور وہاں بھی مفتی صاحبؒ نے یہ کام بہت ہی عمدگی کے ساتھ انجام دیا۔

دارالعلوم میں آپ مختلف علمی کام انجام دیتے رہے، ایک زمانہ میں فضلاء کی فکری وقلمی تربیت کے لئے'' شعبۂ مطالعہ علوم قرآنی'' کا قیام عمل میں آیا تھا، آپ ہی اس کے ذمہ دار مقرر ہوئے، اس شعبہ میں متعدد باصلاحیت فضلاء کی تربیت ہوئی، جن میں مولانا سید محمد ولی رحمانی، مولانا ریاست علی شیرکوٹی، مولانا محمد

رضوان القاسمیؒ، مولانا شاہین جمالی، مولانا ابراہیم گجراتی اور مولانا سمیع اللہ گونڈوی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، افسوس کہ یہ مفید شعبہ چند ہی سالوں میں بند ہوگیا۔

۱۳۹۶ھ میں دارالعلوم کے عربی ترجمان ''الداعی'' کے لئے نگراں کمیٹی بنائی گئی، آپ بھی اس کمیٹی میں شامل تھے، ۱۳۹۴ھ میں رؤیت ہلال کمیٹی بنی، اس میں بھی آپ کی شرکت تھی، ۱۳۹۴ھ ہی میں دارالقضاء کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کمیٹی کے بھی رکن تھے، ۱۳۹۶ھ میں دارالعلوم کے ایک ممتاز فاضل کو حضرت نانوتویؒ کے علوم پر کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، آپ اس کام کے نگراں مقرر کیے گئے۔

۱۳۸۵ھ سے دارالعلوم کی انتظامیہ میں تبدیلی— یعنی ۱۴۰۲ھ— تک رسالہ ''دارالعلوم'' کا اداریہ لکھنے کی ذمہ داری آپ ہی کی تھی اور یہ اداریئے زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور مسائل کے تجزیہ کے لحاظ سے بھی پورے ملک میں شوق سے پڑھے جاتے تھے، آپ نے ایک عظیم الشان خدمت ترتیب فتاویٰ کی انجام دی، جو یقیناً آپ کا روشن کارنامہ ہے، ۱۴۰۳ھ سے دوبارہ دارالافتاء میں آپ کی واپسی ہوگئی اور نہایت بہتر طریقہ پر آپ اس فریضہ کو انجام دیتے رہے؛ بلکہ نئے مسائل سے متعلق جوابات زیادہ تر آپ ہی کے قلم سے ہوتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اچھے خطیب بھی تھے، زمانہ طالب علمی میں جنگ آزادی میں بھی شریک ہوچکے ہیں اور اس کی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے بھی گذرے ہیں، 'سانحہ' کے زمانۂ قیام میں جمعیۃ علماء ہند کے تحریکی کاموں سے بھی متعلق رہے ہیں۔

آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ابتداء قیام سے رکن تاسیسی اور ادھر عرصہ سے اس کی مجلس عاملہ کے بھی رکن تھے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آپ

ابتداء قیام سے ہی رکن تھے اور اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد جو اکیڈمی کی تنظیم نو ہوئی، اس میں آپ باتفاق رائے صدر منتخب ہوئے، تحریک امارت شرعیہ سے آپ کا تعلق بہت قدیم تھا اور آپ شروع سے امارت کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے۔

لیکن آپ کا اصل مزاج علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا تھا اور اس معاملہ میں مفتی صاحبؒ کی زندگی علماء کے لئے نمونہ کا درجہ رکھتی ہے، یوں تو آپ زمانہ طالب علمی ہی سے قلمی ذوق رکھتے تھے؛ لیکن آپ کی پہلی باضابطہ تصنیف سانحہ کے زمانۂ قیام میں ''اسلام کے نظام مساجد'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئی، جس کی اہل علم کے درمیان بے حد پذیرائی ہوئی، اس کے علاوہ اسلام کے مختلف شعبۂ ہائے حیات پر آپ کی مقبول عام و خاص تصنیفات میں ''اسلام کا نظام امن، اسلام کا نظام عصمت وعفت، اسلامی نظام معیشت اور اسلام کا نظام جرم وسزا'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، دارالعلوم دیوبند سے مفتی صاحبؒ کا فکری تعلق بھی تھا اور قلبی وروحانی تعلق بھی، اس لئے دارالعلوم سے متعلق بھی آپ کی کئی تحریریں ہیں، جو جشن صد سالہ کے موقع سے طبع ہوئیں، جن میں سے ''مشاہیر علماء دیوبند، دارالعلوم— ایک عظیم مکتبہ فکر، دارالعلوم دیوبند— قیام اور پس منظر'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''امارت شرعیہ'' کا نظام آپ کی فکر کا ایک اہم حصہ ہے؛ چنانچہ اس موضوع پر آپ نے ''امارت شرعیہ-- کتاب وسنت کی روشنی میں'' نامی رسالہ تالیف فرمایا، جس میں دارالکفر میں نظام امارت پر گفتگو کی گئی ہے، نیز امارت شرعیہ کی تاریخ پر آپ ہی کے قلم سے ایک مفصل کتاب ''امارت شرعیہ-- دینی جدوجہد کا روشن باب'' ہے، جو امارت کی پوری تاریخ کا نقشہ کھینچتی ہے، سیرت، تاریخ اور شخصیات پر تالیف کا مفتی صاحبؒ کو خاص ذوق تھا، اس سلسلہ میں ''مصائب سرور کونین--

اسوۂ حسنہ‘‘ بڑی مؤثر کتاب ہے، اسی طرح صحابہ اور سلف کے واقعات پر’’ تاریخی حقائق‘‘ اور اسلامی تاریخ کی یادگار مسجدوں پر’’ تاریخ مساجد‘‘ اہم کتابیں ہیں، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ماضی قریب میں اپنے علمی وتحقیقی ذوق کے معاملہ میں امتیازی شان کے حامل صاحب قلم گذرے ہیں، افسوس کہ ان کی حیات اور تذکرہ پر کسی صاحب نے قلم نہیں اُٹھایا تھا، مفتی صاحب نے’’ حیاتِ گیلانیؒ‘‘ کے نام سے مولانا کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی خواہش پر آپ نے دارالعلوم کے شعبۂ تبلیغ سے تعلق کے زمانہ میں دینی عقائد کے نام سے اہل سنت والجماعت اور علماء دیوبند کے عقیدہ کو مرتب فرمایا اور جماعت اسلامی کی فکر پر قلم اُٹھایا، یہ دونوں رسالے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہو چکے ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کا اکابر علماء اور معروف اصحابِ قلم سے علمی ارتباط رہا ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے ان سے مراسلت بھی کی ہے، یہ خطوط بہت سے علمی مضامین، اپنے عہد کے حالات اور کتابوں سے متعلق تبصروں پر مشتمل ہیں، مکتوب الیہ کے علاوہ دوسرے اہل علم کے لئے بھی ان کی افادیت تھی، اسی پس منظر میں آپ نے اپنے نام آئے ہوئے ان مکتوبات کو’’ مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے‘‘ کے نام سے مرتب فرمایا ہے۔

آپ کا سب سے یادگار کارنامہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتاویٰ کی ترتیب کا کام ہے، جو غالباً سولہ ضخیم جلدوں میں، کتاب اللقطہ پر ختم ہوتا ہے اور جس نے پوری دنیا میں شہرت و قبولیت حاصل کی ہے، کاش ترتیب فتاویٰ کا یہ سلسلہ جاری رہتا اور فتاویٰ کی جو امانت بوسیدہ رجسٹروں کے دفینہ میں ہے، وہ بھی سفینوں میں آجاتی تو اہل علم اور عام مسلمانوں کے لئے زندگی کے بہت سے مسائل میں خضر طریق مہیا ہوجاتا، آپ

کے علمی کارناموں میں ایک اہم کام حضرت امیر شریعت مولانا رحمانی کی خواہش پر’’ مجموعۂ قوانین اسلامی‘‘ کی ابتدائی ترتیب کا کام ہے، گو اس کام میں بہت سے علماء اور اربابِ افتاء کی شرکت رہی ہے؛ لیکن اس کے ابتدائی مسودہ کی ترتیب کی سعادت آپ ہی کے حصہ میں آئی، جس کے نگرانِ اعلیٰ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ رہے۔

غالباً آپ کی آخری تالیف آپ کی خودنوشت سوانح ہے، جسے اس حقیر کی خواہش پر کتب خانہ نعیمیہ دیوبند نے’’ زندگی کا علمی سفر‘‘ کے نام سے شائع کیا ہے، یہ نہایت دلچسپ تالیف ہے، جو بہت سے بزرگوں سے متعارف کراتی ہے، ایک طالب کا اپنے اساتذہ سے اور ایک کارکن کا اپنا ذمہ داروں سے کیسا ربط وتعلق ہو، نیز مشکل حالات اور ناموافق ماحول میں بھی انسان کس طرح اپنے کام کو جاری رکھے، اس سلسلہ میں قاری کو روشنی ملتی ہے، مفتی صاحب کے حکم پر اس حقیر نے اس کتاب پر اپنا پیش لفظ لکھا تھا، یہی پیش لفظ کسی قدر اضافہ کے ساتھ اس وقت قارئین کے سامنے ہے۔

آپ کے ان علمی کاموں کے علاوہ جو منظر عام پر آچکے ہیں، دو چیزیں ایسی ہیں، کہ انھیں مرتب ہوکر شائع ہونا چاہئے، ایک تو آپ کے فتاویٰ جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور جن کی ترتیب وطباعت کے سلسلہ میں راقم الحروف بار بار حضرت مفتی صاحبؒ سے تحریک کرتا رہا ہے، دوسرے آپ کے مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور جن کی تعداد خود مفتی صاحبؒ نے اپنی آپ بیتی میں ۱۳۱ لکھی ہے، یہ دونوں چیزیں کئی جلدوں میں طبع ہوں گی، اور اہل علم اور اصحابِ ذوق کی چشم محبت کا سرمہ بنیں گی۔

مفتی صاحبؒ کو جیسے اللہ تعالیٰ نے علمی کاموں کی توفیق عطا فرمائی، اسی طرح ان کاموں کو مقبولیت اور شہرت سے بھی سرفراز فرمایا، ندوۃ المصنفین دہلی جو

ایک زمانے میں علماء دیوبند کا سب سے مؤقر تصنیفی و اشاعتی ادارہ تھا، نے آپ کی کئی تحریروں کو شائع کیا ہے، آپ کی اکثر کتابیں ہند و پاک میں کئی کئی بار طبع ہوچکی ہیں، ''اسلام کا نظام عفت وعصمت'' کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا، اسی کتاب کا فارسی ترجمہ ''حجاب وعفت از دیدگاہ اسلام'' کے نام سے تہران (ایران) سے شائع ہو چکا ہے اور جدید حلقہ میں اس کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا نظام مساجد، نظام امن اور نظام عفت وعصمت، ایسی کتابیں ہیں کہ انھیں عربی میں بھی طبع ہونا چاہئے، یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ چند سال پہلے اس حقیر کا سعودی عرب کا سفر ہوا، ایک صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کچھ اہم کتابیں انگریزی زبان میں تلخیص کے لئے منتخب کی ہیں، ان میں ایک ''اسلام کا نظام عفت وعصمت'' بھی ہے، جس کا انگریزی خلاصہ انھوں نے بنگلور سے شائع کیا ہے، ایک زمانہ میں معارف اور برہان اُردو کے دوسب سے زیادہ مؤقر جرائد تھے، مفتی صاحبؒ برہان کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے۔

حضرت مفتی صاحب ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے بزرگوں اور اہل دل مصلحین کے دامن تربیت سے باندھے رہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے خصوصی اصلاحی تعلق رکھا اور اذکار و اوراد کے سلسلہ میں ان کی نصیحتوں پر عامل رہے، پھر سید صاحب کی ایماء پر ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہوئے، حضرت مدنیؒ کے وصال کے بعد ۱۳۸۵ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے بیعت کی تجدید فرمائی، ۱۳۹۵ھ میں ایک صاحب نسبت اور صاحب علم بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل اللہ حیدرآبادیؒ (حفید: حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ) نے آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا، پھر رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ میں حضرت قاری صاحب نے بھی آپ کو اجازت بیعت دی، مفتی صاحبؒ کی سادگی اور انکساری کہ انھوں

نے عمومی طور پر بیعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔

حضرت مفتی صاحب کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، مفتی صاحبؒ میں متعدد خوبیاں ایسی جمع ہوگئی تھیں، جو کم ہی ایک شخصیت میں جمع ہو پاتی ہیں اور جو خاص کر علماء کے لئے اسوہ ونمونہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

پہلی بات مفتی صاحبؒ کی سادگی ہے، معمولی سا کپڑا، عام قسم کی عینک، سیدھی سادھی جوتی، سفر میں تھیلا بھی معمولی، جہاں ٹھہرائیے ٹھہر جائیں، جہاں بٹھائیے بیٹھ جائیں، عامی سے عامی بھی دعوت دے تو قبول کرلیں، نہ ہٹو، نہ بچو، نہ خدم وحشم کی فوج، نہ گفتگو میں کوئی تکلف، نہ نشست و برخواست میں کوئی تصنع — یہی ہمارے بزرگوں کا طریقہ تھا، سلف کے اس طرز عمل کو مفتی صاحب کی زندگی میں زندہ وتابندہ دیکھا جاسکتا ہے۔

سادگی سے ہی قریب دوسرا وصف 'تواضع وانکسار' کا ہے، مفتی صاحبؒ اپنے عہد کے بڑے مصنفین اور اصحابِ قلم میں تھے، ملک و بیرون ملک ان کی تحریروں کو قبول عام حاصل ہوا، برصغیر کی سب سے بڑی درسگاہ میں منصب افتاء پر فائز تھے؛ لیکن کہیں سے کبر اور برتری کا احساس چھوکر بھی نہیں گیا تھا، بڑے ہوں، معاصر و ہم عمر ہوں، یا شاگرد اور خرد، ہر ایک کے ساتھ تواضع، جھکاؤ اور بچھاؤ کی کیفیت، چھوٹوں سے بھی ایسی بے تکلف گفتگو جیسے دوست کسی دوست سے کرتا ہے۔

تیسری چیز وقت کی حفاظت اور اپنے علمی مشاغل کا اہتمام ہے، مفتی صاحبؒ نے فتاویٰ نویسی، کتب خانہ کی ترتیب اور ترتیب فتاویٰ کے دشوار کام کے ساتھ ساتھ جس طرح اپنے تصنیفی شغل کو جاری رکھا، کتابیں اور مقالات لکھتے رہے اور علمی مجالس کو رونق بخشتے رہے، وہ ایک قابل تقلید عمل ہے، میں نے مفتی صاحب کو دیکھا ہے کہ سفر کی حالت میں ہیں، کہیں پلیٹ فارم پر رکنا پڑا، ٹرین آنے میں

دیر ہے تو بیگ سے کاغذ نکالا ، جیب سے قلم ، اور لکھنے میں مشغول ہوگئے ، اپنی جائے اقامت میں تو اور زیادہ اہتمام کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام سرانجام دیتے ، اسی لئے ان کے وقت اور قلم میں برکت تھی ۔

چوتھی قابل ذکر بات یہ ہے کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ علم وتحقیق کے کام اور لوح وقلم کی خدمت کے لئے ضروری ہے کہ بارونق شہر ہو، علمی چہل پہل ہو ، بڑا کتب خانہ ہو اور علمی ماحول ہو ؛ لیکن مفتی صاحبؒ نے سانحہ جیسے کوردہ دیہات اور ایک ابتدائی مدرسہ میں رہ کر بھی تصنیف وتالیف کا اچھا خاصا کام کیا اور وہیں اسلام کا نظام مساجد اور نظام عفت وعصمت مرتب فرمائی ، جس کی علامہ سید سلیمان ندویؒ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ جیسے اکابر علماء اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسے ادیب نے داد دی اور جسے ندوۃ المصنفین جیسے وقیع اور باوقار ادارہ نے شائع کیا ، اس میں نوجوان فضلاء کے لئے سبق ہے ، اگر انسان عزم محکم کا مالک ہو اور عمل پیہم کا خوگر ، تو وہ علم وتحقیق کے مراکز سے دور رہ کر بھی بہتر سے بہتر کام انجام دے سکتا ہے اور اگر بے توفیقی کسی پر سایہ فگن ہوجائے تو عین مراکز علم میں رہتے اور کتابوں سے بھری الماریوں کے درمیان بیٹھتے ہوئے بھی کوئی کام نہیں کرسکتا ۔

مفتی صاحب کی کتابیں تو یہ حقیر جامعہ رحمانی کی طالب علمی کے زمانہ میں ہی پڑھ چکا تھا ؛ لیکن ملاقات کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی جب دارالعلوم دیوبند میں حاضری ہوئی ، دارِ جدید کے احاطہ میں مدنی گیٹ سے بائیں جانب فوقانی منزل میں ان کی قیامگاہ تھی ، وہیں سامنے دوسری جانب استاذ گرامی حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ کی قیامگاہ تھی ، اکثر دونوں میں مہذب نوک جھوک بھی ہوتی رہتی تھی ، مولانا بہاری کی وفات کے بعد مفتی صاحب اسی کمرہ میں منتقل ہوگئے تھے ، پہلی ہی ملاقات میں مفتی صاحب کی سادگی اور خوش اخلاقی نے بے حد

متاثر کیا ، مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی سے اس حقیر کا گہرا دوستانہ تعلق تھا اور ان کا کمرہ پڑھے لکھے احباب کی آماجگاہ رہتا تھا ، اس نسبت سے مفتی صاحب کے کمرہ میں بھی کثرت سے آمد ورفت ہوتی رہتی تھی ، جب بھی کمرہ میں حاضری ہوتی ، ممکن نہ تھا کہ مفتی صاحب کچھ کھلائے پلائے بغیر واپس ہونے دیں ، مفتی صاحب کی مہمان نوازی کی وجہ سے ان کے کمرہ میں بے تکلف احباب کی نشست خوب جمتی تھی اور اڑوس پڑوس تک بھی قہقہوں کی گونج پہنچ جاتی تھی ، حکیم عزیز الرحمٰن صاحب مئویؒ اور مولانا ازہر شاہ قیصرؒ خاص ہم نشینوں میں تھے اور ہم عمر اور ہم مزاج ہونے کی وجہ سے باہم بڑے بے تکلف بھی تھے ۔

طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب سے جو ربط قائم ہوا ، وہ بڑھتا ہی گیا ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نشستوں میں ہمیشہ ملاقاتیں ہوا کرتیں ، جس کے رکن وہ اول دن سے تھے ، پھر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام کے بعد اس کے سیمیناروں میں بھی پابندی سے مفتی صاحبؒ تشریف لاتے ، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی وفات کے بعد جب آپ بہ اتفاق رائے اکیڈمی کے صدر منتخب ہوئے تو اکیڈمی کی وجہ سے ہر ماہ دو ماہ پر ملاقات کا سلسلہ رہتا تھا ، مفتی صاحبؒ اکیڈمی کی میٹنگوں میں ، سیمیناروں میں اور حسب ضرورت اکیڈمی کے دفتر میں تشریف لایا کرتے تھے ، کبھی مفتی صاحبؒ سے ملاقات کے لئے یا کسی انتظامی مشورہ کی غرض سے میں بھی دیوبند حاضر ہوتا رہتا تھا ۔

تقریباً آٹھ سال مفتی صاحبؒ کے زیر سرپرستی اکیڈمی کی خدمت کا موقع ملا ، لوگ اندیشہ میں مبتلا تھے کہ شاید قاضی صاحبؒ کے بعد اکیڈمی کا سفر جاری نہ رہ سکے ؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بانی اکیڈمی حضرت قاضی صاحبؒ کے اخلاص اور حضرت مفتی صاحبؒ کی دُعاؤں کی برکت ہے کہ اکیڈمی نے پوری آب وتاب کے ساتھ اپنا علمی سفر جاری رکھا اور اس کے کام میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی گئی ،

اللہ کرے کہ یہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے اور اُمت کے مسائل کو حل کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہے۔

اداروں اور تنظیموں میں اگر چھوٹوں کو اپنے بڑوں کا اعتماد حاصل ہو تو کام میں سہولت ہوتی ہے اور کھل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے، مفتی صاحبؒ کا اس حقیر کے ساتھ یہی معاملہ تھا، وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے تھے، بعض دفعہ میں ان کی طرف سے کوئی تحریر لکھتا اور وہ بغیر پڑھے دستخط کر دیتے، اکیڈمی کی مشاورتی نشستوں میں کہہ دیتے کہ ناظم صاحب جو طے کریں گے اس کے مطابق عمل ہوگا، ان کے اس اعتماد و اعتبار کی وجہ سے ہم خدام کو کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔

مفتی صاحبؒ مجھ سے ذاتی اور شخصی طور پر بے حد محبت و شفقت فرماتے تھے، اسی لیے نہ صرف اکیڈمی کے بارے میں خیر خواہانہ جذبات رکھتے تھے، جس کے ذمہ دار وہ خود تھے؛ بلکہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے بھی بڑا تعلق خاطر تھا، دوبار باوجود کمزوری اور پیرانہ سالی کے معہد تشریف لائے اور ایک بار جلسۂ سالانہ کی صدارت بھی فرمائی، دیوبند سے فارغ ہونے والے باصلاحیت طلبہ کو فراغت کے بعد معہد آنے کا مشورہ دیتے تھے، آخری ملاقات جب ان کے دولت خانہ پر ہوئی تو اس وقت وہ بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے؛ لیکن وہ اپنی محبت میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ مجھے معہد لے چلو، میں وہاں ٹھیک ہو جاؤں گا، مگر ان کی صحت اس لائق نہیں تھی کہ وہ کوئی مختصر سفر بھی کر سکیں، چہ جائیکہ اتنا لمبا سفر، کسے معلوم تھا کہ اب انھیں اس چھوٹے سے گاؤں سے سیدھے آخرت ہی کا سفر کرنا ہے؟

مفتی صاحبؒ کی اس حقیر پر جو بے پایاں شفقت تھی اور وہ اس عاجز کی نسبت سے جس محبت اور حسن ظن کا اظہار کرتے تھے، اس کا اندازہ ایک اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اس حقیر کی تالیف ''قاموس الفقہ'' کی تقریظ میں

تحریر فرمایا ہے :

اس وقت خاکسار کے سامنے ''قاموس الفقہ'' کی ایک جلد ہے، اسے پڑھ کر اور دیکھ کر حیرت ہے کہ شخص واحد نے اتنا اہم علمی کام تنہا کیسے انجام دیا، سینکڑوں کتابیں اس کے سامنے ہیں، ان کتابوں سے احکام و مسائل نکال کر ان پر بحث و تحقیق کر رہا ہے، کتبِ فقہ میں جتنے الفاظ آئے ہیں، اس نے ان سب کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا ہے، اور اس لفظ سے متعلق جس قدر بحثیں آئی ہیں، ان کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کر دیا ہے، اگر کہا جائے کہ ایک ایک لفظ پر ایک مستقل کتاب لکھ دی ہے، تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہوگا، بحث و تحقیق عالمانہ اور محققانہ ہے، کوئی ضروری گوشہ چھوٹنے نہیں پایا ہے، بہت سارے الفاظ پر مقالے لکھے گئے ہیں اور اتنے دل پذیر اور سلیقہ سے کہ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے جب تک ختم نہ کر دے.....۔

سچ پوچھئے تو یہ کتاب علم الفقہ کی جیتی جاگتی انسائیکلو پیڈیا ہے اور یقین ہے کہ یہ کتاب بہت ساری کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی اور پڑھنے والا اس ایک کتاب کو پڑھ کر سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز ہو جائے گا، انشاء اللہ.....۔

اس کتاب کے مرتب و مؤلف عزیز گرامی قدر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہ ہیں، جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بانی و استاذ ہیں، بہت سارے کاموں کے ساتھ یہ علمی کام وہ کرتے ہیں، ان کا علم مستحضر ہے، دماغ بیدار ہے،

ذہن ثاقب ہے ، جو کام حکومت وقت کے کرنے کا تھا اور جہاں بیسیوں اہل علم کے تعاون کی ضرورت تھی ، اسے اس اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نے تنہا خاموشی کے ساتھ انجام دیا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف عزیز کو ہر شر وفتنہ سے محفوظ رکھے ، ان کی اس خالص علمی خدمت کو قبول فرمائے اور ان کے لئے سرمایۂ عاقبت بنائے ،آمین ۔ (قاموس الفقہ : ۱۵۹/۱-۱۶۰)

وفات سے ایک دو سال پہلے اپنی کبرسنی اور معذوری کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کی خدمت سے باعزت طور پر سبکدوش ہوگئے اور صاحبزادہ کے اصرار پر اپنے گاؤں ہی میں مقیم ہوگئے ؛ چنانچہ کم وبیش دو سال کے عرصہ میں متعدد بار یہ حقیر بہار کے سفر کے دوران خدمت میں حاضر ہوا اور اسی محبت وشفقت اور مہمان نوازی کا لطف اُٹھایا جو مفتی صاحب کے مزاج کا حصہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء ، جمعرات کو ۳ بجے دن میں آخری سانس لی اور اپنے جان آفریں سے جاملے ، اگلے دن نماز جنازہ ہوئی اور صاحبِ نظر عالم ومصنف پروفیسر سعود عالم قاسمی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے نماز پڑھائی ، جو عرصہ تک ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہ چکے ہیں ، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے ، ان کی وفات پر ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بزرگ خاندان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہو، محبّ گرامی برادرم مولانا احمد سجاد صاحب کو فون کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ جس قدر تعزیت کا مستحق میں ہوں ، اسی قدر آپ بھی ہیں— اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اوران کی علمی اور دینی خدمات کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے ۔**اللھم اغفرلہ وارحمہ** ۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ

دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن

مولانا محمد اسلام قاسمی ☆

۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے، جامعہ رحمانی مونگیر میں لائبریری کی ایک عظیم الشان عمارت کی تکمیل ہوئی، جس کے افتتاح کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدرالمدرّسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو مدعو کیا گیا کہ انھیں دونوں بزرگوں کے ہاتھوں اس کا افتتاح عمل میں آئے گا، اس موقع پر امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمہ اللہ نے مفتی ظفیر الدینؒ صاحب کو بھی شرکت کی دعوت دی، حضرت مفتی صاحب کو خیال ہوا کہ اس مناسبت سے ایک مقالہ تحریر کرکے اجلاس میں پیش کردیا جائے، امیر شریعت نے اجازت دیدی، حضرت مفتی صاحبؒ نے ایک ہفتے میں کتب خانوں کی تاریخ اور افادیت واہمیت پر ایک پُرمغز مبسوط مقالہ تحریر کیا، جو انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے آئی ان معزز ترین شخصیات کے سامنے اجلاس میں پیش کیا، مقالہ نہایت پسند کیا گیا اور سراہا بھی گیا۔

اس مقالے کو اکابر دیوبند نے پسند کیا تو مقالہ نگار کی صلاحیت اور محنت کو بھی صلہ ملا، یہی مقالہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دیوبند سے وابستگی کا

☆ استاذ حدیث وصدر شعبۂ عربی ادب دارالعلوم (وقف) دیوبند

ذریعہ بن گیا، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بذاتِ خود خط لکھ کر دیوبند آنے اور دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تبلیغ میں تقرری کی صراحت فرمائی، اپنے اساتذہ اور مخلصین سے مشورے کے بعد مفتی صاحب دیوبند آ گئے اور مؤرخہ ۳؍صفر ۱۳۷۶ھ مطابق ۹؍ستمبر ۱۹۵۶ء کو مفوضہ ذمہ داری سنبھال لی۔

دیوبند میں پہلی حاضری تھی، انجان جگہ، غیر مانوس افراد اور اجنبی لوگ، دارالعلوم کے اندرونی احوال سے بے خبر، اس موقع پر بہار کے چند طلبہ اور خاص طور پر ضلع مونگیر کے لڑکوں نے ہر طرح خدمت کی، کھانے پینے، رہنے کی سہولتیں فراہم کردیں، اور جیسا کہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے سوانحی مکتوب ''زندگی کا علمی سفر'' میں تحریر کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے متعلق دو بھائیوں نے بڑی دلجوئی کی اور اچھا سلوک کیا، یہ تھے علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے صاحبزادگان مولانا ازہر شاہ قیصرؒ مدیر اعلیٰ رسالہ دارالعلوم، اور مولانا انظر شاہؒ مدرّس دارالعلوم دیوبند۔

دارالعلوم میں تقرر تو ہوا تھا شعبۂ تبلیغ میں، مفوضہ ذمہ داریوں میں تقریر و تحریر شامل تھی، مگر سب سے پہلے حضرت مہتمم صاحب نے ان کو ایک کتاب لکھنے پر مامور کردیا، کتاب مکمل ہوگئی اور طبع بھی ہوگئی، دارالعلوم دیوبند میں ان سے اصل کام تحریر کی صلاحیت اور افتاء سے دلچسپی کی بنا پر ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کو مرتب کرانا تھا، چنانچہ ان کو شعبۂ دارالافتاء میں آزادانہ چارج دے کر ترتیب فتاویٰ کیلئے منتقل کردیا۔ اور ان کی یہی خدمت دراصل ان کی شناخت ہوگئی، ''مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے ہی ان کی پہچان بن گئی۔ ترتیب فتاویٰ کے ساتھ فتویٰ نویسی کی اضافی ذمہ داری بھی ان سے متعلق رہی، تقریباً چار سالوں میں اوّلین مفتی دارالعلوم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن کے فتاویٰ کی ترتیب مکمل ہوگئی، جو بارہ جلدوں پر مشتمل تھی، ابھی طباعت کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حضرت مفتی صاحب کو جو پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا تھا وہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کے کتب خانے کی افتتاحی تقریب تھی، مفتی صاحب نے کتب خانے کی تاریخ وافادیت پر جس انداز میں روشنی ڈالی تھی ظاہر ہے کہ اس کا تأثر حضرت مہتمم صاحب پر ضرور رہا ہوگا، چناں چہ دارالعلوم دیوبند کی لائبریری کی بے ترتیبی کی شکایات پر اس کی ترتیب و انتظام کیلئے ان کی نظر میں مفتی صاحب مرحوم سے بہتر موزوں شخصیت اور کون سی ہوسکتی تھی، چنانچہ ترتیب فتاویٰ کے ساتھ ہی ان کو لائبریری میں مرتب کی حیثیت سے مامور کردیا گیا، اب ان کی نشست دارالافتاء کی بجائے کتب خانہ میں ہوگئی اور ناظم کی حیثیت سے، جہاں انھوں نے دارالعلوم کی لائبریری کو اس کی عظمت کے شایانِ شان کردیا، ان کی جدوجہد، علمی صلاحیت اور صبر واستقامت نے دارالعلوم کے کتب خانہ کو عصر حاضر کی لائبریریوں کے مماثل بنادیا، اس کے لیے ملک کے مشہور کتب خانوں آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، رام پور، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور خدابخش لائبریری کے نظم ونسق اور ترتیب کا قریب سے جائزلیا، معلومات حاصل کیں، اور لائبریری کی مخطوطات کی فہرست کو دو ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے شائع بھی کرایا۔

اور چونکہ ان کو مقالہ نگاری اور تالیف سے شغف تھا اور ان کی تحریر بھی پختہ تھی، اس لیے دارالعلوم کی انتظامیہ نے وہاں سے نکلنے والے رسالے ''ماہنامہ دارالعلوم'' کی ادارت سے وابستہ کردیا، رسالے میں مضامین کے علاوہ پابندی سے اداریہ لکھنے کی ذمہ داری بھی سپرد ہوگئی، اس طرح وہ مکمل ۱۷؍سال تک دارالعلوم رسالہ کا اداریہ لکھتے رہے۔

اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند منعقدہ مارچ ۱۹۸۰ء کے موقع پر ایک علمی نمائش بھی طے پائی تھی جس میں مختصر تحریروں اور چارٹوں کی مدد سے دارالعلوم

کی خدمات اور شخصیات کو اجاگر کیا گیا تھا، اس کی تحریر کی ذمہ داری بھی حضرت مفتی ظفیر الدینؒ سے متعلق تھی، سیکڑوں کی تعداد میں چارٹ بنے، مزید یہ کہ اس موقع پر کچھ مختصر کتابیں بھی تحریر کرکے شائع کی گئیں جن میں مفتی صاحب کی تحریر کردہ کتابیں بھی تھیں، اجلاس کے بعد مزید علمی کام کی توقعات تھیں، مگر اس عظیم الشان اجلاس صدسالہ کے جو اندوہناک واقعات پیش آئے وہ بھی ''عظیم'' تھے۔

مارچ ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم دیوبند میں انتظامی انقلاب آیا، تو حضرت مفتی صاحبؒ دارالعلوم ہی سے وابستہ رہے، البتہ ۱۹۸۳ء میں ان کو دارالافتاء میں بحیثیت مفتی معین کردیا گیا جو ۲۰۰۸ء تک جاری رہا۔ اخیر عمر میں قویٰ مضمحل ہوگئے مگر ذہن اور قلم بدستور بیدار رہے، وفات سے چند سال پہلے ہی سے ان کے بڑے صاحبزادے مولانا احمد سجاد قاسمی اور بعض مخلصین کا اصرار بڑھا کہ وہ دارالعلوم سے سبکدوش ہو کر وطن تشریف لے آئیں، چنانچہ انہوں نے اعزازی طور پر ۲۰۰۸ء میں سبکدوشی حاصل کی اور وطن (پورہ نوڈیہا، ضلع دربھنگہ بہار) چلے گئے، جہاں کمزوری اور علالت بھی طاری رہی، بالآخر ۳۱/مارچ ۲۰۱۱ء میں وفات پائی، اور وہیں مدفون ہوئے، نماز جنازہ میں مخلصین ومعتقدین کی بہت بڑی تعداد تھی، نماز جنازہ جناب پروفیسر سعود عالم قاسمی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے پڑھائی۔

ذاتی مشاہدات

۱۹۶۸ء میں راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں متوسطات عربی کی جماعت میں داخل ہوا، کچھ ماہ گذرے تو اندرونِ دارالعلوم طلبہ کی تعلیمی وثقافتی سرگرمیوں سے واقفیت ہوئی، معلوم ہوا کہ طلبۂ بہار کی ایک مشترکہ انجمن ''سجاد لائبریری'' کے نام سے موجود ہے جس کے تحت ایک قلمی رسالہ ''البیان'' شائع ہوتا ہے، اور یہ کہ اس انجمن کے سرپرست حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ ہیں، اور اس

کے نگراں جناب مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ، دونوں حضرات صوبۂ بہار کے رہنے والے دارالعلوم سے وابستہ قدیم شخصیات ہیں۔ اس طرح حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کے نام اور شخصیت سے آشنا ہوا۔

۱۹۷۰ء میں جامع العلوم حضرت مولانا بہاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہدایہ اخیرین کا سبق متعلق ہوا، اس لیے بعض دفعہ ان کی رہائش گاہ میں جانے کی سعادت حاصل ہوئی، ان کے کمرے سے قریب ہی حضرت مفتی صاحبؒ کی قیامگاہ تھی، مدرسہ کے اوقات کے علاوہ دونوں حضرات یکجا بیٹھا کرتے تھے، وہیں مولانا بہاری نے حضرت مفتی صاحبؒ سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ بھی بہاری طالب علم ہے، مزید کچھ حوصلہ افزا جملے بھی ناچیز کے بارے میں فرمائے، مفتی صاحب سے باضابطہ یہ پہلی ملاقات تھی، اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، کبھی سجاد لائبریری کی میٹنگ میں، کبھی مولانا بہاریؒ کے ساتھ، رسالہ دارالعلوم کے واسطے اور مفتی صاحبؒ کی طبع شدہ کتابوں کے حوالے سے، ہمیں اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت میدانِ تحریر کے ماہرین شہسواروں میں سے ہیں، اسی مناسبت سے ان سے علمی عقیدت بڑھی، مگر چونکہ وہ ہمارے استاذ نہیں تھے، اس لیے ایک بزرگ کی طرح ادب واحترام تھا، استاذ والی عقیدت یا مرعوبیت نہیں تھی، دراصل ان کی ظاہری زندگی اتنی سادہ اور تصنعات سے بری تھی کہ ظاہری رعب اور شان وشوکت کا احساس ہی نہیں تھا اور طالب علمی کی زندگی لاپرواہ ہوتی ہے اس لیے ان کی علمی عظمت اور تحریری صلاحیت کے ہم شایانِ شان قدردانی بھی نہیں کرسکے۔

البتہ ۱۹۷۵ء میں جب ان سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا تو احترام و عقیدت میں بیحد اضافہ ہوا، اس سال میرا داخلہ شعبۂ دارالافتاء میں تھا، دراصل اس سال میں ''سجاد لائبریری'' کا صدر منتخب ہوا اور ناظم اعلیٰ بنے حضرت مفتی صاحبؒ کے بڑے صاحبزادے مولوی احمد سجاد دربھنگوی، اب ہم دونوں لائبریری اور انجمن

یا طلبۂ بہار کے کسی مسئلے سے دوچار ہوتے یا کوئی مشورہ درکار ہوتا تو مفتی صاحب سے ہی رجوع کرتے، اس طرح ان کے کمرے پر جانے کا اتفاق زیادہ ہی ہوتا، اور ان سے ہی مشورے کرتے، اس طرح ان سے قرب اور تعلق بڑھا، ان کی قیامگاہ عام طالب علموں کے حجروں کی ہی طرح تھی، کوئی کرّ وفر نہیں، کوئی تام جھام نہیں، جیسی ان کی شخصیت سادگی اور تواضع کا نمونہ اسی طرح ان کی رہائش بھی اور طعام و قیام بھی، ایک عام سی دری ہوتی، وہ اس میں بیٹھ کر لکھنے میں مشغول رہا کرتے، مضامین یا کتابوں کی تصنیف کیلئے کوئی ضخیم رجسٹر، فائل یا خوشنما کاپی وغیرہ کا کوئی تکلف نہیں، ''درمختار'' کی شرح لکھتے ہوئے تو اس حال میں دیکھا کہ ایک صفحہ موجود ہے اسی میں لکھ دیا، یا کاغذ کا چھوٹا ٹکڑا ہو اسی میں تحریر کر کے ناشر یا کاتب کے حوالے کر دیا۔

۱۹۷۶ء میں راقم الحروف دارالعلوم دیوبند کی ملازمت سے وابستہ ہوگیا، دارالعلوم سے عربی سہ ماہی رسالہ ''دعوۃ الحق'' شائع ہوا کرتا تھا، جو چند سال پہلے موقوف ہوگیا تھا، تو انتظامیہ نے نیا عربی رسالہ جاری کرنے کا ارادہ کیا، حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ (شیخ الادب) اس کے ذمہ دار اعلیٰ بنائے گئے، انھوں نے اپنے لیے دو معاونین کا مطالبہ کیا، دوسرے معاون کے طور پر میرا انتخاب ہوا اور پندرہ روزہ عربی اخبار ''الداعی'' کی ابتدا ہوگئی، ابتدا میں مدیر اعلیٰ مولانا کیرانوی ہی رہے، مختصر عرصے کے بعد ہی اہتمام نے ادارت کیلئے ایک تین نفری نگراں کمیٹی بنا دی اور مدیر اعلیٰ رفیق محترم مولانا بدرالحسن قاسمی (دربھنگوی) کو مقرر کر دیا گیا، اس کمیٹی میں تین افراد اس طرح تھے۔

۱-مولانا وحیدالزماں کیرانویؒ، ۲-مولانا محمد سالم قاسمی، ۳-مفتی ظفیر الدین مفتاحی

حضرت مفتی صاحب کی ایک عربی رسالے میں شمولیت غالباً اس لئے تھی

کہ انھیں صحافت کا بھی تجربہ تھا اور اردو کے مایۂ ناز قلمکار تھے، اس لئے اخباری مضامین اور خبروں میں پالیسی طے کرنے میں ان کا طویل تجربہ کام آتا۔

اگرچہ یہ کمیٹی عملی طور پر زیادہ طویل عرصے تک کارگر نہیں رہ سکی، مگر حضرت مفتی صاحبؒ سے ربط میں اضافہ ضرور ہوگیا، بسا اوقات اس سے ہٹ کر اندرون دارالعلوم کی سیاست اور اپنے تحفظ کے بارے میں مفتی صاحب ہمیشہ مفید اور تجربے کی بنیاد پر اہم مشورے دیتے، جو بلاشبہ میرے لئے فیض اور استفادے کی ہی ایک کڑی ثابت ہوئی۔ اس دوران کبھی دفتر الداعی میں اور کبھی حضرت مولانا بہاری رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے کے پاس نشست ہوتی جس میں مولانا بہاری، مفتی صاحب، حکیم عزیز الرحمٰن اعظمی اور مولانا بدرالحسن کے ساتھ راقم الحروف بھی شریک ہوتا۔

عربی زبان و ادب سے میرا طالب علمانہ تعلق تو تھا، مضامین لکھنے، ترجمہ کرنے یا خبریں بنانے کی مشق تھی ہی، حضرت مفتی صاحب فرماتے کہ اردو میں بھی لکھا کرو، دراصل ''البیان'' کے اداریے میں تحریر کرتا تھا، اور ۱۹۷۵ء ہی میں لاہور (پاکستان) سے دارالعلوم دیوبند کی خدمات پر مشتمل ایک یادگار ضخیم نمبر شائع ہوا تھا جس میں احقر نے ایک مضمون ''دارالعلوم دیوبند اور خدمت افتاء'' کے عنوان سے لکھا تھا جو شامل نمبر تھا، اس لیے حضرت مفتی صاحب کا اصرار تھا کہ اردو مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کی راہ بھی اختیار کرو، اسی کا نتیجہ تھا کہ ہم چند طلبہ نے اسی مقصد کے پیش نظر ایک انجمن ''جمعیۃ الثقافۃ القاسمیۃ'' کے نام سے قائم کی، اس کا مقصد ہی انشاء پردازی اور صحافت کی تمرین تھی، اس کے رہنما جناب مولانا ازہر شاہ قیصر اور مفتی صاحب مرحوم تھے، ان کی رہنمائی اور ہدایات کے مطابق ہی اس کے اراکین کا انتخاب اور احاطۂ دارالعلوم دیوبند میں پہلی بار ایک ''سمپوزیم'' کا انعقاد عمل میں آیا تھا جو ایک تاریخی اور یادگار تحریک کی صورت میں سامنے آیا۔

حضرت مفتی صاحب سے ربط وضبط قائم رہا، ان کی زندگی، تجربہ اور تحریر ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے رہے، اجلاس صد سالہ دارالعلوم کے موقع پر حضرت مفتی صاحب کی تحریر کردہ کتابیں اور ان کے مضامین کی طباعت واشاعت کی ذمہ داری راقم کو نبھانے کا موقع ملا، ان کی شفقت، رہنمائی ہمیشہ حاصل رہی، تا آنکہ اجلاس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے احاطے میں بیرونی اور اندرونی سازشوں کی وجہ سے جو خلفشار رہا اس سے متأثر مولانا بہاری اور مفتی ظفیر الدین، مولانا بدرالحسن اور راقم زیادہ ہوئے، بنیادی طور پر ہم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ مہتمم دارالعلوم اور ان کی انتظامیہ کے ساتھ رہے، پھر جب دارالعلوم دیوبند میں ہنگامے کی وجہ سے تعطل رہا اور اسی دوران ۲۲ / ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو رات کے وقت دوسرے گروپ کا قبضہ ہوگیا تو ''انقلابی تحریک'' کے انتقام کے شکار وہی افراد یا دفاتر ہوئے جو ان ہنگامہ پروروں کے ساتھ نہیں تھے یا غیر جانبدار تھے، جس میں ''دفتر الداعی'' سرفہرست تھا، جس کے ناظم مولانا بدرالحسن قاسمی تھے اور ان کا معاون یہ راقم السطور تھا، تمام اشیاء لٹ گئیں، میرا ایک ترجمہ کردہ کتاب کا مسودہ بھی اس میں شامل تھا اور دوسرے مسودات وغیرہ، لیکن سب سے زیادہ نقصان حضرت مفتی ظفیر الدین مرحوم کا تھا، جن کا کمرہ خاص نشانہ بنا، ساری اشیاء، نقد رقم، زیورات، استعمال کی اشیاء کسی ''مالِ غنیمت'' کی طرح غنیم طبقے نے لوٹ لیں، لیکن اہم چیز جو ضائع ہوئی وہ حضرت مفتی صاحب کی غیر مطبوعہ کتابوں کی مسودات کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جس کا غم اور افسوس مفتی صاحب کو بے انتہا رہا اور اس کے بعد پچیس سالوں تک اس کا اظہار کرتے رہے۔

انقلاب کے بعد ہماری یہ مجلس ختم ہوگئی، مولانا بدرالحسن کویت چلے گئے، میں دیوبند میں رہتے ہوئے دارالعلوم وقف سے وابستہ رہا، حضرت مولانا بہاری، حضرت مفتی صاحب اور فضلو بھائی (مولانا فضل الرحمٰن کاتب) مقبوضہ دارالعلوم ہی

میں برقرار رہے۔ ہم نئی انتظامیہ کو قبول نہیں کرسکے اس لئے علیحدہ ہوگئے، اب حضرت الاستاذ مولانا بہاری اور مفتی صاحب سے ملاقات میں کمی آگئی، حضرت مفتی صاحب کی عنایت وشفقت رہی کہ وہ احقر کے غریب خانے پر بھی کبھی کبھار تشریف لاتے رہے۔ احاطہ دارالعلوم سے باہر راہ چلتے یا کسی مجلس یا تقریب میں ملاقات ضرورت ہوتی۔ احوال دریافت کرتے، کبھی مشورے بھی دیتے، یا پھر امارتِ شرعیہ پٹنہ کی مجلس شوریٰ میں ملاقات کا موقع ملتا۔ دارالعلوم سے رخصت ہونے کے بعد ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا، البتہ برادرم احمد سجاد قاسمی سے فون پر حضرت مفتی صاحبؒ کی مزاج پُرسی ضرور کرتا، آخری ایام میں مطالعہ جاری رہا مگر لکھنے کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

اور اخیر میں یہ ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند اور اپنی مفوضہ ذمہ داری سے جو تعلق تھا اس میں کبھی کمی یا کوتاہی نہیں ہوئی، مگر اس کے ساتھ ہی ان کو امارتِ شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ سے، اس کی خدمات سے اور اس کے اکابر سے قلبی ربط بھی رہا، خاص طور پر امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہٗ اور ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم سے، چنانچہ حسب ہدایت امیر شریعت انھوں نے امارت کیلئے مضامین اور کتابیں بھی لکھیں، اس طرح انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور امارتِ شرعیہ کیلئے اپنی علمی یادگاریں بھی چھوڑیں۔ **تغمده الله بغفرانه**

●●●

ابا جان- دارالعلوم دیوبند سے خدا کے حضور تک

ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی☆

والد محترم حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی علیہ الرحمہ نے تقریباً بیس سال کی عمر میں ۱۹۴۳ء میں روایتی یا نصابی تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد گیارہ سالوں تک مئو، نگرام، ڈھابیل اور سانحہ مونگیر میں ملازمت کی، جس میں مدرسہ معینیہ سانحہ کی مدت ملازمت آٹھ سال ہے۔ آپ نے سانحہ کے مدرسہ پر کافی توجہ وتوانائی صرف کی اس کی وسیع عمارت بنوائی، شرح وقایہ اور مشکوٰۃ تک تعلیمی معیار کو بڑھایا مدرسہ میں تیس بیگھہ زمین وقف کرائی، سانحہ میں اس مختصر عرصہ میں طلبہ کی اچھی خاصی جماعت تیار کردی اور مختلف بڑے مدارس میں انھیں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخل کرایا۔ ابا کے شاگردوں میں بہت سارے اچھے عالم دین ہوئے جن میں مولانا انعام الحق قاسمیؒ، مولانا محمد حسن صاحب، مولانا محمد حسین صاحب، مولانا محی الدین طلب صاحب۔ مولانا محمد رفیع صاحب، مولانا غیاث الغنی صاحب، مولانا نظام الدین صاحب، مولانا اصلاح الدین صاحب، مولانا محمد اسلم صاحبؒ اور راقم کے استاذ جناب ماسٹر محمد انصار صاحب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بہت سارے شاگردوں نے کالج اور یونیورسٹیوں کا رخ کیا اور مختلف ملازمتوں میں رہے، مدرسہ کے ذریعہ وہاں تعلیمی انقلاب پیدا ہو چکا تھا اسی کا نتیجہ ہے کہ آج سانحہ علم کے معاملہ میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔

☆ سندر پور ہائی اسکول، بیلا، دربھنگہ (بہار)

ملازمت کے ساتھ ساتھ آپ کا تحریری اور تصنیفی کام بھی عروج پر تھا۔ ان گیارہ سالوں میں اسلام کا نظام مساجد، اسوۂ حسنہ اور نظام عفت وعصمت جیسی اہم تصانیف مکمل ہوچکی تھیں، پچاسوں مقالات ماہنامہ برہان دہلی، ماہنامہ نئی زندگی الہ آباد، ہفت روزہ صدق جدید لکھنو، الجمعیۃ دہلی، الہلال پٹنہ، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ تبیان داد والی کراچی پاکستان میں شائع ہو چکے تھے، گیارہ سالوں بعد آپ کی تحریر کی صفائی، شستگی، جامعیت، اس میں علمی گہرائی، گیرائی اور عالمانہ ومحققانہ ذوق کی روز افزوں ترقی نے جو اپنے اساتذہ اور اکابر سے مسلسل ربط کا نتیجہ تھا آپ کو بہت ہی عزت و وقار اور احترام و اکرام کے ساتھ دارالعلوم دیوبند تک پہونچایا۔

دارالعلوم میں کل عرصہ خدمات ہجری سن کے اعتبار سے ترپین سال چھ ماہ ۱۷ دن ہے اور عیسوی سن کے حساب سے مدت خدمت اکاون سال ۱۲ دن ہے۔ ان اکاون سالوں میں شروع کے ساڑھے چوبیس سال ایسے ہیں جن میں عزم، حوصلہ، امنگ اور قوت وتوانائی کی وجہ سے کافی متنوع اور وسیع خدمات ہیں، سب سے اہم کام فتاویٰ دارالعلوم کی بارہ جلدوں کی ترتیب ہے، جس کے بارے میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہ نے راقم کی موجودگی میں خانقاہ رحمانی کی ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ ترتیب فتاوی کے علاوہ اگر مفتی ظفیر الدین صاحب کوئی بھی علمی کام نہیں کرتے تب بھی ان کے علمی مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آتی۔

دوسرا سب سے بڑا کام تقریباً سوسال سے غیر مرتب لاکھوں کتابوں (جن میں قلمی کتب اور جرائد ورسائل بھی شامل ہیں) پر مشتمل کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب وتزئین کا ہے جو بہت ہی پیچیدہ اور وقت طلب تھا اسی عرصہ میں انجام پایا، دوضخیم جلدوں میں مخطوطات کا تعارف بھی اس عرصہ کا اہم کارنامہ ہے،

سترہ سالوں تک ہر ماہ رسالہ دارالعلوم کا اداریہ لکھنا بھی اسی عرصہ سے تعلق رکھتا ہے، اس عرصہ میں کچھ سالوں تک استفتاء کے جوابات بھی لکھے، درس قرآن مکمل جو تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے اسی زمانہ کا شاہکار ہے، جماعت اسلامی کے دینی رجحانات، مشاہیر علمائے دیوبند، دارالعلوم قیام، پس منظر، دارالعلوم ایک عظیم مکتب فکر، نظام تربیت، نظام تعمیر سیرت، نظام امن، حکیم الاسلام اور ان کی مجالس، جرم وسزا، اسلامی حکومت کے نقش ونگار، امارت شرعیہ کتاب وسنت کی روشنی میں، امارت شرعیہ دینی جدو جہد کا روشن باب، تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی، تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگری، ایک مثالی شخصیت، نظام حیات، شعبہ مطالعہ علوم قرآنی کی نگرانی، طلبہ کے لیے رہنما خطوط کی تعیین، ہدایت اور مشورے ناقابل فراموش کارنامے ہیں۔

دارالعلوم کی زندگی کا دوسرا دور یا نصف آخر اپریل ۱۹۸۲ء سے شروع ہوکر ۲۱ر ستمبر ۲۰۰۸ء تک ساڑھے چھبیس سالوں پر مشتمل ہے۔

مسودات لٹنے کا غم

دارالعلوم کے ہنگامہ اور تبدیلی اہتمام ۱۹۸۲ء نے ابا کے ذہن ودماغ کو ہلاکر رکھ دیا، اس میں پورا کمرہ لٹ گیا، تمام سامان ضائع ہوگئے، بیش قیمتی کتابوں اور علمی جرائد ورسائل کا اچھا خاصہ ذخیرہ تھا سب ختم ہوگیا، خون جگر پی کر انھوں نے چند اہم کتابیں تصنیف کی تھیں جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھیں وہ سارے نادر علمی مسودے لٹ گئے، اپنے اساتذہ کرام اور اکابر علما کے بہت سارے خطوط ان کی عطا کردہ مخصوص سندیں جنھیں حرز جان بنائے رہتے تھے کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا، بقیہ دوسرے اسباب رہائش چارپائی، چوکی، بستر، لحاف، توشک، کچھ نئے کمبل پنکھے، کچھ نقد روپے میری اماں کی سونے کی بالیاں سب لے گئے۔

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

دارالعلوم میں انقلاب آئے گا کسی حد تک ابا جان کو اس پر یقین تھا مگر ان کے ساتھ یہ ظلم ہوگا اس کا وہم وگمان بھی انھیں نہیں تھا، ان دنوں ابا گھر تھے، ۱۰ر اپریل ۱۹۸۲ء کا ٹکٹ دیوبند کا بنا ہوا تھا، مولانا فضل احمد قاسمی اور ان کے والد محترم جناب مولوی حاجی وصی احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کٹکی بازار دربھنگہ اور کچھ دیگر مخلصین کے مشوروں اور میری ضد کی وجہ سے ٹکٹ واپس کیا گیا۔ ابا جان سے میں نے عرض کیا کچھ دنوں میں دارالعلوم کے مفصل حالات میں آپ کو بتاؤں گا اس کے بعد وہاں جانے کا آپ فیصلہ کیجیے گا۔

میں راج دھنوار گریڈیہ ہائی اسکول میں ملازم تھا چلا گیا، دارالعلوم کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے کچھ دنوں بعد میں دیوبند چل پڑا، رات میں دارالعلوم پہونچا، بتایا گیا کہ کل پرسوں ہی حضرت مفتی صاحب تشریف لا چکے ہیں، میں حیرت میں رہ گیا، ابا جان کی بے چینی و بے قراری فطری تھی، ان کے کمرے میں پہونچا نظارہ دیکھ کر دل پھٹ گیا، کمرے میں جابجا راکھوں کے اونچے اونچے ڈھیر کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا کمرہ تمام الماریاں چوپٹ کھلی ہوئیں، کسی کے قبضے اکھڑے ہوئے کسی میں کواڑ کا پلہ ندارد، سبھی الماریاں بالکل خالی، بجلی کے تار، بورڈ سبھی اکھڑے ہوئے، راکھوں کے ڈھیر میں ایک کنارے کسی طالب علم کی نوازئی ہوئی ایک چارپائی پر معمولی سا بستر شامِ غریباں کا نقشہ پیش کررہی تھی، میں ہفتہ دس دن وہاں رکا، ضروریات کے چھوٹے موٹے اسباب خریدے گئے، جہاں جہاں ابا کی کتابوں یا سامانوں کا پتہ چلتا جمعیۃ الطلبا کے نمائندوں سے ملکر اسے برآمد کیا جاتا، اس طرح کچھ مطبوعہ کتابیں مل پائیں اور کچھ سامان بھی دستیاب ہوئے، کچھ دنوں تک دارالعلوم میں میرے ٹھہرنے کی وجہ سے ابا کا ذہن اس

صدمے سے کچھ ہلکا ہوا، یہ سوچتے ہوئے کہ ع گفتہ گر شد زکفم شکر کہ ناگفتہ بجاست۔ اپنے کاموں میں منہمک ہوگئے۔

۱۹۸۳ء میں جبری رخصت

ڈیڑھ سال ہی گذر پایا تھا کہ ایک اور اذیت ناک مرحلے سے دوچار ہونا پڑا، ۱۸؍دسمبر ۱۹۸۳ء کو دارالعلوم میں کوئی حادثہ پیش آیا ۲۲؍دسمبر کو ابّا کو حکم ملا آپ ایک ماہ کے لیے دارالعلوم اور دیوبند سے باہر رہیں، اس جبری رخصت میں حضرت الاستاذ علامہ محمد حسین بہاری نوراللہ مرقدہ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن دامت برکاتہم بھی شریک تھے، ایک ماہ کے بجائے چالیس دنوں بعد ابّا دارالعلوم میں حاضر ہوئے، تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش ہوکر ناکردہ گناہوں کی صفائی دینی پڑی پھر حسب دستور اپنے فرائض کی ادائیگی میں منہمک ہوگئے۔

مئی ۱۹۸۲ء میں جب میں دارالعلوم سے واپس آیا تو دل میں فیصلہ کرچکا تھا کہ اب ابا کو دارالعلوم سے واپس لانے کی کوشش کرنی چاہیے، اخیر مئی میں گرمی کی رخصت ہوئی، تو سیدھے حضرت امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہ کی خدمت میں مونگیر پہونچا، حضرت نے خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد قرآن شریف کی یہ آیت پڑھی: **ان الملوک اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة**۔ اور فرمایا مولوی سجاد! میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مفتی صاحب اب دارالعلوم چھوڑ دیں اور یہاں جامعہ رحمانی مونگیر یا امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، جہاں ان کا جی چاہے رہیں، یہ ان کے اپنے ادارے ہیں عزت و وقار سے رہیں گے، میں نے عرض کیا حضرت میری حاضری کا مقصد بھی یہی تھا، آپ خود سے انھیں بلالیں، حضرت نے فرمایا میں کہہ چکا ہوں اور پھر ضرور لکھوں گا تم انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کرو۔

مونگیر کے بعد پھر میں آپ کے استاذ محترم محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی قدس سرہ کی خدمت میں مئو گیا، تفصیلی طور سے میری اور گھر کی خبر خیریت معلوم کرنے کے بعد آپ نے ابا جان کے حالات معلوم کیے، فرمایا اہل علم کے لیے یکسو رہ کر دارالعلوم میں کام کرنا ممکن نہیں ہے ابا سے کہو یہاں مرقاۃ العلوم میں آکر رہیں یہ ان کا اپنا ادارہ ہے، اپنا گھر ہے ان کے آنے سے مجھے بھی تقویت ملے گی، میں تو شوخ تھا ہی فوراً عرض کیا، حضرت ایک پوسٹ کارڈ آپ ابا کو لکھ دیں جواب میں ابا جان خود سامان کے ساتھ آجائیں گے، ہنستے ہوئے فرمایا یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن وہ حکم ہوجائے گا، میں چاہتا ہوں کہ ان کی رائے اور رضا کو بھی دخل ہو اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں انھیں آمادہ کرلو اگر وہ آمادہ ہوگئے تو میں انھیں بلالوں گا، عید میں جب ابا گھر تشریف لائے تو میں نے انھیں دونوں بزرگوں کی رائے سے مطلع کیا، فرمایا تم ٹھیک سمجھتے ہو، میرے استاذ محترم اور حضرت امیر شریعت کا جو حکم ہوگا، بجالاؤں گا، لیکن میں خود سے دارالعلوم چھوڑ دوں یہ میرے لیے ممکن نہیں میرے شیخ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے خود مجھے دارالعلوم کی خدمت کے لیے بلایا تھا، یہ میرے لیے بڑا اعزاز ہے، میں خود سے چلا آؤں یہ حکم عدولی ہوگی اور میرے لیے تکلیف دہ ہوگا، موجودہ پریشانیاں اہمیت نہیں رکھتیں۔

۱۹۸۷ء کا مرض

مجموعہ قوانین اسلامی کی تدوین کے سلسلے میں حضرت امیر شریعت کے حکم پر جب دوبارہ ۱۹۸۷ء میں آپ مونگیر تشریف لے گئے تو کچھ دنوں بعد وہاں آپ کو کھانسی نے پریشان کیا، انگریزی دوائیں راس نہیں آئیں، بلغم خشک ہوگیا، تکلیف بہت بڑھ گئی، حضرت امیر شریعت قدس سرہ سے اجازت لے کر دیوبند

واپس گئے راستہ میں دہلی میں قیام کیا، مدرسہ رحیمیہ میں آپ کا قیام ہوا کرتا تھا، ہوا۔ وہاں حکیم گاندھی سے آپ کا علاج ہوا۔ دیوبند جاکر میرے استاذ محترم جناب حکیم انیس الرحمٰن سے مستقل علاج کرایا بہت افاقہ ہوا پھر اخیر شعبان میں گھر آئے پہلے پٹنہ رکے، موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا نظام الدین صاحب دامت برکاتہم نے حکیم فضل الرحمٰن صاحب سے تشخیص کراکے دوائیں تجویز کرائیں، گھر آکر انھیں کی دوائیں پابندی سے استعمال کیں اس سے مرض دور ہوا۔

۱۹۹۶ء میں پیروں کا درد

جنوری ۱۹۹۶ء میں ابا کے پیروں میں درد شروع ہوگیا، کھڑے ہوکر نماز پڑھنا ممکن نہیں رہا، تکلیف میں کمی ضروری ہوئی مگر ختم نہیں ہوئی، محترم جناب اسحٰق بابو رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے اور برادر محترم جناب محمد شبیر صاحب مدظلہ محلّہ بیتا دربھنگہ کے برادر خورد جناب ڈاکٹر سجاد صاحب ایم بی بی ایس جو ہڈیوں کے اسپشلسٹ ہیں (اس گھرانے سے ہمیشہ ابا کے قلبی تعلقات رہے) ان سے برابر مشورہ ہوتا رہا، مرض پر کچھ قابو ہوا تو ایک دن انھوں نے فرمایا، سجاد بھائی ایلو پیتھک علاج سے اس مرض میں افاقہ تو ہوسکتا ہے مرض ختم نہیں ہوتا، میری ذاتی رائے ہے کہ اب کسی اچھے ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے ابا کا علاج شروع کرایا جائے، یہاں ہیمیو پیتھ کے ڈاکٹر سے دکھایا گیا مگر مستقل علاج دیوبند کے ایک غیر مسلم ڈاکٹر کا ہوا، ماشاء اللہ وقت لگا مگر اس سے مرض بالکل ختم ہوگیا۔

میری والدہ محترمہ کی وفات

ابا کا علاج چل رہا تھا، وہ گھر ہی تھے کہ ۲۳/ مارچ ۱۹۹۶ء کو میری والدہ محترمہ نے سفر آخرت اختیار کیا، آپ بہت دنوں سے تنفس کے مرض میں مبتلا تھیں،

ڈاکٹر اختر انصاری صاحب دربھنگہ کے بہت بڑے اور اچھے ڈاکٹر تھے، ہمیشہ انھیں کے زیر علاج رہیں، اپنی نواسی (میری بڑی ہمشیرہ حسنیٰ صدیقہ کی صاحبزادی) کی شادی کی تاریخ اپنے پوتے محمد رضوان (مولانا محمد حماد قاسمی کے صاحبزادے) سے انھوں نے ۲۳/ مارچ ۱۹۹۶ء طے کرائی تھی، شادی سے تین دن پہلے جب گھر میں سفیدی ہورہی تھی میں نے اماں سے کہا تھا آپ آج سے میرے کمرے میں رہیں آپ کے کمرے میں آپ کی نواسی رہے گی، تو ہنس کے فرمایا چلو تین دن اس مکان میں بھی رہ لیں گے، مجھے کھٹکا لگا عورتوں نے بار بار پوچھا اماں تین ہی دن کیوں؟ لیکن وہ ٹال گئیں، میں نے بھی زیادہ کریدا نہیں، البتہ شادی سے پہلے کے دنوں میں (۲۱/ ۱۲/ مارچ) ابا جان کی خوشامدیں کرتا رہا کہ شادی میں مجھے چلنے کو مجبور نہ کریں دلی کیفیت کا اظہار میں نے نہیں کیا، ابا کو راضی کرلیا کہ میری جگہ مولانا عابد حسین رحمانی (میرے بہنوئی) رفیق سفر ہونگے، یہ خدمت گذار ہیں ہمہ وقت آپ کے ساتھ رہیں گے، مگر چلتے وقت کہہ دیا کہ سجاد کے بغیر میں نہیں جاسکتا، وہ نہیں رہے گا تو اس بھیڑ میں بھی مجھے تنہائی کا احساس ہوگا، دو دن کی میری کوششیں اکارت گئیں اور حکم کے مطابق جانا پڑا۔

۲۳/ مارچ کو نکاح کے بعد کھانے سے فارغ ہوکر روپسپور سے ہم لوگ شام واپس ہورہے تھے کہ راستہ میں خبر دی گئی، والدہ محترمہ کا تقریباً ۵/ بجے شام میں انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اماں بیمار تھیں مگر خود سے اٹھتی بیٹھتی تھیں، سہارے سے چل لیتیں، طبیعت کوئی تشویشناک نہیں تھی، اخیر تک بہوئیں اور بیٹیوں سے باتیں کرتی رہیں پھر سوگئیں، گھر کی جو عورتیں آس پاس تھیں سمجھیں کہ آنکھ لگ گئی ہے پھر انھیں میں سے کسی نے کہا کہ لگتا ہے دادی کا انتقال ہوچکا ہے، دیکھا گیا تو واقعی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ میری بڑی لڑکی عفت ساجدہ نے اپنی دادی کی سب سے زیادہ خدمت کی اس کا اظہار میری اماں تمام اہل خانہ کے

سامنے کرتیں اور خوب دعائیں دیتیں۔

آپ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نوراللہ مرقدہ سے بیعت تھیں، نماز اور وظائف کی پابند تھیں، میری اماں کی وفات نے بھی ابا جان کے دل و دماغ کو کافی متاثر کیا، ویسے جن لوگوں کی مفارقت دن بہ دن انھیں اکیلے پن کا احساس دلاتی رہی ان میں بطور خاص آپ کے استاذ گرامی قدر محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا محمد حسین علامہ بہاریؒ، سید از ہر شاہ قیصرؒ، آپ کے عزیز شاگرد مولانا رضوان القاسمیؒ ہیں۔ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن علیہ الرحمہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کے انتقال کی خبر جب میں نے ابا جان کو دی تو کافی غمزدہ ہوئے، دعاء مغفرت کی اور فرمایا میرے آخری ''بڑے'' رخصت ہوگئے اب میری باری ہے، دیکھو کب بلاوا آتا ہے۔

فالج کا حملہ

دسمبر ۲۰۰۷ء میں ابّا دیوبند ہی میں تھے کہ ابا جان پر فالج کا حملہ ہوا، فجر کی نماز کے بعد کچھ غیر معمولی تبدیلی انھوں نے محسوس کی، فوراً اپنے عزیز اور معتمد ڈاکٹر عبید الرحمٰن کو بلایا، انھوں نے فوری طور پر مناسب دوائیں دیں پھر ڈاکٹر گوئل سے مستقل علاج کرایا، الحمدللہ بہت فائدہ ہوا، البتہ داہنے ہاتھ کی ہتھیلی متاثر ہوگئی، صحیح طریقے سے مٹھی کا کھولنا اور بند کرنا دشوار ہوگیا، فون پر ابا جان سے روزانہ تفصیلی باتیں ہوتی رہیں، ہمہ وقت ان کے ساتھ رہنے والے عزیزوں مولوی شاہد اور مولوی شاکر صاحب سے روزانہ ابا کی خیریت معلوم کرتا رہا۔

غالباً جنوری ۲۰۰۸ء میں فقہ اکیڈمی کا دہلی میں کوئی پروگرام تھا، اکیڈمی کے لوگ ابا جان کو لینے دیوبند پہونچ گئے، ابا عزیزوں سے انکار کرنہیں سکتے تھے،

دوران گفتگو مجھے بتایا کہ اندر سے طبیعت جانے کو آمادہ نہیں ہے، میں نے دخل دے کر ان کا پروگرام ملتوی کرایا، اسی طرح کچھ مہینوں بعد ابا جان کے عزیز ترین شاگرد مولانا اختر امام عادل نے اپنے مدرسہ امام ربانی منورواسمستی پور کے اجلاس میں آپ کا پروگرام لے لیا، ٹکٹ بھی بن گیا، ابا نے ہی خبر دی اور یہ بھی کہا کہ امام عادل کی وجہ سے ہاں کہہ دیا ورنہ سفر کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا ہوں، میں نے عرض کیا طبیعت اندر سے آمادہ نہ ہو تو سفر نہ کریں فرمایا یہ میرے لیے زیادہ اچھا ہے، مگر تم امام عادل کو سمجھا دو، میں پھر دخیل ہوگیا اور شدت سے اصرار کر کے سفر ملتوی کرایا۔

بہر حال سردیوں کے ختم ہوجانے کے بعد میں نے عزیزم عباد سلمہ اور مولوی مجتبیٰ کو فون کیا اب ابا کو دہلی لاکر اچھے ہاسپیٹل میں دکھائیں، مولوی امتیاز صاحب فقہ اکیڈمی سے بھی مشورہ کرلیں، حسن اتفاق انہی دنوں حضرت مولانا محمد ولی رحمانی صاحب دامت برکاتہم ابا کی مزاج پرسی کے لیے دیوبند پہونچ گئے، انھیں کی کار سے ابا کو دہلی لایا گیا، فقہ اکیڈمی کے دفتر میں قیام ہوا، عزیزم عباد سلمہ مولوی مجتبیٰ اور مولوی امتیاز صاحب نے بہت ہی تندہی سے ویم ہنس ہاسپیٹل لاجپت نگر میں ایم آر آئی کرایا اور اس طرح پھر وہاں کا علاج شروع ہوا۔ ۱۹۸۲ء سے میں ابا جان سے درخواست کرتا آرہا تھا آپ گھر پر رہیں۔ اب میں نے اصرار شروع کردیا کہ اس عمر میں جو خدمت گھر پر ہوگی باہر ممکن نہیں، اس مرض کا اثر ان کی صحت پر بہت پڑا، مختلف عوارض لاحق ہوگئے، ان کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ شاید مئی ۲۰۰۸ء میں مکان تشریف لائے تھے، میرے بہت اصرار کے بعد ابا آمادہ ہوگئے اور فرمایا دارالعلوم کا یہ میرا آخری سفر ہوگا، رمضان کی فرصت میں آؤں گا تو پھر دیوبند نہیں جاؤں گا۔..... ایسا ہی ہوا، ۲۱ر ستمبر ۲۰۰۸ء مطابق ۲۰ر شعبان ۱۴۲۹ھ کو آپ کبرسنی اور مختلف اعذار کی بنا پر دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوکر مستقل گھر چلے آئے۔ دارالعلوم نے دوہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔

مفتی ظفیر الدین لائبریری کا قیام

ابا نے ۱۹۹۵ء میں اپنے گاؤں میں مدرسہ شمس العلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو بحمد اللہ بہت بافیض ثابت ہوا، ابا کی ساری کتابیں اور علمی جرائد و رسائل دارالعلوم سے منگوا کر مدرسہ کے ایک وسیع کمرے میں ابا کے نام پر ایک مستقل لائبریری قائم کردی گئی، جو ماشاء اللہ بہت ہی بیش قیمت ہے، اس سے مدرسہ کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہوگئی۔شوال ۱۴۲۹ھ میں اس کا افتتاح ابا کی موجودگی میں شاندار طریقے سے کیا گیا،جس میں ضلع دربھنگہ و مدھوبنی کے اکثر مدارس کی نمائندگی ہوئی، علما کی کثیر تعداد نے اس میں حصہ لیا، اچھی خاصی تعداد میں پروفیسر صاحبان مختلف ہائی اسکولوں کے اساتذہ کرام اور علاقہ کے اہل علم اور علم دوست حضرات نے شرکت فرمائی۔

گھر پر ابا جان کے شب روز

دارالعلوم سے آنے کے بعد ایک سال تک آپ کا معمول تھا کہ صبح کی چائے کے بعد اکثر مدرسہ تشریف لے جاتے، لائبریری میں تشریف رکھتے، اخبار و رسائل پڑھتے، یا کسی استاذ سے پڑھوا کر سنتے، مدرسہ کی فکر کرتے اور ضروری ہدایات مجھے یا اساتذہ مدرسہ کو دیتے، بسا اوقات ناشتہ مدرسہ ہی میں منگواتے اور اساتذہ کے ہمراہ تناول فرماتے، مدرسہ کے پڑوس میں میرے بھائی مولانا محمد حماد قاسمی کا مکان ہے، مدرسہ سے اٹھ کر وہاں جاتے پوتوں پوتیوں اور ان کے بال بچوں کے ساتھ بھی وقت گذارتے، میری ایک ہمشیرہ ریحانہ خاتون کا سسرال گاؤں میں ہے ان کے شوہر جناب محمد محمود صاحب بی اے ابا کے بھانجے ہیں، میری اہلیہ محمود صاحب کی بہن اور ابا کی بھانجی ہیں،عصر کی نماز پڑھ کر بسا اوقات

بیٹی کے گھر بھی چلے جایا کرتے تھے وہاں بھی وقت اچھا گذرتا۔

عزیزم حماد سلمہ کے دو بڑے لڑکے محمد رضوان، محمد عمران ریحانہ کا لڑکا محمد آفتاب مدرسہ کے اساتذہ مولانا نصیر اللہ قاسمی اور حافظ محمد رحمت اللہ زیادہ تر ابا کے ساتھ ہوا کرتے تھے، ہر جمعہ کو پابندی سے غسل کرانے کی سعادت مولوی نصیر اللہ کو حاصل ہوا کرتی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی یہ اور مولوی ارشاد قاسمی بڑھی دربھنگہ، آپ کی خدمت میں رہا کرتے تھے، مسجد اور مدرسہ تک ساتھ جانے آنے میں فیصل سجاد (عرشی) یا افضل ساتھ رہتے۔گھر کے اندر میرے بال بچے ہمہ وقت خدمت کے لیے حاضر و مستعد رہتے، فیصل، افضل جسے دادا اپنا سکریٹری بنائے ہوئے تھے، فرحت ساجدہ، نزہت ساجدہ، نکہت ساجدہ (پنجم) سبھی خدمت کر کے خوش ہوتے، دادا دادا کی آواز سے گھر میں رونق رہتی۔

عزیزم ڈاکٹر عباد سلمہ گرمی اور سردیوں کی فرصت میں گھر آتے تو پورا وقت اس خیال سے ابا کے ساتھ یا گھر کے اندر گذارتے کہ ابا کی خدمت کا موقع زیادہ سے زیادہ ملے، بچے اور بچیوں سے کہتے کہ تم لوگ ہمیشہ خدمت کرتی ہو اب میں ہوں تو مجھے موقع دیا کرو۔ میری ہمشیرہ ریحانہ خاتون اور عزیزم حماد سلمہ کی اہلیہ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے اکثر خدمت کے لیے آتی رہتیں، بڑی ہمشیرہ حسنیٰ صدیقہ اور چھوٹی بہن نسیمہ خاتون بھی خدمت کے جذبے سے گاہے بگاہے آیا کرتیں۔ میری بڑی دونوں لڑکیاں عفت ساجدہ اور عصمت ساجدہ بھی یکے بعد دیگرے اپنے سسرال سے آکر خدمت کی سعادت حاصل کرتیں، نواسے نواسیاں بھی دعائیں لینے حاضر ہوتے، میری بڑی بہن کا لڑکا شکیل مکھیا بھی اکثر آکر ملتے رہتے، مری اہلیہ آپ کی بھانجی ہیں اس نے اور بچیوں نے خدمت کا پورا پورا حق ادا کیا، اللہ تعالیٰ اپنی شان کے موافق بہترین صلہ عنایت فرمائے۔

دربھنگہ میں ڈاکٹر سی این یادو سے مکمل جانچ کے بعد علاج چلا، ڈاکٹر نے

بتایا یہ بڑی بات ہے اس عمر میں کوئی مرض نہیں ہے، کبرسنی کی وجہ سے سارے اعذار ہیں یا پھر گذشتہ فالج کے اثرات، عزیزم مولوی مجتبیٰ کی نشان دہی پر ہومیو پیتھ کے ایک دین دار اور صاحب علم ڈاکٹر جناب جمال الدین صاحب نرملی، مدھوبنی سے رابطہ کیا گیا، وہ بہت ہی خوشی سے تشریف لائے کافی دنوں تک ان کی دوائیں چلتی رہیں۔

رمضان کے معمولات

رمضان ۱۴۲۹ھ اور رمضان ۱۴۳۰ھ کے مکمل روزے رکھے، افطار حسب عادت گاؤں کی مسجد میں ہمیشہ کیا کرتے، البتہ تراویح ابا جان کے کمرے میں پڑھی جاتی جس میں والد محترم کے علاوہ میں، مولانا محمد حماد، میرے لڑکے فیصل سجاد، افضل سجاد، حماد کے لڑکے ماسٹر محمد رضوان، ماسٹر محمد عمران، مولوی عدنان، محمد فیضان، رضوان کے لڑکے اسامہ رضوان اور حذیفہ رضوان شامل ہوتے، اکثر حماد کے گھر سے کبھی کھانا آجاتا اور تراویح کے بعد سبھی لوگ ساتھ کھانا کھاتے، صبح میں اور ظہر بعد تلاوت پابندی سے کرتے اور افسوس کیا کرتے کہ رمضان میں ہمیشہ پانچ پارہ یومیہ پڑھنے کا معمول تھا اب ایک دو پارہ بھی پہاڑ معلوم ہوتا ہے، آخری رمضان ۱۴۳۱ھ میں نو (۹) روزے رکھنے کے بعد نقاہت بہت بڑھ گئی ہم لوگوں نے بہت خوشامدوں سے روزے موقوف کرائے، اتفاق سے اسی دن آپ کے عزیز شاگرد مولانا مفتی اشتیاق صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے، انھوں نے بھی پرزور درخواست کی کہ آپ مزید روزے نہ رکھیں، شریعت نے ان ہی حالات میں فدیہ کی سہولت عطا کی ہے۔ ان کی سفارش کام آئی۔

رمضان بعد پندرہ دنوں تک مہمانوں کی کثرت ہوا کرتی، ابا کے بہت سارے شاگرد اور مخلصین جو دور دراز مختلف مدارس میں اساتذہ ہوتے ان ہی ایام

میں تشریف لاتے، رشتہ داروں کے آنے کا بھی سلسلہ رہتا، اس کے علاوہ مختلف مدارس میں داخلہ کے خواہش مند طلبا اور ان کے سرپرستوں کا بھی ازدحام ہوا کرتا، سبھی سفارشی خطوط لکھواتے، بصد خوشی ابا تحریر فرماتے، ابا کی زندگی کا یہ مستقل شعبہ تھا، آخری شوال ۱۴۳۱ھ میں نقاہت کی وجہ سے قلم پر گرفت بالکل ڈھیلی پڑگئی تو مجھے خطوط لکھنے کا حکم کرتے، کسی کو ان کی ذات سے فائدہ پہونچتا تو بہت مسرور ہوتے۔

رشتہ داروں کے علاوہ بعض اہم حضرات جو عیادت کے لیے تشریف لائے ان میں حسب ذیل نام ذہن میں محفوظ ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم، نائب امیر شریعت وسجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر، حضرت مولانا نورعالم خلیل امینی مدظلہ ایڈیٹر ماہنامہ الداعی واستاذ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مظفرپوری قاضی شریعت بہار واڑیسہ، مولانا ڈاکٹر سعود عالم قاسمی صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جناب عبدالباری صدیقی صاحب سابق وزیر موجودہ لیڈر حزب اختلاف بہار اسمبلی، حضرت مولانا ابواختر صاحب قاسمی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، حضرت مولانا ممتاز احمد صاحب مظاہری مہتمم مدرسہ رحمانیہ ایکہتہ مدھوبنی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، مولانا مفتی اشتیاق احمد صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی اختر امام عادل مہتمم مدرسہ ربانی منورواسمستی پور، مولانا بشیر احمد حسامی صاحب حیدرآباد، مولانا ابوذر صاحب باندرکوڑہ مہاراشٹر، مولانا مفتی ثناء الہدیٰ صاحب نائب ناظم امارت شرعیہ، مولانا محمد حسین صاحب مہتمم مدرسہ حسینیہ جیور، دربھنگہ، مولانا فضل احمد صاحب قاسمی کٹکی بازار دربھنگہ، مولانا حبیب اللہ صاحب قاضی شریعت مدھوبنی، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا مفتی ابوذر قاسمی، مولانا نوراللہ قاسمی، مولانا روح اللہ قاسمی، قاری صغیر احمد، قاری وصی احمد، قاری سہیل احمد قاسمی اساتذہ مدرسہ فلاح

المسلمین مدھوبنی، جناب ماسٹر محمد مرتضی صاحب سکریٹری مدرسہ فلاح المسلمین مدھوبنی، محترم جناب حاجی نورالحسن صاحب خانقاہ ستگھرہ مدھوبنی، محترم جناب عثمانی صاحب، مولانا سراج صاحب، محترم جناب انیس صاحب مولانا امتیاز صاحب فقہ اکیڈمی دہلی، محترم جناب حافظ ظہیر صاحب اور ان کے صاحب زادہ مولانا رضاء اللہ مدرسہ اصلاحیہ نامنگر دربھنگہ، برادر عزیز مولانا عبدالوہاب قاسمی اور صاحبزادگان مدھے پور مدھوبنی، انجینیر جناب خورشید صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا محمد یحییٰ ندوی صاحب سانحہ بیگوسرائے، مولانا احسن نیازی علی گڑھ، مولانا غلام مصطفیٰ صاحب مہتمم مدرسہ حنفیہ گیدر گنج مدھوبنی، مولانا محمد افتخار صاحب مدرسہ اسلامیہ سعیدیہ ضلع مظفر پور، مولانا محمد اعجاز صاحب قاسمی، مولانا عبدالغنی قاسمی اساتذہ مدرسہ حنفیہ، مولانا ولی اللہ صاحب مدرسہ بشارت العلوم کھرایاں دربھنگہ، جناب ماسٹر عبدالحفیظ صاحب سندر پور دربھنگہ، ماسٹر ابوالکلام صاحب و ماسٹر محمد شاکر صاحب ہائی اسکول اتیہر دربھنگہ، مولانا حاجی نثار احمد صاحب قاسمی سوپول دربھنگہ، جناب مولانا مفتی محمد فاروق صاحب قاسمی و مولانا محمد ارشاد قاسمی، حافظ علی رضا برہی، دربھنگہ، مولانا شکیل صاحب فقہ اکیڈمی دہلی، پروفیسر معین عثمانی صاحب دربھنگہ، پروفیسر مشتاق احمد صاحب پرنسپل ملت کالج دربھنگہ، جناب عبدالمنان طرزی صاحب دربھنگہ، مولانا ضیاء الدین صاحب مہتمم مدرسہ موریا دربھنگہ، ان کے علاوہ بہت سارے علماء کرام، مخلصین اور شاگردان عزیز نے مکان پر تشریف لاکر عیادت و مزاج پرسی کی سنت ادا کی۔ سبھی حضرات سے ایک درخواست ابا جان ضرور کرتے میرے لیے حسن خاتمہ کی دعا فرمائیے۔

ایک بات جو بڑے اعتماد کے ساتھ اکثر فرمایا کرتے تھے میرے مخلصین اور شاگردوں کی دعائیں میری بخشائش کا انشاء اللہ سب سے بڑا ذریعہ بنیں گی، اس کے علاوہ ملک بھر سے آپ کے شاگرد اور علمائے کرام برابر فون سے خیریت

دریافت کرتے رہتے، ۲۰۱۱ء کی سردیوں میں بھی طبیعت بالکل ٹھیک رہی مگر کمزوری اور عوارضات میں اضافہ ہوتا گیا، انتقال سے ایک ہفتہ پہلے تک معمول رہا کہ صبح میں کچھ دیر کے لیے سہارے سے چل کر آنگن میں دھوپ میں آرام کرتے پھر شام تک برآمدہ میں تشریف رکھتے، رات اپنے کمرے میں سوتے، ابا کے کمرے میں ایک جانب چوکی پر ان کا بستر تھا باقی دو تہائی کمرے میں نیچے فرش بچھا رہتا جہاں میں سوتا اگر کوئی بے تکلف مہمان ہوتے تو وہ بھی وہیں سوجاتے۔

وفات

وفات سے کچھ دنوں پہلے سونے کی جگہ بدل لی تھی، ابا کے بستر پر اوپر میں سوجاتا اور اپنی جگہ فرش پر انھیں سلا دیا کرتا، ہوش وحواس میں کمی کی وجہ سے گرنے کے خطرہ کے پیش نظر ایسا کرنا پڑا۔ وفات سے ایک دن پہلے ۳۰/ مارچ ۲۰۱۱ء کو طبیعت ٹھیک نہیں تھی کچھ کھایا پیا نہیں، غنودگی کی سی کیفیت رہی، ڈاکٹر نے بتایا کہ بخار کی وجہ سے یہ حالت ہے، دوسرے دن ۳۱/ مارچ مطابق ۲۵/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ کی صبح میں طبیعت حسب سابق اچھی ہوگئی، بسکٹ کھائے چائے پی، عادت کے مطابق مجھ سے کہا میری نبض دیکھو، میں نے دیکھ کر کہا آپ بالکل اچھے ہیں، پھر پوچھا میں مروں گا نہیں؟ میں نے عرض کیا موت تو برحق ہے سب مریں گے، آپ بھی اور ہم لوگ بھی جب جس کا وقت موعود آئے گا اللہ کے حضور پہونچ جائیں گے۔ فرمایا ہاں یہ تو ہے۔

میرے اسکول سے ایک جونیر استاذ کا بار بار فون آرہا تھا جنھیں مجھ سے ضروری کام تھا، ابا کی طبیعت ٹھیک دیکھ کر میں ساڑھے گیارہ بجے ابا سے اجازت لے کر اسکول چلا گیا، تقریباً دو بجے افضل نے فون کیا دادا کی طبیعت پھر خراب ہوگئی آپ جلد آجائیں ڈھائی بجے میں پہونچا تو ابا پر غشی طاری تھی، میں نے سلام کیا

آنکھیں کھولیں مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ ان کے پاس داہنی طرف نبض پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا، نبض ڈوبتی جارہی تھی۔ غیر لوگوں سے کمرہ خالی کرا کر اندر سے بند کردیا، حماد سلمہ، فرحت ساجدہ اور حافظ ارشاد سے کہا تم لوگ دھیمی آواز میں قرآن شریف پڑھو میرے بہنوئی محمد محمود صاحب، چچازاد بھائی مولانا محبّ اللہ مفتاحی اور مولوی حسن صاحب بھی تلاوت میں مشغول ہوگئے، ابا کی زبان سے اللہ احد اللہ الصمد صاف سنا جارہا تھا، پھر آواز بند ہوتی گئی، زبان اسی طرح چلتی رہی کچھ ہی منٹوں میں ٹھیک ۳/ بجے معمولی سی ہچکی لی اور خالق کائنات کے حضور پہونچ گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جن لوگوں کی نظریں قرآن شریف پر مرکوز تھیں جو بغل میں بیٹھے تھے کسی کو احساس تک نہیں ہوا کہ آپ اس دارفانی سے کس پل اور کیسے رخصت ہوگئے۔ میرے دادا جان کی وفات ایسی ہی ہوئی تھی، یہ ابا جان ہم لوگوں سے کہا کرتے تھے، میری والدہ محترمہ بھی بڑی خاموشی سے رخصت ہوئیں اور اسی طرح والد محترم علیہ الرحمہ بھی۔ اللھم اغفرہ وارحمہ رحمۃ واسعۃً۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب اپنے آپ پر قابو پایا، سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند میں آپ کے عزیز شاگرد مولانا مفتی اشتیاق صاحب استاذ دارالعلوم کوفون کیا اور کہا کہ دفتر اہتمام میں خبر کردیں۔ پھر خانقاہ رحمانی میں خبر کیا، مرقاۃ العلوم مئو اور امارت شرعیہ کو اطلاع دی پھر ہمت کرکے اپنے چھوٹے بھائی عزیزم ابوبکر عباد کوفون کیا، خبر تو سنادی مگر پھر اس کے بعد میری زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کی ہچکیاں سسکیاں دیر تک سنتا رہا میں اپنی تمام قوت گویائی کو مجتمع کرکے صرف ''عباذ'' کہہ پاتا اور وہ ''جی'' پھر میں نے دربھنگہ میں اس کی اہلیہ روشن کوفون پر کہا کہ اس کے پڑوس میں جو اس کے دوست احباب ہوں انھیں فون سے کہو اس کی خبر گیری کرے۔

عزیزم مولانا محمد حماد قاسمی ان کے لڑکے محمد رضوان محمد عمران عباد کے لڑکے عادل حسن ظفیر سلمہ کو ایک کمرے میں جمع کرایا وقت اور مقام تدفین متعین کیا پھر عام اطلاع دی گئی، ابا جان کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کا قبرستان گاؤں سے دور ہے اس لیے مدرسہ کے احاطہ میں یا اس کے آس پاس مجھے دفن کرنا تاکہ قبر پر فاتحہ پڑھنے والوں کو مشقت نہ اٹھانی پڑے، اور مدرسہ میں بچے قرآن شریف پڑھا کریں گے تو ثواب ملا ہی کرے گا، دوسرے دن یکم اپریل ۲۰۱۱ء مطابق ۲۶/ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ بروز جمعہ قبل جمعہ ساڑھے نو بجے دن میں ہزاروں علماء کرام، مخلصین ومعتقدین، رشتہ داروں اور عزیزوں نے مدرسہ شمس العلوم کے احاطہ میں آپ کو سپرد خاک کیا، میرے اصرار پر عزیزم مولانا پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی سابق صدر شعبہ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب کا علمی امتیاز

پروفیسر ابوالکلام قاسمی☆

بعض شخصیتیں اپنی اہمیت کا احساس وفات کے بعد دلاتی ہیں، جب یہ احساس، احساسِ زیاں میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ مفتی محمد ظفیر صاحب اسی نوع کی مغتنم شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ نہایت سادہ لوح، غیر مصنوعی اور داخلی اور خارجی طور پر پوری طرح ہم آہنگ۔ جو اندر ہوتا وہی باہر۔ جو دل میں ہوتا، وہی زبان پر---مگر اپنے ذکر سے بے نیاز اور اپنی اوصاف سے بڑی حد تک بے خبر۔ دراصل یہ بے خبری تو نہیں، مگر اپنی ذات کے معاملے میں بے نیازی خود اپنی خوبیوں سے بے خبر ہونے کا تاثر دیتی ہے۔ وہ رسمی طور پر میرے اُستاذ تو نہ تھے پھر بھی ان سے ملاقات اور طالب علمانہ نیاز مندی کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی میں شروع ہو گیا تھا۔ تاہم ان کی فکری اور علمی عظمت کا صحیح احساس وقت گزرنے کے ساتھ ہونا شروع ہوا، جو بڑی حد تک ان کی تحریروں کے مطالعہ کے دوران روز افزوں ہوتا رہا۔

جب راقم الحروف ان کے حلقۂ ارادت سے آشنا ہوا اس وقت وہ بھی شاید دیوبند میں نو وارد تھے۔ مگر شروع سے ہی ان کی حیثیت مرجع خلائق کی سی بن گئی تھی۔ وہ جس بے تکلفی اور بے تصنعی سے اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے علاوہ اپنے خردوں کے ساتھ پیش آتے، اس کا انداز بہت جلد دوستانہ ہو جایا کرتا تھا۔ اسی لیے

☆ ایڈیٹر ماہنامہ تہذیب الاخلاق وسابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شاید ان کے حلقے کو حلقۂ ارادت کا نام دینا بھی درست نہ ہو۔ دیوبند میں ان کے پاس حاضر ہونے والے طلبا کی بڑی تعداد بالعموم ان کے ہم وطنوں کی ہوا کرتی تھی۔ تاہم ان کی علمی اور ادبی حیثیت کے معترف ہر طرح کے طلباء بھی تھے اور اساتذہ بھی، خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقے سے رہا ہو۔ ہم وطن اور غیر ہم وطن جیسے الفاظ محض یہ واضح کرنے کے لیے استعمال کیے گئے کہ دیوبند ہی کیا دوسرے مدارس میں بھی ہم نام طالب علموں میں تفریق کی خاطر وطن کی نسبت سے انھیں جاننے کا رواج عام ہے۔ کسی کو مظفرنگری، مظفر پوری یا سہارن پوری سے موسوم کرنے میں کسی طرح کی علاقیت کا شائبہ مشکل سے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں ابتداءً وہ مرتب فتاویٰ کے منصب کے لیے منتخب ہوئے تھے جس کی مناسبت سے ان کا زیادہ تر وقت دارالافتا میں گزرتا تھا۔ وہاں وہ ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر بڑے انہماک کے ساتھ فتاوائے دارالعلوم دیوبند کے منتشر اوراق اور رجسٹر کو مجتمع کرنے، حواشی لگانے اور ضروری معلومات فراہم کرنے میں مصروف رہا کرتے۔ اس زمانے میں رسالہ 'دارالعلوم' کا اداریہ لکھنے کی ذمہ داری ان کے سپرد نہیں ہوئی تھی۔ یاد آتا ہے کہ شاید 'دارالعلوم' کے مدیر سید اظہر شاہ قیصر، خود ہی اداریہ لکھا کرتے تھے۔ ان کے اداریوں میں مذہبی اور علمی مسائل کے ساتھ مسلمانوں کے تہذیبی مسائل بھی زیر بحث آیا کرتے تھے۔ مگر کچھ عرصے کے بعد مفتی صاحب کے تحریر کردہ اداریے 'دارالعلوم' میں شائع ہونے لگے۔ پتہ نہیں ضابطے میں اس رسالے کی مجلس ادارت میں مفتی صاحب کی حیثیت کیا مقرر ہوئی تھی۔ لیکن ان کے اداریوں کا انداز اظہر شاہ قیصر صاحب کے اداریوں سے مختلف ہوا کرتا۔ ان میں سیاسی اور نیم سیاسی معاملات بھی زیر بحث آتے اور بعض اداریوں میں ملّی مسائل پر خاصے گہرے غور وخوض کا بھی انداز نمایاں ہوا کرتا۔ ان اداریوں نے مفتی ظفیر الدین کی علمی اور فکری اہمیت کے بہت سے گوشے لوگوں پر وا کیے۔

اس لیے کہ دارالعلوم کے حلقے کے علاوہ بھی رسالہ دارالعلوم کے قارئین کو مفتی صاحب کی ہمہ جہتی سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔ ایسا لگتا تھا کہ جن لوگوں کو عام طور پر ان کی کتابوں کے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کے لیے بھی مفتی صاحب کے دانش ورانہ قد وقامت سے واقف ہونے کی سبیل پیدا ہوئی۔

راقم الحروف اپنی اس اُفتادِ طبع سے اُلجھتا بھی رہا ہے کہ جب تک کوئی علمی شخصیت اپنے علم وفضل اور افادیت کو تحریروں میں نہ منتقل کر سکے، اس کے لیے بے معنی رہتی ہے۔ درس و تدریس سے وابستہ اساتذہ میں فاضلانہ انداز میں اظہارِ خیال اور علمی طور پر مرعوب کرنے کی کوشش اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر علم ہو یا ادب، فلسفہ ہو یا حکمت جب تک صدقہ جاریہ کی طرح اگلی نسلوں تک منتقل ہونے کی صورت میں نہیں ڈھل پاتے بہت وقتی اور اضطراری کیفیت سے دوچار رہتے ہیں۔ اس لیے نسلاً بعد نسلٍ اثر انداز ہونے والے علم کو ہی صحیح معنوں میں علم نافع میں شمار کیا جانا چاہیے۔

مفتی ظفیر الدین صاحب چوں کہ اپنے اظہار کے لیے سب سے بہتر وسیلہ اپنی تحریروں کو تصوّر کیا کرتے تھے اس لیے شروع سے ہی ان کی غیر مرعوب کن شخصیت بھی میرے لیے مغتنم تھی۔ یہ بات اس لیے بھی زیادہ اہم ہوجاتی ہے کہ مذہبی اور مشرقی علوم کی درس گاہوں میں علم و دانش کی افراط تو بہ ظاہر بہت نظر آتی ہے (ہر چند کہ اس میں علم کا تناسب قدرے زیادہ اور دانش کا برائے نام ہی ہوتا ہے) مگر اس کو محفوظ کرنے یا صحیح معنوں میں علم نافع بنانے کے معاملے میں بے اعتنائی کا رویہ عام ہے۔ یہ سوئے اتفاق نہیں تو اور کیا ہے کہ ہمارے علمائے کرام خواہ کسی اور ممتاز مدرسہ سے وابستہ ہوں یا دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء سے، ان میں دوچار استثنا کے ساتھ لکھنے لکھانے اور اپنی معلومات کو علم اور علم کو دانش میں منتقل کرنے والے حضرات کو مشکل سے ہی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مدارس کے اساتذہ اپنا

کام زیادہ تر نصابی کتابوں کی تدریس اور متعین انداز کی روایتی معلومات کو اپنی قوتِ حافظہ کی مدد سے دُہراتے رہنے سے چلاتے ہیں۔ اگلے دن کی تدریس کی تیاری ان کے لیے مطالعہ کے مترادف ہے اور مختلف شروح اور تعبیراتی کتب میں جن جزئیات کو زیر بحث لایا جاچکا ہے ان کو مستحضر کرنا اور ٹیپ رکارڈر کی طرح طلبا کے سامنے پیش کر دینا ان کے فضل و کمال کا معیار سا بن گیا ہے۔ اس عمل میں طلبا کے سوالات، اعتراضات اور اشکال کے جواب بھی شامل ہوتے ہیں۔ البتہ مدارس کے بعض اساتذہ کچھ علم دوستی میں اور کچھ مالی منفعت کی خاطر متن کی تشریح، بین السطور نگاری اور تراجم کی طرف متوجہ ضرور نظر آتے ہیں۔ مگر اس نوع کی کتابوں کی حیثیت تسہیل نگاری یا امتحان پاس کرنے والے نوٹس سے زیادہ نہیں ہوتی۔

علمی طور پر غور وفکر، مسائل کے استخراج، نکتہ آفرینی اور دانش ورانہ تدبّر کے اظہار سے اب علمائے مدارس کا تعلق نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ دانش ورانہ افہام وتفہیم کا میدان علماء سے خالی ہونے لگا ہے۔ جس کے نتیجے میں مذہبی علوم اور مسائل حاضرہ کے مابین مکالمے کی راہیں مسدود ہوکر رہ گئی ہیں۔ اس لیے کہ جن بیدار مغز مسلم دانش وروں میں مذہب کو معاصر سیاق وسباق میں سمجھنے کی خلش پائی جاتی ہے ان کو مذہبی مبادیات اور مستند مشرقی علوم سے کماحقہٗ واقفیت حاصل نہیں اور جن کو مذہبی علوم سے پوری طرح مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے وہ اس سوز اور درد سے ہی آشنا نہیں جو عالمی سطح کی دانش ورانہ بحث وتمحیص اور اسلامی نقطۂ نظر کی معتبر پیش کش کے فقدان سے پیدا ہورہا ہے --- اس پس منظر میں مدارس کے قابلِ قدر اساتذہ اور بسا اوقات سربرآوردہ علماء بھی اپنے خیالات اور تصوّرات کی شیرازہ بندی کرکے ان کے تحریری اظہار کی اہمیت سے ناواقف ہونے کے باعث اپنے فیوض و برکات سے عقیدت مندوں کو زیادہ عرصے تک بہرہ ور کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے مقتدر حضرات بھی اپنی

عمر طبعی سے آگے دور تک نہ تو اپنے وجود کا اثبات کر پاتے ہیں اور نہ ان کے ساتھ برتی جانے والی عقیدتیں اگلی نسلوں کے ذہن میں محفوظ رہ پاتی ہیں۔ مفتی محمد ظفیر الدین کے ذکر میں تصنیف و تالیف سے وابستہ علماء کا ذکر اس لیے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ راقم الحروف نے عربی مدارس سے کسبِ فیض کے دوران بار بار محسوس کیا کہ بعض نابغۂ روزگار ہستیاں اگر محض اپنے درس میں علم و دانش کے جواہر پارے لٹانے تک محدود نہ رہتیں اور اعلیٰ درجے کی جزرسی اور نکتہ آفرینی کو اپنے مضامین یا کتابوں میں محفوظ کر دیتیں تو مفتی صاحب ہی کی طرح ان کا علم صحیح معنوں میں علم نافع اور ان کی دانش، دانش وری کی روایت کو مستحکم کرنے اور مزید غور و فکر کی راہیں استوار کرنے کا وسیلہ بن سکتی تھی۔

وہ تو خدا بھلا کرے مولانا منت اللہ رحمانی اور قاری محمد طیب صاحب کی پارکھ نگاہوں کا کہ ان دونوں حضرات نے کتب خانے کی اہمیت اور کتابوں کے تحفظ کی قدر و قیمت جیسے عام موضوع پر ظفیر الدین مفتاحی نامی نوجوان قلم کار کے جوہر کو خانقاہ رحمانی مونگیر کی لائبریری کے جلسۂ افتتاح میں، ان کے مقالے کو سن کر پرکھ لیا تھا اور اس نوجوان کی نکتہ رسی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ورنہ عام صورت حال تو یہ ہے کہ مدارس کی عام تدریسی فضا میں اکثر تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں، اور جب ابتدا میں ان کی ہمت افزائی اور قدرشناسی نہیں ہوتی تو ایسی صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے امکانات بھی ختم ہوجاتے ہیں۔

مولانا منت اللہ رحمانی کا ذکر آ گیا ہے تو نامناسب ہوگا کہ ان کی جوہرشناسی کی ایک اور درخشاں مثال کی یاد تازہ کر لی جائے۔ مولانا قاضی مجاہد الاسلام، جو بعد کے زمانے میں قاضی امارت شرعیہ، فقہ اکیڈمی کے بانی اور ملّی کونسل کے معماروں میں اپنی انفرادیت کے باعث ایک بے مثال عالم کی صورت میں متعارف ہوئے، وہ دراصل مولانا منت اللہ رحمانی کی پارکھ نگاہوں میں آ کر ہی

پہلے خانقاہ رحمانی میں معلم اور قدرے بعد میں امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے قاضی القضاہ بنے تھے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ پھلواری شریف میں واقع دارالقضا، کی تاسیس سے لے کر تشکیل حتیٰ کہ اس کو نظریاتی اور علمی بنیادوں پر مستحکم کرنے میں خود مولانا منت اللہ رحمانی یا دوسرے سربراہان کے مقابلے میں کوئی کم اہم کردار قاضی مجاہدالاسلام نے ادا نہیں کیا۔ یہ وہی عملی تجربہ تھا جس کی بنیاد پر انھیں فقہ اکیڈمی کے خدوخال متعین کرنے میں مدد ملی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مفتی محمد ظفیر الدین اور قاضی مجاہدالاسلام کے درمیان بہت سے مشترک پہلوؤں کے باوجود دونوں کے شخصی رجحانات اور بالقوۃ صلاحیتیں خاصی مختلف تھیں۔ ایک عالم اور ادیب تھا تو دوسرا فقیہانہ اور مدبّرانہ شان کا مالک۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مفتی محمد ظفیر الدین صاحب ایک اچھے نثر نگار اور نکتہ سنج ادیب تھے مگر قاضی مجاہدالاسلام کی مثال ایک شعلۂ جوالہ کی سی تھی جس کے اندر مذہبی علمیت کے ساتھ فقہی نکات کی عصری تعبیرات کی صلاحیتیں مجتمع ہوگئی تھیں۔ مفتی صاحب دارالافتا میں فتاویٰ اور قضا کے نکات پر کسی قدر دسترس حاصل کر چکے تھے جب کہ قاضی صاحب کے اندر جو تفقّہ فی الدین کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی وہ بیسویں صدی کے علماء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جیسے دو چار علماء کے علاوہ کسی اور میں مشکل سے تلاش کی جاسکتی تھی۔ اس نوع کے جملۂ ہائے معترضہ کی ضرورت محض اس لیے آن پڑی تاکہ مفتی ظفیر الدین صاحب کی شخصی اور علمی شناخت کے لیے ضروری سیاق و سباق فراہم کر دیا جائے۔

مفتی صاحب بہت عام رہن سہن اور برتاؤ کے آدمی تھی۔ ان کے مزاج میں کسی طرح کی نمائش مطلق نہ تھی۔ نمائش تو دور کی بات ہے طرزِ گفتگو اور اندازِ معاشرت سے کسی منظّم ذہن اور منضبط علمی استعداد کا تاثر بھی مشکل سے ہی قائم ہوتا تھا۔ مگر جب ان کی بعض کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا تو ان کے داخلی

انضباط اور فکری شیرازہ بندی کا اندازہ ہوا۔ دیوبند میں ان سے راہ ورسم کے آغاز کا دور ہر چند کہ ہماری طالب علمانہ ناپختگی کا زمانہ تھا۔ کسی کی شخصیت کے مجتمع اور منتشر ہونے جیسی گاڑھی باتیں اس وقت ہمارے سمجھ سے باہر کی تھیں۔ تاہم ان کی بعض کتابیں پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ محض رسمی مطالعہ یا کتابوں سے استفادہ پر وہ اپنی تحریروں کا انحصار نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ہر تحریر میں گہرے غوروخوض اور حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر بہت سے نکات کے استنباط یا تصوّرات کی شیرازہ بندی کا ادراک کیا جاسکتا تھا۔

مفتی صاحب نے ضابطے میں نہ تو ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی تھی اور نہ دارالعلوم دیوبند میں۔ لیکن مفتاح العلوم، مئو ناتھ بھنجن، میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی جیسی عبقری ہستی کی تربیت نے ان کو کسی بہت بڑی مذہبی درس گاہ سے تقریباً بے نیاز کردیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سید سلیمان ندوی کے مشورے سے وہ مختصر عرصے کے لیے ندوہ میں زیرتربیت رہے تھے اور جہاں تک دیوبند کا سوال ہے تو دارالعلوم میں انھوں نے اپنی علمی اور ادبی یافت اور پختگی کا بیش تر حصہ گزار دیا ---- ان کی تحریری سرگرمیوں کا آغاز یوں تو ان کی طالب علمانہ زندگی سے ہی ہوگیا تھا، مگر ان کی علمی اور ادبی شخصیت کو دیوبند کے زمانۂ قیام میں جِلا ملی۔ اپنی آپ بیتی میں مفتی صاحب نے زمانۂ طالب علمی کی اپنی بعض سیاسی اور نیم سیاسی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے، جس کے باعث انھیں کچھ عرصے کے لیے روپوش بھی رہنا پڑا تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ محض اس زمانے کی سیاسی اُتھل پتھل اور تحریک آزادی کی عام فضا کا اثر تھا۔ نوجوانی کی ناپختگی میں اس نوع کی کسی سرگرمی یا تحریک سے وابستہ ہوجانا یا جذباتی اشتعال کا اظہار کرنا تقسیم ہند کے ماقبل کے زمانے کے لیے ہوش گوش کے نوجوانوں کے لیے عام سی بات تھی۔ مفتی صاحب اپنی افتادِ طبع کے اعتبار سے قدرے جذباتی آدمی ضرور تھے مگر ان کی جذباتیت کو ان

کی سادگی اور غیرنمائشی انداز کے باعث کبھی نمایاں ہونے کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔

مفتی ظفیر الدین نے 'اسلام کا نظام مساجد' کے نام سے جو تحقیقی اور تجزیاتی کتاب بالکل ابتدا میں لکھی تھی اس سے ایک بڑے حلقے کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ تحقیقی مزاج کے حامل ہیں اور عام جائزاتی انداز کے برخلاف موضوع کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کتاب سے زبان و بیان پر ان کی قدرت کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے، یہ تاثر بھی قائم ہوتا ہے کہ وہ تاریخی حقائق کی جستجو میں بنیادی ماخذ اور مصادر سے استفادے میں بڑی دقّت نظر کے ساتھ نکات کا استخراج کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اسلامی تاریخ اور بنیادی مذہبی مصادر میں موجود اصولوں کو نظری اعتبار سے بھی منظّم کرنے کی کوشش کی۔ 'اسلام کا نظام عصمت و عفت'، 'اسلام کا نظام جرم و سزا' اور 'اسلام کا نظام معیشت' جیسی تصانیف میں انھوں نے اسی نوع کی نظری تنظیم کاری کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس موقع پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ مذہبی لٹریچر کے تناظر میں اردو کے مصنّفین کے درمیان مفتی ظفیر الدین صاحب کو اس طریق کار کے استعمال میں امتیاز حاصل ہے کہ قرآن و حدیث، روایات اور تاریخی کتب کی مدد سے اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے جن پہلوؤں پر اصولی اعتبار سے جدید فکر نے زیادہ توجہ مبذول کرنا شروع کی ہے۔ مثلاً مساجد کی تاریخ کی بات ہو، خواتین کی صنفی شناخت کا مسئلہ ہو یا معیشت اور جرم وسزا کے معاملات ہوں، بیسویں صدی میں سماجیات، اقتصادیات، نفسیات اور نسائیت پر مبنی علوم کے فروغ نے اس بات کو بہت بامعنی بنادیا ہے کہ انسانی تاریخ بالخصوص مذاہب کی تاریخ کو ان علوم کی روشنی میں تشکیل نو سے گزارا جائے۔ اِدھر اردو زبان میں رسول کریمؐ کے زمانے اور قرون اولیٰ میں اپنائے جانے والے اسلامی طریق کار کو کسی نے تمدنی اعتبار سے، کسی نے معاشی اعتبار سے، کسی نے سماجی اعتبار سے اور بعض لوگوں نے

عدل وانصاف کے عالمی تناظر میں دیکھنے اور پیش کرنے کے بہت سے نمونے پیش کردیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی تاریخ کو جدید نقطۂ ہائے نظر سے مرتّب کرنا اور احادیث، اسناد، روایات اور اجماع اُمت کی مختلف اور منتشر مثالوں کو مجتمع کرکے نتائج کا اخذ کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ چوں کہ اس غیر معمولی انداز مطالعہ کی داغ بیل ڈالنے والوں میں ایک اہم نام مفتی محمد ظفیر الدین کا ہے اس لیے ان کے کام کے زمانی تقدم کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ روز بہ روز اس اندازِ مطالعہ کی جہات میں اضافہ ہورہا ہے اور اس انداز نے اسلامی مطالعات کو عصری تناظر دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاید اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ماضی قریب میں اردو کتب ورسائل کی صورت میں اس نوع کے منظّم سلسلے کو سامنے لانے میں نقوش (لاہور) کے قرآن نمبر اور رسول نمبر نے اہم رول ادا کیا تھا۔

بہار اور اڑیسہ میں نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اسلامی احکام شریعہ کے مطابق عدلیہ نظام قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہے، جسے امارت شرعیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کا یہ غیر معمولی امتیاز تھا کہ انھوں نے امارت شرعیہ کو آغاز سے لے کر نقطۂ عروج تک احکام شرعیہ کے نفاذ کا وسیلہ بنانے کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ اس ادارے میں دارالقضاء کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مسلمانوں کے عائلی نظام اور ازدواجی رشتے کے نشیب وفراز کے علاوہ تقسیم وراثت اور دوسرے عملی مسائل کے ضمن میں دارالقضاء نے اَن گنت پیچیدہ معاملات کو مذہبی اور اخلاقی سطح پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی کوئی اور مثال آزاد ہندوستان تو دور کی بات ہے گذشتہ کئی سو سال کی ہندوستانی تاریخ میں مشکل سے تلاش کی جاسکتی ہے۔ ایک تکثیری ملک میں جہاں سیکولرزم کو روشن خیالی کی واحد علامت سمجھا جاتا ہو، کسی خاص مذہب سے وابستہ افراد کے لیے ملکی عدلیہ کے متوازی غیر متنازعہ فیہ انداز میں شرعی فیصلوں کے نفاذ کی راہیں نکالنا، امارت

شرعیہ کا سب سے بڑا کارنامہ رہا ہے۔

مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے نظری اور عملی دونوں سطحوں پر امارت شرعیہ کے نظریاتی جواز اور عملی کارکردگی کو تحریری شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے دارالقضاء کے فیصلوں کو بھی مرتب کیا اور نظریاتی سطح پر اپنی کتاب ''امارت شرعیہ، کتاب وسنت کی روشنی میں'' کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر اصولی نوعیت کے متعدد مضامین لکھے۔ اس طرح ان کی کاوشوں کے وسیلے سے امارت شرعیہ کی اصولی ضابطہ بندی پر مبنی تحریریں بھی سامنے آئیں اور دارالقضاء کی کارکردگی کی منضبط تاریخ بھی منظرعام پر آگئی۔ مفتی صاحب نے سیرۃ النبی سے متعلق 'مصائب سرورکونین' اور 'اسوۂ حسنہ' نامی کتابیں لکھیں تو لوگوں کو خیال ہوا تھا کہ سیرۃ النبی پر ہزاروں کتابوں کی موجودگی میں یہ کتابچے کیا اضافہ کرپائیں گے؟ لیکن ان کتابچوں کا مطالعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا کہ مفتی ظفیر الدین صاحب روایتی سے روایتی موضوعات میں بھی کبھی اپنی نکتہ آفرینی کے سبب اور کبھی اپنے اسلوب تحریر کی بدولت کیوں کر نت نئے گوشے پیدا کرسکتے ہیں۔ راقم الحروف نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام ضرور سنا تھا۔ جب مولانا گیلانی پر مفتی صاحب کی کتاب 'حیاتِ گیلانی' پڑھنے کا موقع ملا تو صحیح معنوں میں ان کے علمی کاموں کی اہمیت اور قدر وقیمت واضح ہوئی۔ اس کتاب میں جس طرح سوانحی حالات کو تحقیق وتجسّس کے ساتھ تجزیاتی انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے سبب مفتی صاحب کی کتاب کو مولانا گیلانی کی شخصیت پر آج تک بنیادی حوالے کی حیثیت حاصل ہے۔

مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کی محولہ بالا علمی کاوشوں کو جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ ان کی سادگی اور بے نیازی کے باعث اس قدر نمایاں ہونے کا موقع نہیں ملا جو ان کا حصہ تھا۔ تاہم ان کی سادگی ہی ان کے بے لوث رشتوں اور

غیر ریاکارانہ انداز زندگی کی غماز بھی تھی۔ راقم الحروف کے ساتھ ان کو کچھ ایسا تعلق خاطر رہا جیسا کسی عزیز ترین شاگرد کے ساتھ ہوسکتا تھا، جو بسا اوقات دوستانہ بے تکلفی اور غیر معمولی اپنائیت میں تبدیل ہوجایا کرتا تھا۔ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر ابوبکر عباد، برسہابرس علی گڑھ میں زیر تعلیم رہے۔ ان کی کارکردگی کی فکر انھیں ہمیشہ لاحق رہا کرتی تھی۔ عبادمیاں کچھ عرصہ علی گڑھ میں عارضی استاد رہ کر بہت موقعے سے دہلی یونیورسٹی میں لکچرر ہوگئے۔ مفتی صاحب انھیں کم از کم اس منصب پر ضرور فائز دیکھنا چاہتے تھے سو یہ دیکھنے کے بعد ہی انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وہ عبادمیاں کے اندازِ زندگی سے کسی قدر شاکی بھی رہا کرتے تھے مگر میں نے ہمیشہ ان کی دل بستگی کی اور ڈھارس بندھائے رکھی۔ مفتی صاحب، کسی موقع پر میری غیر موجودگی میں میرے گھر گئے اور والدین سے ملے تھے۔ مجھے اس کی رسمی تفصیلات بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔ مگر اس سفر میں میرے والدین کی طرف سے کی گئی پذیرائی اور تواضع نے ان کے دل پر دیرپا اثرات ثبت کیے تھے۔ سو مجھ سے اکثر اس کا احوال مبالغے کے ساتھ بتاتے اور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ میں جب بھی انھیں یاد کرتا ہوں تو میرے دل و دماغ پر ان کی شفقت و محبت کا نقش، پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

●●●

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کی علمی و دینی خدمات

مولانا عتیق احمد بستوی☆

جب سے ہوش و خرد سنبھالا اور علمی دنیا سے شناسائی شروع ہوئی حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین کا نام ذہن کے پردے پر نقش پاتا ہوں، مدرسہ نورالعلوم بہرائچ کی جمعیۃ الطلبہ کی لائبریری میں پابندی سے آنے والے تین رسائل تھے (۱) معارف اعظم گڑھ (۲) برہان دہلی (۳) الفرقان لکھنؤ، ندوۃ المصنفین دہلی کے آرگون ماہنامہ برہان میں جن حضرات کے مضامین کثرت سے شائع ہوتے تھے ان میں حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحب بھی تھے، یاد پڑتا ہے کہ سب سے پہلے مفتی صاحب کا نام اسی رسالہ میں پڑھا، اسی رسالہ میں ندوۃ المصنفین کی فہرست مطبوعات میں حضرت مفتی صاحب کی بعض تصنیفات (مثلاً اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام عفت وعصمت) کا ذکر اور تعارف بھی پڑھا، حضرت مفتی صاحب کے اسلوب تحریر میں جاذبیت محسوس ہوئی، ان کا اسلوب نگارش سادہ وشستہ ہونے کے ساتھ ادب وانشاء کی چاشنی بھی لیے ہوئے تھا، ان کی تحریر میں نہ گھن گرج تھی نہ بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار لیکن ان کے سادہ اسلوب میں بلا کی ادبیت اور جاذبیت تھی، ان کی تحریریں سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں، اس وقت ماہنامہ برہان دہلی (جواب مرحوم ہوچکا ہے) حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کی ادارت میں بڑی آن بان کے ساتھ نکل رہا تھا، وہ معارف اعظم

☆ استاذ حدیث وفقہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ؛ سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی، دہلی

گڑھ کی ٹکر کا شمار ہوتا تھا، اس میں مضمون کی اشاعت مضمون کے معیاری ہونے کی شہادت شمار ہوتی تھی، مفتی صاحب برہان کے کہنہ مشق مضمون نگاروں میں تھے، ان کی متعدد کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوکر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرچکی تھیں، اسلامیات پر جدید اسلوب میں لکھنے والوں میں حضرت مفتی صاحب کا شمار ہوتا تھا۔

احقر ۱۹۷۰ء میں تعلیم کی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند پہنچا، اس وقت حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں ذمہ دارانہ منصب پر فائز تھے، کتب خانہ کے ناظم حضرت مولانا سلطان الحق بجنوری صاحب تھے لیکن غیر درسی کتابوں کا شعبہ حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب کی نگرانی میں تھا، مفتی صاحب حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ صاحب کے فتاویٰ کی ترتیب کا کام بھی انجام دے رہے تھے، کتب خانہ دارالعلوم کے مخطوطات کا تعارف بھی مرتب فرمارہے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں بار بار حاضر ہونے اور ان سے تبادلۂ خیالات کے ذریعہ علمی استفادہ کا موقع ملا تو محسوس ہوا کہ مفتی صاحب مرنجا مرنج شخصیت کے مالک ہیں اور ان کا مطالعہ ہمہ جہت ہے، ان سے اسباق متعلق نہیں تھے لیکن علمی ذوق رکھنے والے بہت سے محنتی اور حوصلہ مند طلبہ ان سے وابستہ رہتے تھے اور تحقیق و مطالعہ، تحریر و انشاء پردازی کے سلسلے میں ان سے مشورہ کیا کرتے تھے، طلبہ کے ساتھ ان کا رویہ مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوتا تھا۔ ۱۴۱۱ھ میں راقم اور مفتی صاحب نے حج بیت اللہ ساتھ کیا تھا۔ یہ سفر بڑا خوش گوار اور متبرک تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے کچھ ہونہار اور ذہین طلبہ نے تصنیف اور مضمون نگاری کی مشق کے لیے ایک انجمن قائم کررکھی تھی، جس کا سرپرست حضرت مفتی صاحب کو مقرر کیا تھا، یہ انجمن ماہانہ ایک پروگرام منعقد کرتی تھی جس میں بعض طلبہ کسی موضوع پر تیاری کے ساتھ لکھ کر مقالہ پڑھتے تھے، مفتی صاحب نشست کی

صدارت فرماتے تھے اور طلبہ کو قیمتی مشوروں اور نصائح سے نوازتے تھے، مفتی صاحب کی تربیت سے طلبہ میں تالیف اور مضمون نگاری کی صلاحیت پروان چڑھتی تھی، باقاعدہ مدرس نہ ہونے کے باوجود طلبہ میں ان کا احترام طبقۂ علیا کے مدرسین سے کم نہ تھا، خصوصاً علمی ذوق و مزاج رکھنے والے طلبہ مفتی صاحب سے بہت متعلق اور مانوس تھے۔

کتب خانہ میں حضرت مفتی صاحب کے پاس اکثر باہر سے آنے والے اہل علم، دارالعلوم کے بعض اساتذہ یا طلبہ بیٹھے ہوتے اور علمی گفتگوئیں ہوتیں، حضرت مفتی صاحب آنے والوں کی علمی رہنمائی فرماتے اور انھیں مختلف کتابوں کی نشان دہی کرتے، کتب خانہ کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کی بیٹھک رسالہ دارالعلوم کے دفتر میں بھی ہوا کرتی تھی، اس زمانہ میں رسالہ دارالعلوم کے ایڈیٹر تو علامہ انورشاہ کشمیری کے بڑے صاحب زادے جناب مولانا ازہر شاہ قیصرؒ صاحب تھے جو ادب و انشاء اور سوانح نگاری میں بڑا کمال رکھتے تھے لیکن رسالہ دارالعلوم کا اداریہ حضرت مفتی ظفیر الدین مفتاحی صاحبؒ لکھا کرتے تھے، رسالہ دارالعلوم کے آفس میں اِن حضرات کی بڑی بے تکلف مجلسیں ہوا کرتی تھیں جن میں ان دونوں حضرات کے علاوہ ادبی اور تصنیفی ذوق رکھنے والے اور بھی متعدد حضرات شریک ہوا کرتے تھے، کبھی ہم جیسے بعض طلبہ بھی کسی بہانے وہاں پہنچ جاتے اور ان مجالس کی دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔

حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب کا قیام دارجدید کے شمالی حصہ میں ایک بالائی کمرہ میں مدنی گیٹ کے قریب تھا، حضرت مولانا حسین بہاریؒ جو درجہ علیا کے اساتذہ میں تھے ان کا قیام بھی اسی سے قریب دارجدید شرقی بالائی کے ایک کمرہ میں تھا، یہ دونوں حضرات دیوبند میں فیملی کے ساتھ نہیں رہتے تھے، ان دونوں کی فیملیاں ان کے وطن میں تھیں، دارالعلوم میں ان کی رہائش تنہا تھی، ان دونوں میں بھی

کافی ذہنی مناسبت تھی، بے تکلفی کے باوجود ایک دوسرے کا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے خاص تصنیفی سلیقہ عطا فرمایا تھا، انھوں نے زیادہ تر ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر طبقۂ علماء میں لکھنے والے بہت کم تھے، بہت محنت سے ان موضوعات پر مواد جمع کیا اور بڑے سلیقہ سے سادہ اسلوب میں انھیں مرتب فرمایا، مفتی صاحب کثیر التصانیف علماء میں ہیں ان کی تقریباً پچاس تصانیف ہیں، جن میں بعض غیر مطبوعہ ہیں اور بعض قیمتی مسودے ایک افسوس ناک حادثہ میں ضائع ہوگئے۔

مولانا کی ابتدائی کتابیں ''اسلام کا نظام مساجد'' ''اسلام کا نظام عفت و عصمت'' وغیرہ ان کے تصنیفی کمالات کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کسی موضوع پر تصنیف شروع کرنے سے پہلے وہ اپنے بعض اساتذہ (خصوصاً حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ) اور اکابر اہل علم (حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہ) سے زبانی اور تحریری مشورہ طلب کرتے اور ان کے مشوروں کی روشنی میں اپنے تصنیفی کاموں کو بہتر سے بہتر بناتے جیسا کہ ان کی کتاب ''مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے'' میں شامل خطوط سے واضح ہوتا ہے۔

حضرت مفتی صاحب کا اسلوب نگارش بڑا سادہ، سبک اور پرکشش ہے، مفتاح العلوم مئو میں حصول تعلیم ہی کے زمانہ سے انھیں علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور اردو کے دوسرے صاحب اسلوب مصنفین کی کتابیں اور مضامین پڑھنے اور ان کا اسلوب اخذ کرنے کا شوق تھا، جس کا اثر خود ان کے اسلوب تحریر پر پڑا۔

حضرت مفتی صاحب کی دو اہم ترین کتابیں (اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام عفت وعصمت) اس دور کی یادگار ہیں جب موصوف دارالعلوم دیوبند آنے سے پہلے بہار کے ایک گمنام مدرسہ ''مدرسہ معینیہ سانحہ ضلع مونگیر'' میں استاذ تھے، یہ دونوں کتابیں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئیں۔

اسلام کا نظام مساجد تصنیف فرماتے وقت مفتی صاحب کو یہ فکر سوار تھی کہ یہ کتاب کیسے اور کہاں سے شائع ہوگی، ایک نئے قلم کار کے لیے جس کا ابھی علمی حلقوں میں تعارف نہ ہو اپنی ابتدائی تصنیف شائع کرانے کا مرحلہ بڑا سخت ہوتا ہے، ملک کی تقسیم کے بعد حالات کی ابتری کی وجہ سے طباعت کتب کا مسئلہ اور مشکل ہوگیا تھا، غالباً اس کا ذکر مفتی صاحب نے مولانا گیلانی کے نام کسی مکتوب میں کیا، اس کے جواب میں مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں اور کتنے طاقت ور اسلوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''.....آپ سے پھر عرض کروں گا کہ حق تعالیٰ نے آپ کے اندر تصنیف وتالیف کا داعیہ جب پیدا کیا ہے اور ماشاء اللہ خدمت علم ودین کے اس شعبے کے ساتھ فطری مناسبت بھی آپ رکھتے ہیں تو آپ کا فرض صرف یہ ہے کہ لکھے جایئے، قرآن کا قانون ہے ''واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض'' اگر نافع کتاب قلم سے نکلے گی تو زمین پر ٹھہرانے کا نظم قادر قیوم کی طرف سے کیا جائے گا۔ ''واما الزبد فیذھب جفاء'' کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا کام ''الزبد'' کے نیچے درج ہورہا ہے یا ''ما ینفع الناس'' میں مندرج ہے، الزبد کو چاہیے کہ مٹ ہی جائے ہمارے اکابر نے عہد مطابع سے پہلے کتابیں لکھیں اور لکھ کر چلے گئے، جو ما ینفع الناس کی صفت سے موصوف ہیں دنیا ان کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر شائع کررہی ہے اور اسی کے مقابلے میں برساتی کیڑوں کی طرح الزبد کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری ہے، مگر حال کیا ہے، چھپتی ہیں اور غائب ہوجاتی ہیں۔ بس آپ کام کیے جایئے، چھپنے چھپانے کا درد سر نہ خریدیے''۔ (علمی مراسلات، ص ۸۴)

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب نے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی سوانح بہت دلچسپی اور محنت سے مرتب فرمائی ہے، مولانا گیلانی سے اپنے تعلق کا حق ادا کر دیا ہے، پوری کتاب بڑی شیفتگی اور وارفتگی سے لکھی گئی ہے، مولانا گیلانی کی جامع سوانح لکھ کر مفتی صاحب نے برصغیر کے اہل علم کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کیا ہے۔

ماضی قریب کے علماء میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی البیلی شخصیت کے مالک ہیں، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نے اپنے تعزیتی مکتوب بہ نام حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین میں مولانا گیلانی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''حضرت مولانا گیلانی مرحوم کی رحلت سے بزم علم وعمل ویران ہوگئی۔ ان جیسی خصوصیات اور کمالات کا عالم دین اب ڈھونڈے نہیں ملے گا۔ وہ اپنے زمانے کے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیّم، ابن خلدون، ابن خلکان سبھی کچھ تھے، ان کی ذات میں ابن تیمیہ اور شیخ اکبر دونوں کی روحیں مجتمع ہوگئی تھیں۔ وہ مجدد الف ثانی بھی تھے اور شیخ عبدالحق محدث بھی، زندہ دل، روشن ضمیر، پاک نہاد اور پاک باطن، مجسمۂ خلق اور پیکر مروت، فیض بخش وفیض رساں، شہید علم اور زاہد شب زندہ دار تھے''۔ (مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے، ص ۱۳۰)

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی سے مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کا بہت گہرا تعلق تھا جیسا کہ مفتی صاحب کے نام مولانا گیلانی کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے، انھوں نے خطوط اور زبانی افادات کے ذریعہ حضرت مفتی صاحب کی بڑی ہمت افزائی اور رہنمائی فرمائی، تحریر وتصنیف کے بڑے گر بتائے، لکھنے کے لیے بہت سے موضوعات کی نشان دہی فرمائی۔ مفتی صاحب کے متعدد مسودات پر نظر

ثانی فرمائی اور ایک کہنہ مشق مصنف کی طرح انھیں بڑے قیمتی مشورے دیے، مفتی صاحب کے نام مولانا گیلانی کے خطوط اس قابل ہیں کہ ہمارے ہونہار نوجوان فضلاء جنھیں تحقیقی اور تصنیفی کام کرنے ہوں غور سے بار بار پڑھیں۔

فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب

مفتی ظفیر الدین صاحب کا ایک بڑا کام بلکہ کارنامہ فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب ہے، دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب کا تقرر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے افکار کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے کیا گیا تھا، چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی تصنیف کی، جو'' جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' کے نام سے شائع ہوئی، مفتی صاحب کا دارالعلوم میں تقرر غالباً ۱۹۵۶ء میں ہوا، نو مہینہ کے بعد انھیں دارالافتاء منتقل کر دیا گیا اور فتوی نویسی نیز ترتیب فتاویٰ کی خدمت ان کے ذمہ کر دی گئی اور یہ ان کی زندگی کا لازمہ بن گئی، دارالعلوم دیوبند کے پہلے باقاعدہ مفتی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے فتاویٰ کی ترتیب سے انھوں نے کام کا آغاز کیا۔

پرانے بوسیدہ رجسٹروں سے فتاویٰ کو نقل کرنا، انھیں موضوعات کے اعتبار سے مرتب کرنا اور ہر فتویٰ کے لیے حاشیہ کتاب میں مستند حوالوں کا اندراج آسان کام نہیں تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے عبادت سمجھتے ہوئے اس عظیم کام کو انجام دیا، فتاوی دارالعلوم کی بارہ جلدیں حضرت مفتی صاحب کی ترتیب وتحقیق کے ساتھ دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئیں اور علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ یہ کام مستقل تصنیف سے زیادہ محنت طلب ہے، حضرت مفتی صاحب کی عمر عزیز کا بڑا حصہ اس کام میں صرف ہوا، افسوس ہے کہ حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دارالعلوم دیوبند سے علیٰحدگی کے کچھ

دنوں بعد انتظامیہ کی طرف سے یہ کام موقوف کرادیا گیا، جس کا حضرت مفتی صاحب کو بہت قلق تھا، بار بار اس کا اظہار فرماتے تھے۔

ترتیب فتاویٰ کا کام اس عنوان سے روکا گیا کہ اس میں علمی خامیاں ہیں، لیکن بہ ظاہر ایسا نہیں ہوا کہ ان خامیوں کا ازالہ کرکے کام کو جاری رکھا جاتا، نتیجہ یہ ہوا کہ علمی دنیا اس خیر کثیر سے محروم ہوگئی، ابھی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاویٰ کا بڑا حصہ تشنۂ ترتیب وتحقیق واشاعت ہے، دوسرے مفتیان عظام کے فتاویٰ کی بات کیا کی جائے۔ضرورت اس کی تھی کہ ایک دو کہنہ مشق مفتیان کرام کی نگرانی میں جنھیں تصنیف وتالیف کا بھی اچھا ذوق ہو ہونہار حوصلہ مند باصلاحیت نوجوان فضلاء کی ایک ٹیم سے ترتیب فتاویٰ کا کام لیا جائے تاکہ فتاویٰ کا یہ عظیم ذخیرہ جو پرانے رجسٹروں میں بوسیدگی اور اندراس کا شکار ہورہا ہے شائع ہوکر وقف عام ہوجائے اور دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمتِ دین کا ایک باب اجالے میں آئے۔ان فتاویٰ سے استفادہ عام ہو۔

حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب کی عمومی شہرت زیادہ تر فتاویٰ دارالعلوم سے ہوئی ، کیوں کہ فتاویٰ دارالعلوم کی بڑی اشاعت ہوئی، اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن آتے رہے جہاں جہاں بھی علمی ادارے اور علماء ہیں یہ کتاب موجود ہے، بہت سے عام لوگ بھی اس کتاب کو اپنے پاس رکھتے ہیں، کیوں کہ اس سے روزمرہ کے مسائل جاننے میں سہولت ہوتی ہے۔

مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کے فتاویٰ

دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء کے رجسٹروں میں خود حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کے فتاویٰ کی بہت بڑی تعداد محفوظ ہے،مختلف ادوار میں مفتی صاحب نے دارالعلوم میں فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دی ہے اور ملک و بیرون

ملک مفتی دارالعلوم دیوبند کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی ہے، دارالعلوم دیوبند میں برپا ہونے والے انقلاب کے بعد جب حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کو دارالعلوم سے یکسو کردیا گیا، ترتیب فتاویٰ کا کام حضرت مفتی صاحب سے لے لیا گیا اور انھیں دارالافتاء میں مفتی کی حیثیت سے بحال کردیا گیا اس کے بعد اخیر عمر تک فتویٰ نویسی حضرت مفتی صاحب کا بنیادی کام تھا، یہ عرصہ بھی کافی طویل ہے، دو دہائیوں (بیس سال) سے زیادہ ہی ہے، لہٰذا مفتی صاحب کے اس دور کے فتاویٰ کی تعداد کئی ہزار ہوگی۔

مفتی صاحب کے فتاویٰ کو مرتب کرانے اور ان پر علمی کام کرانے کی ضرورت ہے، یہ فتاویٰ ان کے تفقہ اور علمی بصیرت کے آئینہ دار ہوں گے۔

تدوین قانون اسلامی میں حضرت مفتی صاحب کا حصہ

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں علماء ہند کی ایک عظیم دینی خدمت ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' کی تدوین ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے یہ کارنامہ انجام پایا، شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے مخالف اسلام فیصلہ کے بعد تحفظ شریعت کی زبردست مہم چلائی گئی، بورڈ کی طرف سے پورے ملک میں عظیم الشان جلسے اور کانفرنسیں کی گئیں اور منحوس فیصلہ کے برے اثرات ختم کرنے کے لیے پارلیمنٹ میں ''تحفظ حقوق مسلم مطلقہ'' کے نام سے ایک قانون پاس کرانے کی کوشش کی گئی، اس کام کے لیے بورڈ کے ذمہ داران (صدر بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، جنرل سکریٹری بورڈ حضرت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی) کو متعدد بار ملک کے وزیر اعظم جناب راجیو گاندھی اور وزیر قانون وغیرہ سے ملاقاتیں کرنی پڑیں، ان ملاقاتوں میں راجیو گاندھی نے اس طرف متوجہ کیا کہ اگر بورڈ کی طرف سے مسلم پرسنل لا کے بارے میں اسلامی قوانین کو دفعہ وار مرتب کرادیا جائے تو ججز

کو فیصلوں میں آسانی ہو اور انھیں گائڈ لائن مل جائے۔

اس وقت سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے دل و دماغ پر یہ کام سوار ہوگیا اور انھوں نے بورڈ کے اثرات اور اپنے ذرائع کا استعمال کرتے ہوئے اس نازک اور اہم کام کا آغاز کردیا، اس کے بعد کام کے مختلف مراحل کی تفصیل حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ کے قلم سے پڑھیے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ مجموعۂ قوانین اسلامی کا نقش اول تقریباً چھ ماہ کے عرصہ میں مرتب کیا بلکہ اس کام کے اکثر مراحل میں پورے طور پر شریک رہے، تحریر فرماتے ہیں:

''راجیو گاندھی سے مسلم پرسنل لا کے مجموعہ کا نام آیا تو حضرت امیر شریعتؒ نے دفعہ وار تدوین قانون اسلامی کا عزم کرلیا، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب مدظلہ کو خط لکھا پھر گفتگو کی کہ آپ محمد ظفیر الدین کو چند مہینے کے لیے دے دیں، تاکہ ان سے تدوین قانون اسلامی کا کام لے سکوں، خود خاکسار کو بھی لکھا کہ یہ صورت آپ قبول کرلیں اور آمادہ ہوکر مونگیر آجائیں، مہتمم صاحب مولانا مرغوب الرحمٰن زید مجدہ کی منظوری لے کر میں مونگیر پہنچا۔

مولانا نے میرے سامنے نقشہ رکھا کہ ہدایہ، عالمگیری اور دوسری فقہی کتابیں سامنے رکھ کر کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الہبہ، کتاب الوقف، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض کو دفعہ وار لکھ کر میرے سامنے پیش کریں، میں نے اپنی وسعت بھر محنت سے ان تمام ابواب کو دفعہ وار لکھ کر پیش کیا، اس کے حوالے بھی لکھے، اب اساتذہ کی مجلس بنائی، جس میں یہ تدوین فقہ دفعہ وار پہلے پڑھی جاتی، بحث ہوتی، پھر حضرت امیر شریعت اپنے الفاظ میں اس کو لکھواتے، اس طرح یہ مجموعہ جب تیار ہوگیا تو اسی پر اکتفا

نہیں کیا، بلکہ اس سے بڑی مجلس بنائی، دیوبند سے مفتی احمد علی سعید، ندوہ سے مولانا برہان الدین، امارت شرعیہ سے مولانا مجاہدالاسلام، جامعہ رحمانی سے مفتی نعمت اللہ اور مولانا صغیر احمد رحمانی کو اس مجلس کا رکن خصوصی بنایا، مولانا محمد زبیر صاحب اور محمد ولی رحمانی صاحب کو بھی شریک ہونے کی دعوت دی گئی، اس بڑی مجلس میں اب حضرت مولانا کے الفاظ پڑھے جاتے اور بحث کی جاتی اور کاٹ پیٹ ہوتی، مولانا کی طرف سے حصہ لینے کی پوری آزادی تھی، دوسرے مفتیان کرام اکثر وبیش تر شریک ہوتے، میرا اندازہ ہے کہ یہ مسودہ کم از کم تین دفعہ پڑھا گیا اور اس میں ترمیم ہوئی، پھر جاکر وہ مرتب ہوا''۔ (تاریخی حقائق، جلد اول، ص ۴۲۰-۴۲۱)

مجموعۂ قوانین اسلامی کی اشاعت

مجموعۂ قوانین اسلامی کی تدوین کا کام بالکل آخری مراحل میں تھا کہ امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کا انتقال ہوگیا، ان کی حیات میں یہ مجموعہ تیار ہوکر شائع نہیں ہوسکا، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ جو اس دور میں صدر بورڈ تھے، انھوں نے بار بار کوشش فرمائیں کہ مجموعۂ قوانین اسلامی کا مسودہ فائنل ہوکر چھپ جائے لیکن بعض رکاوٹوں کی وجہ سے ان کی حیات میں یہ کام انجام نہ پاسکا، بالآخر فقیہ الملت حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ صاحب کے دور صدارت میں یہ کام تکمیل کو پہنچا اور اس مجموعہ کی آخری خواندگی جو اشاعت سے پہلے ماہ اکتوبر ۲۰۰۰ء میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے مرکزی دفتر دہلی میں کئی روز تک ہوئی اس میں مکمل شرکت کی سعادت احقر کو بھی حاصل ہوئی، مجموعۂ قوانین اسلامی

کی پہلی اشاعت مئی ۲۰۰۱ء میں ہوئی، اس کا انگریزی ترجمہ بھی حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے دور صدارت میں بورڈ کے مرکزی آفس سے شائع ہوا، بہرحال مجموعۂ قوانین اسلامی کا نقش اول حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب نے تیار کیا تھا اور اس میں اپنی علمی وفکری توانائیاں نچوڑ دی تھیں لہٰذا ان کے مسودہ میں کتنا ہی حک و فک، حذف و اضافہ کیا گیا ہو اس نقش اول کا کریڈٹ ان کو جاتا ہے، انشاءاللہ ان کی یہ عظیم دینی خدمت ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بنے گی۔

حضرت مفتی صاحب اور فقہ اکیڈمی انڈیا

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ مجمع الفقہ الاسلامی الہند (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) کے مؤسسین میں سے تھے، مرکز البحث العلمی اور مجمع الفقہ الاسلامی کے نام سے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اہل علم وفقہ کا جو کارواں ترتیب دیا تھا اس میں مفتی صاحب کی حیثیت ایک بزرگ ممبر کی تھی، حضرت قاضی صاحب ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور ان کی رائے کو کافی اہمیت دیتے تھے، حضرت مفتی صاحب کا مزاج تواضع وانکساری کا تھا وہ اپنے خوردوں کے ساتھ شفقت و اکرام کا معاملہ فرماتے تھے، نوجوان علماء کی قدر دانی اور ہمت افزائی کرتے تھے اس لیے ان کی ذات طبقہ علماء اور اصحاب افتاء میں اجتماعیت اور شیرازہ بندی کا ذریعہ تھی۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کے تمام ہی سمیناروں اور اہم پروگراموں میں ان کی شرکت ہوتی تھی، سمیناروں میں زیر بحث مسائل پر مضامین اور تحریریں بھی لکھتے تھے جو بہت سلجھی ہوئی اور متوازن ہوتی تھیں، ان گنہ گار آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ مفتی صاحب نے دوسرا نقطۂ نظر اور اس کے دلائل سننے کے بعد اپنے نقطۂ نظر سے رجوع فرمایا اور سب کے سامنے اس کا اظہار فرمایا، یہ ہمارے بزرگوں کا وطیرہ

رہا ہے، ان کی حق پرستی نے ان میں غلطی کے اعتراف اور رجوع کرنے کی بڑی ہمت اور طاقت دی تھی۔

۲۰۰۲ء میں حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد فقہ اکیڈمی کا نیا دستور مرتب ہوا اور نیا انتظامی ڈھانچہ تشکیل پایا تو اکیڈمی کی صدارت کے لیے بالاتفاق حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کا نام طے پایا، جو بجا طور پر اس منصب کے مستحق تھے، ان کا دور صدارت اکیڈمی کے لیے مبارک ثابت ہوا، اکیڈمی کی تمام سرگرمیاں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رہیں اور فقہ اسلامی کا یہ کارواں ان کی صدارت میں پورے اتحاد اور یگانگت کے ساتھ سرگرم سفر رہا۔

مفتی صاحب کے دور صدارت میں متعدد سمینار منعقد ہوئے، آخری سمینار جس میں حضرت مفتی صاحب کی شرکت ہوئی برہانپور کا سمینار ۲۰۰۹ء تھا، اس میں ان کی تقریر بڑی رقت انگیز اور وداعیہ طرز کی تھی، انھوں نے فرمایا کہ مجھے محسوس ہورہا ہے کہ میرا وقت قریب آرہا ہے، اب میں شاید کسی سمینار میں شرکت نہ کرسکوں، آپ سب لوگ مجھے معاف کریں اور میرے لیے خاتمہ بالخیر اور مغفرت کی دعا کریں۔ مفتی صاحب کی پوری گفتگو بڑی اثر انگیز تھی اور سامعین نے محسوس کیا کہ حضرت مفتی صاحب دوسری کیفیت میں ہیں۔ موت کی دستک صاف محسوس کررہے ہیں اور ان کا سارا وجود فکر آخرت میں سمٹ آیا ہے اور وہ بہ زبان کہہ رہے ہیں:

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا
اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

مفتی صاحب مرحوم ہانسوٹ (گجرات) کے فقہی سمینار میں اپنی شدید علالت کے باوجود شریک نہیں ہوسکے اور ۳۱/ مارچ کو راہی ملک عدم ہوئے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں بلند درجات سے نوازے۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ

بحیثیت مفسر قرآن

مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی ☆

ہندوستان میں جن علماء اور دانشوروں نے قرآن او رعلوم قرآن کی خدمت کی، ان کی ترویج و اشاعت اور تفسیر وتشریح میں وقت لگایا ان میں حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دامت برکاتہم مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند بھی تھے، آپ وسیع المطالعہ اور کثیر التصانیف تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے بعض مدارس میں داخلِ نصاب ہیں، آپ کے سیکڑوں تلامذہ اور فیض یافتگان ہیں، جو اپنی اپنی جگہ انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر آپ کا علمی پَرتو نظر آتا ہے، یوں تو آپ کو علمی حلقوں میں بحیثیت ادیب، مفتی اور مجاہد آزادی کی حیثیت سے جانا جاتا ہے مگر آپ کا ایک علمی کام جس پر سارے علوم دینیہ کی بنیاد ہے، جو دین اور شریعت اسلامیہ کا اصل اصول ہے یعنی قرآن پاک اور اس کے معانی و تفاسیر کی خدمت۔ وہ اہل علم سے مخفی ہے۔ حالاں کہ جس طرح آپ اچھے خطیب، ماہر استاذ، ادیب اور بہترین مصنف تھے، اسی طرح اللہ پاک نے آپ کو علمِ تفسیر کا وافر حصہ عطا کیا تھا، آپ کا معمول تھا کہ قرآن پاک بہت غور سے پڑھتے تھے اور اس میں غور وفکر کرکے اس کے معانی اور نکات کو نکال کر امت کے سامنے پیش کرتے اور قرآن

☆ سندر پور، دربھنگہ

پاک سے استفادہ کی راہ آسان کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب مشاہیر علماء ہند خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اور علمی معاملات میں ان سے مشورہ اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ مفتی صاحب نے جب قرآن کے درس کا سلسلہ شروع کیا تو اس سلسلہ میں بھی ان سے رجوع کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں درس قرآن کا باقاعدہ ارادہ فرمایا اور اس کی اطلاع سید صاحب کو دی اور اس سلسلہ میں رہنمائی طلب کی کہ فجر کی نماز کے بعد لوگوں کو قرآن پاک کے معانی و تفاسیر بتانے ہیں۔ لہٰذا کیسی باتیں ان کے سامنے بیان کی جائیں اور کن باتوں کی وضاحت کی جائے اور اس کے لیے کون کون سی کتابیں معین ومفید ہونگی۔ حضرت سید صاحبؒ نے جواب دیا ''آپ درسِ قرآن شروع کریں اللہ برکت دیں گے'' ''درسِ قرآن دیں، سیدھے سادے طریقے سے بیان کردیں اللہ تعالیٰ انشاء اللہ فائدہ دیں گے، ترجمہ اور تسہیلِ مطالب پر اکتفاء کریں، حلال وحرام اور احکام بیان کریں اور قناعت واستغناء عن الخلق پیش کریں'' وہو الرزاق ذوالقوۃ المتین'' تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، تفسیر بیان القرآن مولانا تھانویؒ، حدیث مشکوٰۃ لے لیں''۔

حضرت مفتی صاحب نے سید صاحب کی اس قیمتی رہنمائی کو پوری قوت سے پکڑا اور خوب محنت ومطالعہ سے یہ سلسلہ جاری رکھا پھر سید صاحب کو اس کی خبر دی تو مزید رہنمائی فرمائی اور لکھا: ''مبارک ہو کہ سلسلۂ درس قرآن جاری ہے، نظری اور علمی بحثوں سے عملی پہلوؤں پر جن سے مسلمانوں کے ایمان وعمل کی قوت میں ترقی ہو زیادہ زور دیں'' ایک جگہ اور لکھا کہ ''آپ کے درس قرآن پاک کا سلسلہ جاری ہے اس کو ضرور جاری رکھیں''۔

حضرت مفتی صاحب نے زمانۂ طالب علمی میں تفسیر سے اپنے شغف کا حال اس طرح بیان کیا ہے کہ جب جلالین شریف پڑھ رہا تھا اس کے ساتھ تفسیر

معالم التنزیل بالاستیعاب پڑھتا (اس زمانہ میں جو تفسیر مجھے دستیاب تھی اس میں بہترین معالم التنزیل تھی) اور ہر ہر آیت کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا۔

حضرت مفتی صاحب کی علم تفسیر میں محنت اور علامہ سید سلیمان ندوی کی رہنمائی رنگ لائی اور آپ تفسیر کے موضوع کو سمیٹتے اور ہضم کرتے چلے گئے۔ آپ کا طریقہ درس یہ تھا کہ جن آیات کی تفسیر بیان کرتے اسے لکھ بھی لیتے تھے۔ چنانچہ ساف ستھرے سلیس طرز بیان میں اچھا خاصا تفسیری کام سانحہ کے قیام کے زمانے میں آپ کے پاس جمع ہو چکا تھا۔ مگر افسوس کہ قلت اسباب کی وجہ سے وہ تفسیر چھپ نہیں سکی اور بعد میں دارالعلوم کے ہنگامے میں وہ علمی وراثت لٹ گئی جس کا افسوس ہم طلباء کو تو تھا ہی حضرت والا بھی صدمے سے اسے بیان کرتے تھے اور رنج وغم کا اظہار فرماتے تھے۔ یہ علمی خسارہ علمی ادارہ میں ہوا۔

دارالعلوم دیوبند میں تقرری کے بعد آپ نے بہت ساری مشغولیات کے ساتھ ساتھ قرآن پاک سے وابستگی برقرار رکھی، اس موضوع پر اپنے قلم کو ہمیشہ جاری رکھا، جس کا نتیجہ درس قرآن کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسی خصوصیت کی بنا پر آپ دارالعلوم دیوبند کے مطالعۂ علوم قرآنی کے ذمہ دار بھی بنائے گئے۔

اسلاف کے ترجمے اور ان کی تفسیر میں جو علمی نکات ہیں وہ ہر خواص وعوام کی دسترس میں نہیں ہیں۔ حالاں کہ قرآن پاک ہادی اور رہنما ہے، اس کی رہنمائی کو امت کے ہر طبقے کے فائدہ کے قابل بنانا اکابر امت اور علمائے دین کی ذمہ داری ہے تاکہ ہر مسلمان اس سے تذکیر ونصیحت حاصل کرے اور اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرے، اسی خیال سے اس بڑے کام کو آپ نے کرنے کی کوشش کی، نہایت سلیس اور رواں دواں تفسیر ''درس قرآن'' کے نام سے ترتیب دی۔ اس میں آپ نے قدیم وجدید عربی واردو تفاسیر سے اخذ واستفادہ کیا۔ اس

تفسیر کا طرز یہ ہے کہ پہلے آیت قرآنی، اس کے نیچے تحت اللفظ شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ کا لفظی ترجمہ اور اس کے بعد مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بامحاورہ ترجمہ پھر آپ کی آسان تفسیری عبارت ہے، جس کے بارے میں ٹائٹل پر لکھا ہے ''(۱) عصر حاضر کے ذہن ومزاج کے پیشِ نظر تمام مستند اور معیاری تفاسیر کا عام فہم اور دل نشیں زبان میں بہترین خلاصہ اور جوہر، (۲) جس کی ترتیب میں تفسیر کبیر، تفسیر ابن کثیر، تفسیر مظہری، تفسیر روح المعانی، تفسیر موضح القرآن، تفسیر حقانی، بیان القرآن، حواشی شیخ الہند، تفسیر ماجدی اور ترجمان القرآن سے استفادہ کیا گیا ہے، ہر مسلمان مرد وعورت بالخصوص جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے ایمان آفریں، یقین افروز اور پیغام شفاء ہے، اسے بڑی عرق ریزی سے عوام کی سطح کا بنایا ہے اور ہر سورت یا مستقل مضمون سے پہلے ذیلی عنوان لگایا گیا ہے۔ اس کا طرز بہت انوکھا اور ندرت سے پُر ہے، اس کی ترتیب جدت لیے ہوئے، ایک مضمون کی چند آیتوں کو ایک جگہ لکھا ہے اور اس کے اوپر سرخی قائم کی ہے، اس کے تراجم، تفاسیر اور حاصل درس کے نام سے اس کی تلخیص کی ہے۔

واذاالسماء کشطت الی انه لقول رسول کریم، اس کی سرخی قیامت کا نقشہ ہے اور تفسیر سے پہلے ''نفع بخش سرمایہ'' ذیلی عنوان ہے اور اس میں قیامت کا نقشہ، جنت کا قریب لایا جانا، دوزخ کا دہکایا جانا اور لوگوں کو قیامت اور اپنے اپنے جزا اور سزا سے واقفیت کو مختصراً ذکر کیا ہے، پھر حاصلِ درس لکھا ہے ''اللہ عز وجل فرماتا ہے کہ تاروں کی حرکتیں کبھی ان کا آگے بڑھنا، کبھی پیچھے ہٹنا، کبھی سیدھے چلنا، رات کا آنا، صبح کا نمودار ہونا یقینی واقعات ہیں۔ اسی طرح وحی کا آنا بھی یقینی واقعہ ہے، یہ قرآن وحی ہے جسے ایک بڑے معزز قاصد جبرئیلؑ نے پڑھ کر سنایا'' حاصل درس میں وحی کو خاص طور سے دیکھے جانے والی چیزوں سے جو لوگوں کے لیے عین الیقین ہے وحی کے برحق اور ثابت ہونے پر کھلتا ہوا استدلال کیا ہے

چونکہ یہ سورت مکی ہے اور اس میں عمدہ نکتہ مذکور ہوتا ہے جسے مفتی صاحب وہاں تک پہنچ کر اس کے اشارے واضح کر کے امت کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

سورہ عبس کے تحت لکھا ہے کہ ترتیب کے لحاظ سے اس سورۃ کا عدد اسّی (۸۰) ہے اور مکہ کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی، اس میں اور اس کے بعد ساری سورتوں میں ایک ایک رکوع ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ مال و دولت، نام وری اور شہرت کے حاصل ہونے سے کوئی شخص قابل قدر اور لائق تعظیم نہیں ہوجاتا، قابل قدر انسان وہ ہے جو اپنی اصلاح کی فکر میں لگ جائے اور اچھی باتیں سیکھنے کی کوشش کرتا رہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قریش کے کچھ لوگ جو ان میں بڑے مال دار تھے اور بااثر سمجھے جاتے تھے، جمع تھے، اس وقت ایک نابینا صحابی کے آنے پر چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے، اس لیے یہ سورت تنبیہاً نازل ہوئی اور اس سورت کے تحت دو تین کلموں میں ہی جامع تلخیص کی ہے ''موضوع سورۃ مساوات فی التعلیم'' (۱ تا ۴) ترک مساوات فی التعلیم پر تنبیہ ہوئی (۵ تا ۷) ان نالائقوں کی خاص رعایت رکھنے کی ضرورت نہیں (۸ تا ۱۰) اس قسم کے شائق تعلیم سے بے توجہی نہیں ہونی چاہیے (۱۱-۱۲) اس تعلیم میں ہر شخص کا ایک حصہ ہے (۱۳-۱۴) صحف قرآن اس قدر بلند مرتبہ ہے (۱۵-۱۶) ان صحف کے محافظ ایسے پاکیزہ ترین فرشتے ہیں (۱۷) انکار کرنے والا ناشکرا ہے اپنے مبدأ اور معاد پر غور نہیں کرتا (۱۸-۲۰) سب کی پیدائش نطفہ سے ہے، اسی طرح اگر کسی مضمون میں کسی نبی کا ذکر خیر کیا گیا ہو تو چند سطروں میں ان کی سوانح اور کارنامے ذکر کرتے ہیں جس سے قاری بابصیرت ہو کر اس ذیل کی آیتیں بخوبی سمجھ سکے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کر کے اس کے پیدائش کے مقاصد میں ایک خلافت فی الارض بھی رکھا اور فرمایا: إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب، کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو (ترجمہ شیخ الہند)۔

ملائکہ کے اس خلجان کو مولانا شبیر عثمانیؒ نے اس طرح لکھا ہے ''ملائکہ کو جب خلجان ہوا کہ ایسی مخلوق جس میں مفسد اور خوں ریز ہوں گے، ہم ایسے مطیع اور فرماں بردار کے ہوتے ہوئے ان کو خلیفہ بنانا اس کی کیا وجہ ہے؟ تو بطور استفادہ یہ سوال کیا، اعتراض ہرگز نہ تھا، رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیوں کر معلوم ہوا، اس میں بہت احتمال ہیں، جنات پر قیاس کیا، یا حق تعالیٰ نے پہلے بتادیا تھا، یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا، یا سمجھ گئے کہ حاکم و خلیفہ کی ضرورت جبھی ہوگی جب ظلم و فساد ہوگا، یا حضرت آدمؑ کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں، ایسا ہی ہوا کہ بنی آدم کو جب بھی مصلحین سے دوری ہوئی بے راہ روی آئی اور بڑھتی گئی مگر رحیم و کریم ذات نے ہر زمانہ میں اس کمی کو پورا کیا، اس کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور انھیں اپنا پیغامبر بنا کر بھٹکے راہی کو راہ یاب کیا۔

اس سلسلہ کی اہم کڑی انبیاء بنی اسرائیل ہیں جن کے ذریعہ بنی اسرائیل کو ہدایت کا راستہ دکھایا اور بعثت نبویؐ سے پہلے اس بنی اسرائیل کا دین دین حنیف تھا مگر ان کے یہاں بھی بگاڑ آیا اور اس میں روز ترقی ہی ہوئی، راہ راست سے کافی دور جا پڑے تھے جس کا ذکر اللہ پاک نے سورۃ البینہ میں کیا ہے جس کا حاصل حضرت کے قلم سے اس طرح ہے:

> ''اس سے واضح کیا گیا ہے کہ دنیا میں دین دار اور بے دین دونوں کی حالت خراب ہوچکی تھی، یہود و نصاریٰ اور مشرک دونوں اللہ

تعالیٰ کا انکار کر بیٹھے تھے اور اپنے معبود الگ الگ بنا کر فرقوں میں
بٹ گئے تھے اور آپس میں لڑائی جھگڑوں اور فساد کا بازار گرم تھا،
کوئی عقل مند یا زور آور آدمی ایسا نہ تھا جو لوگوں کو سمجھا کر سیدھے
راستے پر ڈال دے، ایک فقط یہی صورت رہ گئی تھی کہ ایک مرتبے
والا عظیم الشان اللہ کا رسول آئے اور صاف ستھری آیتیں پڑھ کر
سنائے جن میں ساری پکی اور پختہ باتیں موجود ہوں، چنانچہ وہ
رسول آیا اور بات بالکل واضح ہوچکی، لیکن لوگ پھر بھی اپنی ضد
اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ویسے ہی فرقہ بندی اور جھگڑوں میں
پھنسے ہوئے ہیں حالاں کہ ان کو اتحاد کا گُر بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو
مانو، نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، یہی پختہ اور مکمل دین ہے، لیکن انھوں
نے اسے نہیں مانا، اب یہ اہل کتاب اور مشرک بھی سن لیں کہ وہ
بدترین مخلوق ہیں اور مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے دوزخ میں
داخل کردیے جائیں گے، ہاں جو لوگ ایمان لائے اور نیک
کاموں میں اس دنیا کے اندر لگے رہیں گے وہ بہترین مخلوق ہیں
انہیں مرنے کے بعد جنت ملے گی اور وہ اللہ سے اور اللہ اس سے
راضی ہوجائے گا اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے، نجات کا اصل ذریعہ
اللہ کا ڈر ہے''۔

یہ خلاصۂ تفسیر ہے اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طویل معانی کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بینہ تقریباً ایک صفحہ پر مشتمل ہے اور یہ تفسیر بھی اس سے زیادہ نہیں ہے، اندازہ لگایا جائے کہ یہ کام کیسا اچھوتا ہے کہ یہ تفسیر تو ہے ہی مگر ترجمہ بھی ہوتا ہوا نظر آتا ہے، اس ایجاز تام اور نکتہ رسی کو دیکھ کر اہل علم یقیناً محظوظ ہوں گے۔ بطور نمونہ چند باتیں پیش کی گئی ہیں۔ قاری پوری تفسیر

ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ مفتی صاحب کی مرتب کردہ اس تفسیر کو ادارہ مجلس درس قرآن دیوبند نے شائع کیا تھا اس میں کہیں کہیں لکھا ہے، زیر سرپرستی فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مگر افسوس یہ ہے کہ آج اس پر حضرت مفتی صاحب کا نام دیکھنے کو بھی نہیں مل رہا ہے۔ ناشر نے نہ جانے کس مصلحت سے نام خارج کردیا ہے۔ پروفیسر محمد سعود عالم صاحب قاسمی نے بتایا کہ یہ تفسیر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مسجد تار بنگلہ میں روزانہ بعد نماز فجر پڑھی جاتی تھی اور شعبۂ نباتات کے پروفیسر ابرار مصطفیٰ خاں صاحب اس سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تفسیر (جو مطالعۂ علوم قرآنی کے نام سے تھا) قائم کیا گیا اور حضرت مفتی صاحب کے تفسیری شغف اور دلچسپی کے پیش نظر اس کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی جس میں فضلاء دارالعلوم کے منتخب طالب علم داخل کیے جاتے تھے اور آپ کی زیر نگرانی قرآن کا مطالعہ ہوتا تھا جس سے تفسیری صلاحیت اجاگر ہوتی تھی۔ یہ شعبہ بہت اہمیت کا حامل تھا، اس کے بارے میں حضرت مولانا محمد ولی رحمانی دامت برکاتہم نے بتایا کہ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب مجھ کو اس میں داخلہ لینا تھا تو جبال العلوم کی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، حضرت مولانا میاں صاحبؒ اور حضرت مولانا سعید اکبر آبادی تھے، سارے حضرات نے امتحان لینا شروع کیا، ربط آیت، ربط سورت کے علاوہ ۱۹ قرآنی آیات ان حضرات نے پڑھیں اور اس کا ترجمہ، تفسیر اور اس کے احکام بیان کروائے، جب ۱۹واں سوال ''وجدوا فیہ اختلافاً کثیراً'' ہوا جس میں پوچھا گیا لفظ اختلاف کیوں ہے، لفظ مختلف کیوں نہیں ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا اللہ میاں نے مجھ سے پوچھ کر نازل نہیں کیا ہے۔ حضرت علامہ اسے سن کر چراغ پا ہوگئے اور

فرمایا'' آپ لوگ ایک طالب علم سے سوال کررہے ہیں یا مفسر قرآن سے'' اس معیار کے طالب علم کو اس شعبہ کے لیے منتخب کیا جاتا تھا اب اس صورت میں اس شعبہ کے استاذ کا ماہر ہونا بہت ضروری تھا اور مفتی صاحب کا اس شعبے کا نگراں مقرر ہونا آپ کی غیر معمولی تفسیری نظر کا ثبوت ہے۔

حضرت مفتی صاحب اس شعبہ کے ذمہ دار بنائے گئے اور اس شعبہ کے طلباء کو قرآن سے متعلق کوئی موضوع دے کر مطالعہ کراتے اور مقالہ لکھواتے، ایک ایک لفظ پر اتنا مطالعہ کراتے کہ ان کے مقالے پرانے اور ماہر مفسرین کرام کی تفسیروں کا آئینہ دار ہوتے، یہ شعبہ گرچہ بہت عرصہ تک جاری نہیں رہ سکا اور اس شعبہ کے فارغ التحصیل زیادہ نہیں ہیں، مگر جو بھی ہیں وہ حامل قرآن اور اپنی اپنی جگہ انجمن اور امت کا درد اپنے دل میں رکھنے اور محسوس کرنے والے ہیں۔ اس شعبہ میں صرف ایک دو طالب علم داخل ہوا کرتے تھے اس لیے اس شعبہ کے فارغ کا کم ہونا ظاہر ہے، مگر یہ سب آفتاب و ماہتاب ہیں اور ان کے مقالات بھی بڑی خوبیوں کے حامل ہیں۔ حضرت مولانا محمد ولی رحمانی کے مقالہ کا موضوع ہے '' اسلام نے دنیا کو کیا دیا'' مولانا رضوان القاسمیؒ کے مقالہ کا موضوع ہے'' قرآن کا عطا کردہ نظامِ حیات'' مولانا مزمل صاحب کے مقالہ کا عنوان ہے'' فقہاء امت کا آیات قرآنی سے استدلال اور ان کے وجوہ اختلاف'' اور مولانا شاہین جمالی نے'' اردو تراجم قرآن کا تقابلی مطالعہ عربی تفاسیر کی روشنی میں'' کے عنوان سے مقالہ لکھا، یہ سب مقالات وہ ہیں جو آپ کی نگرانی میں لکھے گئے ہیں مگر کسی وجہ سے چھپ نہیں سکے، کاش یہ چھپ جاتے اور استاذ و شاگرد کی تفسیری حیثیت سمجھ میں آتی نیز شائقین ان مقالات سے استفادہ کرتے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحب نے قرآن کے عمومی درس کے ساتھ علوم قرآن کی تحقیق پر بھی محنت کی اور ایسے طلباء تیار کیے جو قرآن اور علوم

قرآن کی اشاعت کو اپنا مقصد اور نصب العین بنا سکیں۔ حضرت مفتی صاحب کو قدیم تفسیروں میں تفسیر ابن کثیر سے بڑی مناسبت تھی، انھوں نے مولانا سعود عالم قاسمی کو علی گڑھ جاتے ہوئے یہ نصیحت کی تھی کہ پوری تفسیر ابن کثیر پڑھ لینا۔ ماشاء اللہ اس وقت وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے پروفیسر ہیں اور علم تفسیر ان کا خاص موضوع ہے، اس موضوع پر عربی و اردو میں ان کی چھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ یقیناً اس میں حضرت مفتی صاحب کی تربیت شامل ہے۔

●●●

مفتی ظفیر الدین صاحبؒ اور فقہ وفتاویٰ کی تدوین

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تحریر وتقریر کے ساتھ، جمع وترتیب اور تدوین وتہذیب کا بھی عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا، آپ کی تحریر میں جس طرح سادگی، بے ساختگی اور سلاست و روانی ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح آپ کی مرتب کردہ چیزوں میں بھی توازن اور حسن ہوا کرتا تھا، آپ پیچیدہ تحریروں اور الجھی ہوئی عبارتوں کو بھی تبویب و ترتیب کی لڑی میں اس طرح پرودیتے تھے کہ ان سے استفادہ کرنا آسان ہوجاتا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی ملک کے نامور عالم اور مصنف تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے صدر شعبہ دینیات تھے۔ کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات میں بے نظیر تھے۔ ان کی تحریریں معلومات اور علمی نکات سے پر ہوا کرتی تھیں، مگر ان کی تحریر میں یک گونہ الجھاؤ ہوتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی جملہ معلومات کو اپنی تحریر میں سمیٹ لیں، اسی لیے وہ ایک بات ختم نہیں کر پاتے کہ دوسری بات شروع ہوجاتی تھی، ایک عبارت میں دوسری عبارت در آتی تھی، خاص طور سے ان کی کتابوں میں جو تاریخ وسیر سے متعلق ہیں، یہ چیز نمایاں ہے۔ اس اسلوب تحریر کی وجہ سے ان کی کتابوں سے استفادہ عام نہیں ہوا، قاری کو ذہن پر زور ڈالنا پڑتا اور سرا ہاتھ سے جانے کا خطرہ رہتا۔

ندوۃ المصنفین دہلی نے جب مولانا گیلانیؒ کی کتاب ''ہندوستان میں

مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' (دوجلدوں میں) شائع کرنے کا فیصلہ کیا، تو مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ کے سامنے یہی مسئلہ آیا کہ اس کتاب کو موجودہ شکل میں شائع کرنا مفید نہ ہوگا۔ اگر اس کی ترتیب کی جائے اور ذیلی عناوین لگادیے جائیں تو کتاب کی افادیت بڑھ جائے گی۔ چنانچہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ نے یہ ذمہ داری ممتاز عالم دین اور نامور اہل قلم مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ایڈیٹر ماہنامہ 'برہان' کو سونپی۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب نے راقم کو بتایا کہ جب میں اس کتاب کی ترتیب کو مفید بنانے اور عنوانات لگانے کے لیے بیٹھا تو میں سخت مشکل میں پڑ گیا کہ اس کام کو کس طرح انجام دیا جائے۔ یہاں تو ایک بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسری بات شروع ہوجاتی ہے، ایک مضمون مکمل نہیں ہوتا کہ دوسرے مضمون کا جزئیہ داخل ہوجاتا ہے، میرے لیے یہ کام دشوار تھا۔ چنانچہ میں نے مفتی عتیق الرحمان صاحب سے معذرت کرلی۔ مفتی صاحب نے یہ کام مولانا محمد ظفیر الدین صاحب کے سپرد کیا اور انھوں نے بڑی محنت اور سلیقہ سے اس کام کو انجام دیا اور اس سے استفادہ آسان ہوگیا۔ ندوۃ المصنفین سے اور پاکستان کے کتب خانوں سے مذکورہ کتاب مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کے مرتب کردہ عنوانات اور حسن ترتیب کے ساتھ شائع ہورہی ہے۔

اس واقعہ سے مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی علیہ الرحمہ کے ذوق ترتیب وتدوین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مفتی صاحب جس زمانہ میں سانحہ ضلع مونگیر میں مدرس تھے اسی زمانہ (۱۳۷۵ھ) میں جامعہ رحمانی مونگیر میں جلسہ تھا، جلسہ کی تقریب جامعہ رحمانی کے کتب خانہ کی تعمیر کی مناسبت سے ہوئی تھی، دیوبند سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ تشریف لائے تھے۔ حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب نے، اس جلسہ میں کتب خانہ کی تاریخ، افادیت

اور نظام پر ایک مقالہ لکھا تھا جو وہاں پڑھا گیا اور اہل علم میں مقبول ہوا، بعد میں یہ مقالہ رسالہ دارالعلوم میں چار قسطوں میں شائع ہوا، اسی مقالہ سے متاثر ہوکر مولانا حسین احمد مدنیؒ اور قاری محمد طیب صاحبؒ نے مفتی صاحب کو دیوبند آنے کی دعوت دی۔ مفتی صاحب نے اس کا احوال یوں لکھا ہے:

''میں نے اس اجلاس میں کتب خانہ کی تاریخ اور اس کی افادیت پر ایک مقالہ پڑھا تھا، میرا یہ علمی مقالہ غالباً حضرت شیخ الاسلام (مولانا حسین احمد مدنی) اور حکیم الاسلام (مولانا قاری محمد طیب) کو پسند آگیا، رمضان ۷۵ھ کی چھٹی گذار کر مدرسہ معینیہ سانحہ پہونچا تو اہل محلّہ نے بتایا کہ اس سال دارالعلوم دیوبند کے سفیر صاحب آئے تھے جب کہ اس سے پہلے کبھی نہیں آئے اور تمام لوگوں سے تمھارے متعلق مختلف سوالات کرتے تھے ..... شوال کے بعد ذی قعدہ کے دوسرے ہفتہ میں ڈاک سے دارالعلوم دیوبند کا ایک لفافہ موصول ہوا''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص ۱۱۳)

دارالعلوم دیوبند شروع سے دینی تعلیم کا تدریسی مرکز ہونے کے ساتھ شرعی امور میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے فتوی جاری کرنے کا اہتمام کرتا رہا ہے، روز مرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل ہوں یا ایمان وعقیدہ سے جڑے ہوئے معاملات ہوں ان میں دارالعلوم دیوبند کا فتوی معقول اور معتبر تسلیم کیا جاتا تھا۔ دارالعلوم کے سب سے پہلے مفتی مولانا عزیز الرحمٰن عثمانیؒ تھے جو علامہ شبیر احمد عثمانی کے بھائی تھے اور معتبر فقیہ تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں ان کا تقرر یوں تو مدرس کے بطور ہوا تھا اور تدریسی ذمہ داری کے ساتھ فتویٰ نویسی کی ذمہ داری بھی وہ انجام دیتے تھے، مگر ۱۳۱۰ھ میں جب شوریٰ کے فیصلہ کے مطابق دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا تو مفتی عزیز الرحمان صاحب باقاعدہ اس کے مفتی مقرر ہوئے اور

۱۳۱۰ھ سے لے کر ۱۳۶۴ھ تک اس منصب پر فائز رہے۔ ۳۶/سال کے عرصہ میں انھوں نے کوئی سوا لاکھ مسائل میں فتویٰ دیا۔ ابتدائی ایام کے فتاوی تو دارالعلوم دیوبند کے ریکارڈ میں نہ آسکے کیوں کہ اس وقت ریکارڈ رکھنے کا دستور نہ تھا، بعد کے پندرہ سالوں کے فتاویٰ جن کی تعداد ۳۷۵۶۱ ہوتی ہے، محفوظ کیے جاسکے۔ ان میں سے کچھ فتاویٰ کو مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے عزیز الفتاویٰ کے نام سے شائع کردیا۔ مگر اس طرح کہ بقول قاری محمد طیب صاحبؒ ''کچھ حصے مرتب تھے اور کچھ غیر مرتب، پھر تصحیح جس پیمانہ پر ہونی چاہیے تھی نہ ہوسکی''۔ (پیش لفظ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، جلد اول)

دارالعلوم دیوبند نے ان فتاویٰ کو مرتب کرکے شائع کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ امت ان سے استفادہ کرسکے، ہر جگہ اور مسلک کے لوگ شرعی رہنمائی حاصل کرسکیں۔ چنانچہ متعدد اصحاب افتا اور اہل علم کو اس کام پر لگایا گیا مگر خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا بالآخر ۱۳۷۶ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ مفتی محمد عزیز الرحمان عثمانی کا تاریخی نام ''ظفر الدین'' ہے کیوں کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۲۷۵ھ ہے اور مرتب فتاوی کا نام بھی ظفیر الدین ہے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ترتیب فتاویٰ کے ان مراحل کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احقر نے ایک باضابطہ تجویز دارالافتا میں بھیج کر ترتیب فتاویٰ کا کام شروع کرادیا۔ الحمد للہ تھوڑی ہی مدت کے بعد فتاویٰ کا ایک معتد بہ ذخیرہ بطور نمونہ احقر کے سامنے لایا گیا۔ عمل کا ایک نمونہ سامنے آجانے پر احقر نے اس خیال کو مجلس شوریٰ دارالعلوم کے سامنے رکھا، مجلس نے کافی حوصلہ افزائی کے ساتھ طے کیا کہ اس ذخیرہ فتاوی کی مزید ترتیب اور تفصیل کے لیے ایک مستقل شعبہ

ترتیب فتاویٰ قائم کیا جائے اور ایک مستقل مرتب فتاویٰ کی منظوری دی۔ اس دور میں کئی مرتب فتاویٰ یکے بعد دیگرے رکھے جاتے رہے اور کام جاری رہا بالآخر اس سلسلہ کی انتہا جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب زیدہ مجدہٗ پر ہوئی اور انھوں نے غیر معمولی جانفشانی اور تندہی سے لگ کر ترتیب فتاوی کا کام حسن اسلوب سے انجام دینا شروع کیا، جو آج اپنی مرتب صورت میں ناظرین کے سامنے موجود ہے اور ہم اس کی طباعت و اشاعت کی سعادت حاصل کررہے ہیں''۔ (پیش لفظ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، جلد اول، ص۵۹)

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فتاوی کی ترتیب میں مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کی جس جانفشانی اور تندہی کا تذکرہ کیا ہے اس کا اندازہ عام لوگوں کو نہیں ہوسکتا، خود مفتی صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس سے کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے فتاوی کو دارالعلوم دیوبند کے شایان شان مرتب کرنے کے لیے نیز فتاویٰ کو علمی اور فقہی معیار پر پیش کرنے کے لیے متعدد امور انجام دیے۔

(۱) فتاویٰ میں جن مسائل کی تکرار تھی ان کو حذف کرکے مسئلہ کی ایک متعین شکل پیش کی گئی۔ اگر کسی مسئلہ کی نوعیت میں نمایاں فرق محسوس کیا گیا تو اسے دوبارہ لکھا گیا۔

(۲) دارالعلوم دیوبند میں فتاویٰ کا اندراج رجسٹروں میں تاریخ کے لحاظ سے ہوا ہے فقہی ابواب کی ترتیب سے نہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے ان تمام فتاویٰ کو فقہی ابواب وفصول کے لحاظ سے مرتب کیا۔ فقہی مضامین کے لحاظ سے جلدیں مرتب کی گئیں پھر ان کے ابواب وفصول قائم کیے گئے۔ اس طرح ان

مسائل سے استفادہ کرنا آسان ہوا۔

(۳) مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے فتاویٰ میں مکمل حوالوں کا اہتمام نہیں تھا۔ کہیں حوالہ غائب تھا اور کہیں حوالہ ناقص تھا۔ مفتی ظفیر صاحب نے ترتیب فتاویٰ کے وقت حاشیہ میں مسائل کو مدلل ومکمل کرنے کے لیے حوالہ جات بڑھائیے۔ ہر مسئلہ کا حوالہ ماخذ کی کتاب مع ابواب وصفحات کے رقم فرمایا اسی طرح ناقص حوالوں کی کتب سے مراجعت کرکے تکمیل فرمائی۔

(۴) جن فتاوی میں مصنف اور فقیہ کا نام آیا ہے اس کے بارے میں مختصر اور ضروری معلومات کا اضافہ کردیا ہے مثلاً نام، نسب، کنیت، لقب اور سنہ وفات وغیرہ۔

(۵) قرآن کی آیات اور احادیث شریفہ کے ٹکڑے اور جملے اگر فتاوی کے درمیان آگئے تو مفتی صاحب نے ان کو بھی مکمل کرنے کی سعی فرمائی۔

(۶) فتاویٰ کو نقل کرنے میں اگر ناقل سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے تو مفتی صاحب نے اصل فتویٰ سے موازنہ کرکے اس کی تصحیح کردی ہے۔

(۷) مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا اسلوب فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی عام آدمی کسی حکم کی علت پوچھتا ہے تو اسے صرف اتنا لکھ کر خاموش کردیتے ہیں کہ خدا اور رسول کا ایسا ہی حکم ہے۔ اس طرح کے بعض جوابات کے نیچے مرتب نے علت کا اضافہ کردیا ہے تاکہ ناظرین استفادہ کرسکیں۔

(۸) فتویٰ کے مابین اگر کوئی تاریخی واقعہ آیا ہے تو مفتی صاحب نے اس ماخذ کی بھی نشان دہی فرمادی ہے۔

(۹) مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحب نے اپنے وقت میں فقہ حنفی کی رو سے جو فتاوی دیے اور بعد کے حنفی مفتیان کرام نے ان کے برخلاف جو فتاویٰ دیے ان کا بھی اظہار مفتی صاحب نے فتویٰ کے بعد کردیا ہے، تاکہ لوگوں کے سامنے

دونوں فتاویٰ آجائیں اور شریعت پر عمل کرنے میں سہولت ہو۔ مثال کے طور پر اگر شوہر بیوی کو نفقہ نہ دے تو نفقہ اور سکنیٰ نہ دینے کی وجہ سے میاں بیوی میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے درمختار کی عبارت کی بنیاد پر یہ فتویٰ دیا ہے۔ مفتی ظفیر صاحب نے اس فتویٰ کے بعد قوسین میں حسب ذیل نوٹ لکھا ہے: (بعد کے علماء نے تفریق کی صورت نکالی جو قاضی شریعت، یا شرعی پنچایت کے ذریعہ ہوسکتی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے **الحیلة الناجزة للتھانوی**، بحث زوجہ متعنت۔ ظفیر) (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، جلد ۱۰، ص ۲۲۷)

(۱۰) سوالات کے ساتھ جو تاریخ اور پتے تھے ان کو حذف کرکے از سر نو ان پر نمبر ڈال دیے گئے، تاکہ نمبروں کے حوالہ سے بھی استفادہ کیا جاسکے۔

غرضیکہ مفتی صاحب نے محنت اور عرق ریزی سے فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب اور حاشیہ نگاری کا کام انجام دیا ہے، وہ اپنی اس محنت کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

''خاکسار مرتب نے اپنی محنت کی حد تک کوئی کوتاہی نہیں ہونے دی ہے، یوں اس کی کم مائیگی ظاہر ہے، حوالہ جات میں حتی الوسع صریح جزئیہ نقل کرنے کی جدو جہد کی گئی ہے الا ماشاء اللہ۔

مرتب نے بہت کوشش کی کہ اس کے حوالہ جات پر کوئی دوسرا فقیہ نظر ڈال لے تاکہ اگر کہیں کوئی خامی رہ گئی ہو تو اس کی اصلاح ہوجائے، مگر افسوس اس وقت یہ کام نہ ہوسکا۔ یوں بعض علماء دارالعلوم نے سرسری نظر ڈالی ہے۔ (مقدمہ، فتاویٰ دارالعلوم، جلد اول، ص ۱۲۳)

آخر میں مفتی صاحب نے نہایت اخلاص و عاجزی سے اللہ کے حضور یہ التجا کی ہے:

''الٰہ العالمین تو خوب جانتا ہے کہ تیرا یہ حقیر بندہ ان تمام اسلحوں سے خالی ہے جن کی آج کی دنیا میں قدر و قیمت ہے اور سچی بات

تو یہ ہے کہ تیری ذات پر اعتماد و توکل کی پونجی کے سوا اس کے پاس کچھ ہے بھی نہیں، صرف اسی پونجی کے بھروسہ پر اس نے اتنے اہم کام کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ تیری امداد و اعانت نہ ہوتی تو اس کی اس خدمت میں کوتاہیوں اور خامیوں کے سوا کیا ہوتا''۔

(مقدمہ، فتاوی دارالعلوم، ص ۱۲۴)

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے فتاویٰ کی بارہ جلدیں مرتب کیں جو دارالعلوم دیوبند سے نہایت اہتمام سے شائع ہوئیں، مفتی صاحب نے تیرہویں جلد بھی مرتب کرلی تھی مگر اس کا مسودہ دارالعلوم کے ہنگامہ میں لوٹ لیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند کی نئی انتظامیہ نے بعد میں اس سلسلہ کو موقوف کردیا۔ باقی جلدیں مفتی سعید پالنپوری صاحب اور مفتی امین صاحب کی مشترکہ مساعی سے مرتب ہورہی ہیں۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی پہلی جلد محرم الحرام ۱۳۸۲ھ مطابق جولائی ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی اور آٹھویں جلد ۱۳۹۲ھ میں شائع ہوئیں گویا دس سال کے عرصہ میں آٹھ جلدیں شائع ہوسکیں۔ اس وقت مفتی صاحب پر دارالعلوم کے کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم اور مخطوطات کے تعارف کی ذمہ داری بھی تھی۔ مفتی صاحب نے اس موقع سے لکھا تھا:

''۱۳۸۲ھ سے اس وقت تک (یعنی ۱۳۹۲ھ) تک خاکسار کے قلم سے فتاویٰ کی آٹھ جلدیں اور دو جلدیں تعارف مخطوطات کی آچکی ہیں، جو کسی طرح چالیس بیالیس سو صفحات سے کم نہیں ہیں۔ دس سال میں دارالعلوم دیوبند کی صرف یہی ایک خدمت غور کیا جائے تو ایک اکاڈیمی سے کسی طرح کم نہیں ہے''۔

(تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند، جلد دوم، ص ۵)

مفتی صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد میں ایک عظیم الشان مقدمہ تحریر فرمایا ہے جوفل اسکیپ کے تقریباً ۶۵ صفحات پر مشتمل ہے، اس مقدمہ میں انھوں نے عہد رسولؐ اور عہد صحابہؓ میں فقہ کی نوعیت، امام ابوحنیفہ کے عہد میں فقہ کی تدوین، فقہ حنفی کے امتیازات، امام ابوحنیفہ کے تلامذہ کی فقہی خدمات، فتویٰ کی ضرورت واہمیت، فتاویٰ کی تاریخ، اصحاب افتا اور رسول کریم کے فتاویٰ، صحابہ میں مفتیان کرام، اصحاب افتا کے لیے شرائط اور اوصاف، نااہل مفتیوں سے گریز، افتا اور اجتہاد، فتاویٰ دارالعلوم، مفتی عزیز الرحمان کی فتوی نویسی جیسے عناوین پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ مقدمہ تاریخ فقہ وفتاویٰ پر خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت رابع بہار و اڑیسہ کہا کرتے تھے کہ اگر مفتی ظفیر الدین صاحب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی ترتیب کے علاوہ کوئی اور علمی کام نہ کرتے تب بھی یہ ان کی علمی عظمت اور دینی وفقہی خدمت کے لیے کافی تھا۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے شائع کردہ اسلام کے عائلی قوانین کا مجموعہ ''اسلامی قانون متعلق مسلم پرسنل لاء'' کی ترتیب میں بھی کلیدی رول ادا کیا تھا۔ گوکہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی سکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک پر بورڈ کے ذمہ داروں نے اس کام کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا کام عائلی قوانین سے متعلق مسائل کو دلائل اور حوالوں کے ساتھ دفعہ وار مرتب کرنا تھا، بورڈ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے:

> ''اس کے لیے ایسے بیدار مغز، وسیع النظر باریک بیں اور فقہ اسلامی سے گہری واقفیت اور فقیہانہ مزاج رکھنے والے علماء کی ضرورت تھی جنھیں اس کی نزاکتوں کا پورا احساس ہو اور اس کام کے اہل بھی ہوں اور اس کے لیے وقت بھی فارغ کرسکیں۔ قحط

> الرجال کے اس دور میں ایسے لوگوں کا تلاش کرنے پر بھی ملنا دشوار تھا، مگر خوش قسمتی نے بورڈ جس میں ہندوستانی مسلمانوں کا گویا عطر آ گیا ہے اس کے اندر ہی چند ایسے علماء پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر پڑی اور انھوں نے ہی (مجلس عاملہ کی تجویز پر) اس عظیم کام کے لیے ایسے علماء کو جمع کیا جو کام کے لیے موزوں ترین افراد تھے۔ ان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا برہان الدین سنبھلی ، دارالعلوم دیوبند سے مولانا مفتی محمد ظفیر الدین، دارالعلوم دیوبند وقف سے مولانا مفتی احمد علی سعید، امارت شرعیہ سے مولانا قاضی مجاہد الاسلام، جامعہ رحمانی مونگیر کے استاذ مولانا صغیر احمد رحمانی، مولانا مفتی نعمت اللہ صاحبان کے علاوہ اور جامعہ رحمانی کے کئی اساتذہ کو متعدد بار ایک ہفتہ بلکہ کبھی اس سے بھی زیادہ مدت تک اکٹھا کرکے خانقاہ رحمانی کے اندر خانقاہ کے وسیع کتب خانہ کے ہال میں یہ کام اپنی نگرانی میں پوری دلچسپی کے ساتھ کرایا''۔

(مقدمہ، اسلامی قانون متعلق مسلم پرسنل لا، ص ۳۷)

مگر اس ترتیب وتدوین کے جو روح رواں تھے اور جنھوں نے اس کام کے لیے اپنا وقت فارغ کیا تھا اور اپنے علمی وفقہی تجربات کی اساس پر قانون اسلامی کو دفعہ وار پیش کرنے کے منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا تھا وہ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب ہی تھے، چنانچہ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس عاجز نے جب عملی نقشہ تیار کیا تو سب سے پہلے نگاہ جناب مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیوبند پر پڑی

جو نہ صرف مسائل کا جواب دینے میں کافی مشاق ہیں بلکہ بارہ جلدوں میں فتاوی دارالعلوم دیوبند کو مرتب کر کے قابلِ قدر علمی خدمات انجام دے چکے ہیں، چنانچہ میری درخواست پر جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے چھ ماہ کے لیے مفتی صاحب کو مونگیر بھیج دیا''۔ (پیش خدمت از مولانا ولی رحمانی، اسلامی قانون، ص ۲۲)

تدوین فقہ کی میٹنگ مونگیر کے علاوہ پٹنہ میں بھی ہوتی تھی، مفتی صاحب نے ایک میٹنگ میں شرکت کا حال راقم کے نام ایک مکتوب میں اس طرح لکھا:

عزیزم مولانا سعود سلمہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

یونیورسٹی کھل چکی ہوگی اور آپ علی گڑھ آچکے ہوں گے، خدا کرے مع الخیر ہوں، میں پٹنہ قوانین اسلامی کی تدوین کے سلسلے میں ۲۴ر مئی کو گیا تھا، ایک ہفتہ مولانا ولی کی کوٹھی میں اجتماع رہا، دو دن کے لیے گھر بھی چلا گیا تھا، الحمدللہ خیریت تھی۔

محمد ظفیر الدین
مفتی دارالعلوم دیوبند
۲۳ر محرم سنہ ۱۴ ہجری

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے مسلم پرسنل لا کے مجموعۂ قوانین اسلامی کی ترتیب میں کیا خدمات انجام دیں اس کا تذکرہ انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

''بحکم اہتمام (دارالعلوم) ۱۸ر فروری ۸۶ء کو دیوبند سے روانہ ہوکر یکم مارچ ۸۶ء کو مونگیر حاضر ہوگیا اور میں نے ترتیب قانونی اسلامی کا کام شروع کر دیا۔ فقہ کی کتابوں سے مسلم پرسنل لا کے

تمام مسائل یکجا کیے اور ان کو دفعہ وار لکھا اور اسی کے ساتھ تمام مسائل کے حوالے بھی لکھے۔ کتاب النکاح، کتاب الطلاق، کتاب الوصیۃ، کتاب الوقف، کتاب الفرائض، فقہ کی کتابیں سامنے رکھ کر باب وار، فصل وار، ہر کتاب کے تمام مسائل واحکام کو دفعہ وار لکھا گیا، اس میں کافی دن لگے اور اس نام پر مونگیر میں تین چار ماہ قیام رہا۔ حضرت امیر شریعت مدظلہ نے میرے قیام وطعام کے لیے عمدہ نظم فرمایا اور بڑے آرام وراحت کے ساتھ رکھا۔ کام پورا کر کے غالبًا ۲۹ر ذی الحجہ کو دیوبند آیا''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص ۲۰۲)

کسی علمی سرمایہ کی ترتیب وتدوین بظاہر تو آسان چیز معلوم ہوتی ہے مگر تحریر سے زیادہ دیدہ ریزی اور علمی محنت کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا اندازہ وہی اہل علم کر سکتے ہیں جنھوں نے اس طرح کے تحقیقی کاموں میں حصہ لیا ہے، اسی لیے تحقیق وتدوین کو آج کی علمی دنیا میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اہل فن سے مخفی نہیں۔ اس طرح مفتی محمد ظفیر الدین صاحب نے تدوین وترتیب فقہ کا جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ ان کی علمی زندگی کا روشن باب ہے اور اجر آخرت کا ذریعہ ہے۔ اللہ ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور امت کے لیے نافع بنائے۔ آمین

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کا تصنیفی ذوق

مولانا مفتی بدرالحسن قاسمی☆

باقی رہنے والی ذات تو صرف رب کائنات ہی کی ہے۔ **کل نفس ذائقۃ الموت** (ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے) کے خدائی اعلان عام کے بعد اس دنیا میں ہر کسی کا آنا اس کے جانے کی تمہید ہی ہوتی ہے اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے بقول ''انسان کی زندگی خود ہی ایک بیماری ہے جسے لگ گئی اسے مرنا ہی ہے'' پھر بھی آنے پر خوشی اور جانے کا غم ایک فطری چیز ہے اور غم بھی ہر انسان کی شخصیت اور کارناموں کے لحاظ سے کہیں زیادہ اور کہیں کم ہوتا ہے۔

افسوس ہے کہ نامور عالم دین، مفتی اور مصنف مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی صاحب بروز پنجشنبہ ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء طویل علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوکر خالق کائنات کی آغوشِ رحمت میں جا پہنچے اور اپنے پیچھے جسمانی اولاد کے ساتھ متعدد مفید تصنیفات اور ایک طویل، پرمشقت، جدو جہد سے بھرپور اور اہل علم کے لیے سبق آموز زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے۔ **رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃً**

مولانا کی زندگی انتہائی سادہ لیکن حد سے زیادہ پرکار تھی، ان کی وضع قطع ہر طرح کے تکلف و تصنع سے پاک، ان کی باتیں انتہائی سادہ بلکہ عامیانہ اور رہن سہن اتنا معمولی تھا کہ ان سے مل کر اور ان کی باتیں سن کر نہ کسی پر ان کا عالمانہ رعب طاری ہوتا اور نہ ان کی طرف سے کسی طرح کے طنطنہ کا احساس ہوتا، لیکن

☆ نائب صدر اسلامی فقہ اکیڈمی، نئی دہلی، مقیم کویت

دوسری طرف ان کی زندگی خالص علمی، سرتاپا یکسوئی اور انہماک بحث و تحقیق کی تھی۔ وہ لکھتے ہی رہتے تھے، چنانچہ کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوتا، اور ان کی کتابوں پر کتابیں تیار ہوتی رہتیں۔ کتابوں میں ابھی اُسلوب کی سادگی اور شستگی چھائی رہتی اور اس طرح انھوں نے محض اپنی محنت سے سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی سب سے الگ زندگی گزارنے کی مثال پیش کی ہے اور ایک ایسے ماحول میں رہتے ہوئے جہاں صرف درس و تدریس کی اہمیت ہو تصنیف و تالیف کے میدان کی شہسواری کرتے رہے اور نہایت کامیابی کی زندگی بسر کی۔

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کی زندگی میں دو چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں ایک اپنے اساتذہ اور بعض اکابر اہل علم سے تعلق اور ان سے استفادہ کا جذبہ جو اُن بڑوں کی زندگی کے اختتام تک کبھی موقوف نہیں ہوا جن میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ سرفہرست ہیں۔

دوسری چیز تصنیف و تالیف کے عمل کو زندگی کی ایک ضرورت کے طور پر اپنائے رکھنا اور کسی نہ کسی موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا ان کی زندگی کا امتیازی وصف تھا۔

اکابر اہل علم سے وابستگی نے ان کے لیے اپنے اختیار کردہ موضوع کے لیے مواد کی فراہمی کی راہ آسان کردی اور غلطیوں سے بچنے میں مدد دی۔

جب کہ مستقل لکھتے رہنے اور تصنیف و تالیف کو ایک مشغلہ زندگی بنائے رکھنے کی وجہ سے نہایت ہی خاموشی سے انھوں نے درجنوں کتابیں تصنیف کرڈالیں، اس میں ہم جیسے لیت ولعل میں پڑے رہنے والوں اور موضوع کا حق ادا کرنے کے انتظار میں سبقت نہ کرنے اور کام کو ٹالتے رہنے والوں کے لیے درس عبرت ہے۔

مشہور محدث و محقق عالم شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے صحیح لکھا ہے کہ:

وكم أماتت رغبة الكمال ، انجاز كثير من جلائل الأعمال! وكم أماتت التراخي والتسويف كثيرا من فريد التأليف۔ (مقدمہ، الرسول المعلم)

(کمال کی خواہش نے کتنے ہی بڑے کاموں کا گلاگھونٹ دیا اور کام کو مؤخر کرنے اور ٹالتے رہنے کی عادت نے کتنی ہی عمدہ تصنیفات سے دنیا کو محروم کردیا)

جہاں تک تصنیف وتالیف میں غلطیوں سے بچنے کی بات ہے تو اس کے بارے میں مشہور حنفی فقیہ و اصولی علامہ علاء الدین البخاری نے ''بزدوی'' کی ''کشف الأسرار'' کی شرح کے آغاز میں جو بات لکھی ہے وہ ہر صاحب تصنیف کو محسوس کرنی چاہیے:

وإنی وإن لم آل جهدا فی خدمة هذا الكتاب وترتيبه، ولم أدخر وسعا وجدا فی تسديده وتهذيبه فلا بد من أن يقع فيه عثرة وزلل، وأن يوجد فيه خطأ وخطل فلا يتعجب الواقف عليه منه فإن ذلک لاينجو منه أحد ولا يستنكفه بشر.

(اس کتاب کی ترتیب اور اس کی خدمت کا حق ادا کرنے میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے اور اس کی کانٹ چھانٹ میں میں نے کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے، اس کے باوجود اس میں غلطی اور چوک کا ہونا یقینی ہے، لہٰذا اس کو دیکھ کر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے بچنے کی کوئی شکل نہیں ہے، لہٰذا انسان کو غلطی اور چوک کو اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے)

اور اس سے زیادہ اہم اور آبِ زر سے لکھی جانے والی وہ بات ہے جو حضرت امام شافعیؒ کے شاگرد رشید امام المزنی نے امام ہمام کی کتاب کے بارے میں لکھی ہے کہ:

قرأت كتاب الرسالة على الشافعی ثمانين مرة فما من مرة إلا وكان يقف على خطأ فقال الشافعی : هيه؛ أی حسبک أبی الله أی كتاب صحيحا غير كتابه۔

(اس کتاب کو میں نے امام شافعی کے سامنے ۸۰ بار پڑھا ہے اور ہر بار ایک نئی غلطی نکلتی تھی جسے دیکھ کر امام شافعیؒ نے فرمایا بس بس! اب مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے در اصل اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ سوائے اس کی کتاب کے کوئی دوسری کتاب مکمل طور پر صحیح رہے)

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کی خوبی یہی ہے کہ وہ تنقید وتبصرہ اور ایں وآں کی پرواہ کیے بغیر لکھنے کے کام میں لگے رہے اور تصنیف وتالیف کے کام کو انھوں نے کبھی نہیں چھوڑا اور بغیر کسی خاص مالی منفعت یا دنیوی شہرت کے جذبہ کو سامنے رکھے وہ اپنی آئیڈیل شخصیتوں کے مشورہ پر عمل پیرا رہے۔

ان کی اس اَدا نے انھیں ایک اچھے اور معتبر مصنف کا مقام عطا کیا اور دینی و فقہی موضوعات پر لکھنے والے نامور مصنفین کی صف میں انھیں لا کھڑا کیا۔

ان کی پہلی کتاب ''اسلام کا نظام مساجد'' چھپی تو اکابر اہل علم نے اس کی ستائش کی اور اُسے اُن کے لیے آئندہ کی ترقی کا زینہ قرار دیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا کہ:

''اس زمانہ میں دین کی خدمت کا بڑا ذریعہ سنجیدہ قلم ہے، اس نعمت کا شکریہ ادا کیجیے''۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے لکھا کہ:

''مساجد کے متعلق اتنی جامعیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں بھی میری نظر سے نہیں گزری''، وقت کی بڑی ضرورت کی تکمیل میں مولانا نے اپنا وقت صَرف فرمایا ہے اور اگرچہ تالیف وتصنیف کے میدان کے تازہ واردوں میں ہیں لیکن خالص نیت ان کی محنت کے بار آور کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوئی ہے''۔

حضرت مولانا گیلانیؒ کس کس طرح سے ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے اس کا اندازہ ان کے ان جملوں سے ہوسکتا ہے:

''ابتدا میں لوگوں کو یہ بھی دشواری ہوتی ہے کہ کس موضوع پر لکھیں؟ آپ کے سامنے کوئی باضابطہ پروگرام نہ ہو تو لکھیے، خاکسار فہرست بنا کر بھیج دے گا، ابھی بہت بڑا میدان تصنیف و تالیف کا خالی پڑا ہوا ہے۔

تاریخ المساجد کے متعلق مطالعہ جاری رکھیے یہ آسان کام نہیں ہے کہ چند کتابیں پڑھنے کے بعد آپ کو کافی مواد مل جائے گا، جلدی سے کام نہ لیجیے، برس دو برس یا جتنی مدت بھی لگ جائے اس کا خیال نہ کیجیے، یاد داشت کی ایک کتاب بنالیجیے اور مطالعہ جاری رکھیے''۔

حضرت مولانا گیلانیؒ کی خواہش تھی کہ تاریخ مساجد پر بھی ایک جامع کتاب مولانا تصنیف کریں جس کے لیے پورا خاکہ بھی انھوں نے تیار کردیا تھا، مصادر کی نشان دہی بھی کی تھی لیکن غالباً کتاب کا ایک حصہ ہی چھپا اور دوسرا ضائع ہوگیا اور مولانا گیلانیؒ کے خاکہ کے مطابق منصوبہ کی تکمیل نہ ہوسکی، البتہ ''نظام

مساجد'' خوب مقبول ہوئی اور اس کا انگلش میں ترجمہ بھی ہوا۔

ایک اور خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جی ہاں! زندگی کے ابتدائی دنوں میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کے لیے باقی ہی کیا رہا ہے ع

حریفاں باد ہا خوردند ورفتند

مگر جب زندگی ختم ہونے لگتی ہے تو شاید زندگی کے ہر شعبہ میں یہ محسوس ہوتا ہے مگر تصنیفی شعبوں میں تو مصنف غریب یہی کہتا ہوا کہ ع ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، مرتا ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے نہ صرف مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ صاحب کی بعض تصنیفات کو لفظ لفظ پڑھ کر خامیوں کی اصلاح کی تلقین کی بلکہ ان کے لیے تصنیف وتالیف کا ایک مستقل لائحۂ عمل تیار کرکے دیا، بعض موضوعات اپنی طرف سے پیش کیے اور یہ خیال رکھتے ہوئے کہ ان کتابوں کی تصنیف کے لیے مصادر ومراجع کہاں سے دستیاب ہوں گے؟ اور ایک مولوی اپنی معمولی آمدنی میں بڑی کتابیں خرید کس طرح سکتا ہے؟

جو موضوعات مولانا گیلانیؒ نے تجویز کیے تھے ان میں بعض یہ ہیں:

۱) مصائب النبیؐ وآل النبیؐ (نبیؐ وآلِ نبیؐ کے مصائب)

۲) انسانیت بیمار ہے یا (مرض الشیطان)

۳) الوفود والمکاتیب

۴) مشاہیر صحابہ مثلاً (حضرت انسؓ، ابوالدرداءؓ، ابوہریرہؓ وغیرہ جن کے نام مسلمانوں کی مجلسوں میں لیے جاتے ہیں لیکن ان کے حالات سے لوگ واقف نہیں ہیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ بھی قدم قدم پر ان کی علمی رہنمائی

فرماتے رہے، بعض کتابوں کے مسودات کو مکمل طور پر پڑھا مصادر کی نشان دہی کی۔

مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ ہوش سنبھالنے یا کہنا چاہیے کہ مدرسہ کی روایتی تعلیم سے فراغت کے بعد سے مسلسل لکھتے ہی رہے۔ اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام عفت وعصمت، اسلام کا نظام امن، جیسی مستقل عنوانات رکھنے والی کتابوں کے علاوہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کی تدوین کی، دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود مخطوطات کی فہرست اور دوجلدوں میں ان کا تعارف لکھا، اور بھی چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں لکھیں، رسالہ دارالعلوم دیوبند کے سیکڑوں اداریے لکھے۔

''امارت شرعیہ دینی جدو جہد کا روشن باب'' کے عنوان سے امارت کا مفصل تعارف اور اس کی تاریخ لکھی، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی سوانح لکھی اور اَن گنت مضامین و مقالات لکھے، امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی نگرانی اور ہدایت کے مطابق پرسنل لا سے متعلق اسلامی قوانین کی تدوین کی جس میں ان کے ساتھ اور دوسرے علماء بھی شریک رہے۔

پھر ان میں سے بیش تر کام ایسے ماحول میں رہ کر کیا جہاں تصنیف و تالیف کے کام کی حوصلہ افزائی کا تصور بالکل نہیں تھا لیکن ملک کے نامور علماء اور ارباب علم وتحقیق شخصیات سے وہ ہمیشہ قلمی طور پر مربوط رہے اور ان کے مشورے اور ملاحظات کو بالکل طالبانہ انداز پر قبول کرتے رہے جس کی وجہ سے ان کی تصنیفی صلاحیتیں نکھرتی رہیں اور ان کا ذوقِ تصنیف ماحول پر غالب رہا۔

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کی تصنیفات کا جائزہ لیتے وقت یہ پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک بلکہ ۱۹۷۰ء تک کا زمانہ ایسا تھا جس میں مصادر ومراجع کی وہ فراوانی نہیں تھی جو آج نظر آتی ہے اور نہ ہر موضوع پر ایم اے اور پی، ایچ، ڈی وغیرہ کے مقالات کی اشاعت کا وہ سلسلہ

شروع ہوا تھا جو اَب ہے، اس لیے مصنف کو مواد اکٹھا کرنے کے لیے خود ہی محنت کرنی پڑتی تھی اور حوالوں کی تلاش میں بڑا وقت لگانا پڑتا تھا۔

مولانا کو ملازمت کے حصول میں ہی کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ مولانا گیلانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ وغیرہ کے نام مولانا کے آنے والے خطوط اور مراسلوں سے ہوتا ہے، چنانچہ معمولی ملازمتوں پر وہ قانع رہے اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد ان کو دیوبند میں اپنے مزاج کے مطابق ماحول میسر آیا اور تنخواہ بھی اچھی ملنے لگی۔

اس سے پہلے دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر میں عرصہ تک صدر مدرس رہے، دارالمصنفین اعظم گڑھ میں رہنے کی کوشش کی، ڈابھیل کے جامعہ اسلامیہ میں بھر مدرس بن کر گئے لیکن وہاں رہنا مقدر نہیں تھا۔

مولانا کی دوسری کتاب جس نے اکابر اہل علم سے کافی داد تحسین حاصل کی ''اسلام کا نظام عفت وعصمت'' ہے۔ ایک پاکستانی کتاب فروش نے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے کویت سے شائع کرالیا اور نام میں بھی تصرف کرکے مفتاحی کے بجائے ندوی لکھ دیا اور خوب پیسے کمائے لیکن مولانا کو اس کی خبر تک نہیں دی مالی نفع تو کیا پہنچتا، لیکن مولانا مرحوم کے لیے یہ بات کافی تھی کہ ان کی کتاب سے لوگ استفادہ کررہے ہیں اور ان کی محنت سے انگریزی داں طبقہ بھی مستفید ہورہا ہے۔

کتاب کے مختلف ابواب جب انھوں نے دہلی کے مؤقر ماہنامہ ''برہان'' میں مقالات کی شکل میں شائع کرنا شروع کیے تو حضرت مولانا گیلانیؒ نے خاص طور پر اس سلسلہ کی تعریف کی اور جب ندوۃ المصنفین سے کتابی شکل میں اسے شائع کردیا گیا تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔

۱۹۵۲ء میں اس طرح کے موضوعات پر لکھنا آسان نہیں تھا جتنا اب ہے

اوراس زمانہ میں اس طرح کی کتابیں تو کیا ضروری مصادر ومراجع کا فراہم ہونا بھی ہرجگہ آسان نہیں تھا لیکن مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کی غیر معمولی عزیمت، مسلسل محنت اور اپنے زمانہ کے اکابر اہل علم سے استفادہ کی عادت نے ان کے لیے آسانیاں پیدا کردیں۔

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کا کمال ان کی انتھک محنت، غیر معمولی عزیمت اور مسلسل لکھتے رہنے کے جذبہ میں ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اتنا بڑا تحریری ذخیرہ چھوڑ گئے جو بہت سی عبقری شخصیتوں کے بس میں بھی نہیں ہے۔

ان کی تعلیم مفتاح العلوم مئو میں ہوئی تھی، ان کی گفتگو میں ترہت کی بولی کے ساتھ اعظم گڑھ کے لہجہ کا اثر بھی نمایاں تھا لیکن تحریر صاف اور شستہ لکھا کرتے تھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا کہ:

''مضامین کا اسلوب، معلومات کی فراہمی، بیان کی شستگی اور طریقہ تعبیر کی درستی ہر چیز پسند آئی''۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے لکھا کہ:

''زبان صاف وسادہ ہے اور اندازہ بیان سلیس وشگفتہ، کتاب ٹھیٹھ مذہبی رنگ میں ہونے کے باوجود مولویانہ خشک نگاری سے پاک ہے، کتاب بہ حیثیت مجموعی امت کے مذہبی ذخیرہ میں ایک خوش گوار اضافہ ہے''۔

اپنی کتابوں کے لیے مواد اکٹھا کرنے میں مولانا ضرورت پڑنے پر سفر کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب ان کو قیام اللیل یا تہجد پر لکھنے کے لیے مواد درکار تھا تو مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمیؒ نے مروزی کی کتاب ''قیام اللیل'' کا ذکر کیا تو اس کی جستجو میں مونگیر پہنچ گئے تاکہ وہاں کے کتب خانہ میں موجود

نسخہ سے استفادہ کرسکیں اور ان کا یہی سفر امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے گہرے تعلقات کی بنیاد بن گیا، جن کو ہمیشہ اچھی صلاحیتوں اور محنتی علماء کی تلاش رہا کرتی تھی اور وہ ان کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ اور استاذ محترم حضرت علامہ محمد حسین بہاریؒ کے کمروں کے بیچ میں میری رہائش گاہ تھی، اور دونوں بزرگوں کے مشفقانہ رویہ نے مجھے خاصا گستاخ بنادیا تھا، تقریباً ہر دن ہی عصر کے بعد نشست ہوتی اور دنیا بھر کے مسائل زیر بحث آتے، اس نشست میں مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمیؒ کی شرکت اس مجلس کو اور بھی باغ وبہار اور لالہ زار بنادیتی تھی۔

ہم سب ایک گھر کے افراد کی حیثیت سے رہتے تھے اور حضرت مفتی صاحب کے قہقہ کی گونج، حکیم صاحب کے چٹکلے اور میری شرارتیں روتے ہوؤں کو بھی ہنسا دینے کی خاصیت رکھتی تھیں۔

علامہ بہاریؒ تو استاذ ہی تھے اور حضرت مفتی صاحب بھی ایک خاص طرح کی تمکنت رکھتے تھے اس لیے زیادہ مزاج کی باتیں حکیم صاحب کی طرف سے ہوتی تھیں اور پھر اس پر میری طرف سے حاشیہ آرائی۔

حضرت مفتی ظفیر الدین صاحبؒ دارالعلوم سانحہ کے صدر مدرس رہے، دارالعلوم دیوبند کے مفتی رہے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کے مرتب رہے، دارالعلوم کے کتب خانہ کے ذمہ دار اور فہرست مخطوطات کے مرتب رہے، متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، امارتِ شرعیہ بہار واُڑیسہ اور دیگر کئی اداروں سے وابستہ اور فعال اراکین میں رہے اور آخر میں حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے انتقال کے بعد اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کے صدر بنائے گئے۔ دارالعلوم دیوبند میں مطالعہ علوم قرآن کے شعبہ کے نگراں رہے اور مولانا ریاست اللہ شیرکوٹی، مولانا محمد ولی رحمانی، مولانا محمد رضوان قاسمیؒ، مولانا مزمل اور

مولانا شاہین جمالی وغیرہ کے مقالوں کی نگرانی کی اور ان کے تصنیفی ذوق کو پڑوان چڑھانے میں مدد دی، اس لیے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کے کارناموں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے گوکہ ان کی سادہ اور بے تکلف زندگی ان کے کمالات کو جاننے کی راہ میں بہتوں کے لیے حجاب بنی رہی۔ اس معاملہ میں ان کا حال قاضی اطہر مبارک پوری جیسا تھا کہ بات چیت اور وضع قطع سے ان کی تصنیفی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مولانا کی تصنیفات کا دائرہ اتنا پھیلا ہوا ہے اوران کی تحریری خدمات اتنی ہیں کہ ان کوعلمی وتحقیقی اداروں کی طرف سے کئی طرح کے اعزاز وانعام سے نوازا جانا چاہیے، لیکن صحیح معنوں میں علم رکھنے والوں اور دین کی خدمت کرنے والوں کی تکریم کا جذبہ لوگوں میں کہاں رہا؟ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے مولانا محمد رضوان القاسمیؒ کو جنھوں نے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں ایک عظیم الشان اجلاس بلایا، مختلف اہل علم کو شرکت کی دعوت دی اور مولانا مرحوم کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا اوران کی کتاب ''اسلام کا نظام مساجد'' کو بھی از سرنو اور اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ اس موقع پر شائع کیا جس سے طبعی طور پر مولانا کو خوشی ہوئی۔

امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ خاص طور پر ان کے بڑے قدرداں رہے ہیں اور مفتی صاحب نے بھی حضرت مولانا سے عقیدت مندی کا بھرپور ثبوت دیا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی مولانا کے قدردانوں میں تھے اور یہ حضرات وقتاً فوقتاً مختلف قسم کے دینی وملی مسائل پر لکھنے کے لیے مولانا کو مامور کیا کرتے تھے اور مولانا تو گویا اسی طرح کے کاموں کے لیے ہی وقف تھے۔

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی عنایتیں اور حوصلہ افزائیاں بھی ان کو ابتدائے عہد تصنیف سے ہی حاصل رہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''اسلام کا نظام مساجد'' اسی طرح ''اسلام کا نظام عفت وعصمت'' کو ندوۃ المصنفین سے شائع کرکے ان کو ملک کے معتبر مصنفین میں شامل کرنا حضرت مفتی صاحبؒ کا ہی کام تھا پھر تو رفقائے ندوۃ المصنفین میں رہ کر ''ترجمان السنۃ'' کی تکمیل کی اور دیگر متعدد علمی کارنامے انھوں نے انجام دیے، ان کی وفات سے علمی حلقہ میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

رسالہ دارالعلوم دیوبند کے ایڈیٹر تو سید ازہر شاہ قیصر مرحوم تھے جو علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے بڑے صاحب زادہ ہونے کے ساتھ بلند پایہ ادیب اور قلم کار بھی تھے لیکن بعد کے زمانہ میں اکثر وبیش تر اداریے مولانا ظفیر الدین صاحب ہی لکھا کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کی شخصیت کئی حیثیتوں سے مثالی تھی اور ان کے ساتھ ملاقاتوں، بے تکلف نشستوں اور ذاتی مشاہدات و تأثرات کا دائرہ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ کسی ایک مضمون میں اس کو سمیٹا نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ان کی دینی وعلمی خدمات کو قبولیت سے نوازے اور اپنے نیک بندوں کے ساتھ انھیں فردوس بریں میں جگہ دے۔ (آمین)

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کا تصنیفی کارنامہ

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم☆

پورہ نوڈیہہ ضلع دربھنگہ، بہار صوبہ کے ایک غیر معروف چھوٹے سے گاؤں میں اس عالمِ آب و گِل میں آنکھ کھولنے والے مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی صاحبؒ کم وبیش ساٹھ سالوں تک علمی دنیا میں نہ صرف اپنا نام روشن کیے رہے بلکہ اپنی اس غیر معروف جائے پیدائش کو بھی متعارف کرا گئے۔ مئو ضلع اعظم گڑھ کے مدرسہ مفتاح العلوم میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب جیسے محدّثِ کبیر کے سامنے زانوئے تلمّذ طے کرنے والے، مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم جیسے عظیم مصنّف ومحقّق کی نظروں میں سمانے والے مشہور محقق ومؤرخ، مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ کے پسند فرمودہ، مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کی تدریسی زندگی کا آغاز دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر میں مدرسی کے فرائض انجام دینے سے ہوا تو تصنیفی زندگی کی ابتداء گذشتہ صدی کے اس عظیم تصنیفی ادارے ''ندوۃ المصنفین دہلی'' سے ہوئی جو تحقیقی مقالات کو کتابی شکل دینے میں سند کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھا اور جس کے رفقاء میں اپنے وقت کے مشہور اکابرین مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، قاضی زین العابدین، مولانا حامد الانصاری غازی رحمہم اللہ جیسے حضرات کے ساتھ وہ خود بھی شامل تھے۔ ان سب پر مستزاد آپ کی وہ خدمات جو آپ نے دارالعلوم دیوبند میں دارالافتاء سے منسلک ہوکر تقریباً نصف صدی تک

☆ نظامت سنی دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

عوام وخواص کی شرعی رہنمائی کا فریضہ وقتی طور پر ہی انجام نہیں دیا بلکہ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کو مرتب کرکے ان خدماتِ افتاء کو زندہ جاوید بنادیا۔ دنیاوی زندگی کو علم وعمل سے منور وروشن کرنے والے مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مورخہ ۳۱/ مارچ ۲۰۱۱ء کی شام میں عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کرگئے اور مورخہ یکم اپریل ۲۰۱۱ء کی صبح اس سرزمین میں ہزارہا عقیدت مندوں کے کاندھوں پر سوار ہوکر ہمیشہ کے لیے سپردِ خاک ہوگئے۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

مفتی صاحب کے نام سے کان، بچپن کے ایّام میں اُس وقت آشنا ہوئے جب مفتی صاحب مرحوم کی ایک کتاب ''اسلام کا نظامِ تعمیر سیرت'' مصطفائی کتب خانہ سالم کمپنی دیوبند سے شائع ہوئی۔ اس وقت دیوبند کے ہر گلی کوچے میں مفتی صاحب مرحوم کا چرچا اس بنا پر تھا کہ انھوں نے سماج کی دکھتی ہوئی نبض پر انگلی رکھ کر اُس برائی کی نشان دہی کی تھی جس نے انسانی سوسائٹی کے اس طبقہ کو بھی نہیں بخشا جو مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے دنیا ومافیہا سے بے خبر گوشۂ تنہائی میں پڑا رہنے کا عادی ہے اور اس کے اسی ''گوشۂ عافیت'' سے انسان کا ازلی دشمن ابلیس فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرکے ریاضت وخوفِ خدا میں ''کچے لوگوں'' کو موم کی طرح پگھلا کر انھیں دنیا کی اس ذلیل ترین برائی میں مبتلا کردیتا ہے جس کے تصور سے بھی اچھے بھلے لوگوں کو ابکائی آنے لگتی ہے۔

اسلام نے جنسی تعلیم کو اخلاق کی درستگی اور ایک اچھا انسان بنانے کے لیے جتنی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی لیکن ہمارا اردو ادب شروع سے ہی اس گوشے سے پہلو تہی کرتا رہا ہے اور اس کو اس نے ایک مخصوص زاویہ تک محدود کردیا ہے۔ اس کے تعلق سے کوئی گفتگو غیر اخلاقی وغیر ادبی تصور کی جاتی ہے، حالاں کہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے جب مذکورہ کتاب لکھی تو اس وقت دیوبند کے گلی

کوچوں میں، مذہبی طبقات میں، علمائے کرام کی مجالس میں اُن پر ہونے والے بحث ومباحثہ کی وجہ یہی تھی کہ انھیں یہ امید نہیں تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ افتاء میں بیٹھنے والا شخص سماج کی اس بُرائی پر اتنی گہری نظر رکھتا ہے اور وہ اس انداز سے تبصرہ کرسکتا ہے۔ بہرحال اُس وقت عمر شاید سات آٹھ سال رہی ہوگی، تب کے یہ تبصرے ذہن میں کچھ کچھ محفوظ ہیں اسی حوالے سے مفتی صاحب مرحوم کے نام سے آشنائی ہوئی۔

ہمارے زمانۂ طالب علمی میں دیوبند کے اکثر وبیش تر محلے کے افراد کو سیرت نبویؐ کے اجلاس منعقد کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس میں عموماً نوجوانوں کی ٹیم آگے رہتی۔ اور اس ٹیم کے انتظامی اراکین، دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے والے شہری طلباء کو اکابر اساتذہ تک رسائی کا ذریعہ بناتے، چونکہ سیرت کے یہ اجلاس نہایت کم خرچ تھے (صرف دریوں، اسٹیج ولاؤڈاسپیکر کے کرایوں تک محدود ہوتے) اس لیے کسی نہ کسی محلّے میں ہفتہ، دو ہفتہ یا مہینہ میں یہ پروگرام ہوتا۔ انتظامیہ اور مقررین کے درمیان رابطے کا کام بالعموم شہری طلباء انجام دیتے اس لیے ہماری کوشش ہوتی کہ ایسے مقررین ہوں جو ''سہل الحصول'' ہوں۔ مفتی صاحب مرحوم انھیں لوگوں میں سے تھے جن تک رسائی آسان تھی۔ مقررین سے پہلے اجازت لی جاتی تب ان کے نام کا اعلان کردیا جاتا۔ مفتی صاحب مرحوم جب بھی دستیاب ہوئے، کبھی اس مجلس میں جانے سے انکار نہیں کیا۔ پہلی ہی گفتگو میں اپنی منظوری عنایت فرماتے اور پھر شریکِ جلسہ بھی ہوتے اور سامعین تک رسول اللہ ﷺ کے اس کردار وعمل تک پہونچاتے جس سے نوجوان نسل کی تعمیر میں سیرت رسولِ اکرم ﷺ کی جھلک نمایاں ہو۔ مفتی صاحب مرحوم کا تقریر کرنے کا انداز بالکل سادہ ہوتا، اس میں نہ تو وہ ایسے بھاری بھرکم الفاظ کی بھرمار کرتے کہ جن کی صرف شان و شوکت ہی میں سامعین گم ہوجائیں اور نہ ہی ایسے محیّر العقول واقعات بیان کرتے

کہ سامعین اس چیستاں داستان کی نیرنگیوں میں مسحور ہوجائیں، وہ بات بہت جچے تلے انداز میں فرماتے اور اُن کی کوشش یہ ہوتی کہ سامنے والے کے دل میں بات اُتر جائے اس طریقہ پر مفتی صاحب مرحوم سے قربت کے مواقع ملتے رہے۔

مفتی صاحب مرحوم سے قربت ہونے کے باوجود مرحوم کی سادہ طبعی نے کبھی یہ اندازہ ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ عظیم المرتبت شخصیت کے مالک ہیں۔ نہ تو کبھی انھوں نے اپنی تصنیفات سے عوام وخواص کو مرعوب کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی اپنی نجی محفلوں میں ان محققانہ علوم کو اجاگر کیا جو مرحوم کی علمی طبیعت کا خاصّا تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کی زندگی میں نہ تو ان کی تصنیفات کا اندازہ تھا اور نہ ہی ان کی تحریروں سے مستفید ہونے کا شوق۔ ماہنامہ دارالعلوم میں مرحوم کے اداریے اور علمی مضامین اکثر وبیش تر شائع ہوتے، کبھی کبھی ان سے استفادہ کرلیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی تصویر ''مرتب فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' تک محدود تھی، یا پھر ان کی وہ کتابیں ذہن میں جگہ بنائی ہوئی تھیں جنھوں نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی جن میں ''اسلام کا نظامِ مساجد''، ''اسلام کا نظامِ تعمیرِ سیرت'' اور ''اسلام کا نظامِ عفت وعصمت'' وغیرہ شامل ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم پر مضمون قلمبند کرتے وقت مرحوم کی تصنیفات کا خیال آیا تو کچھ کتابیں دستیاب ہوسکیں، جتنا استفادہ ہوسکا، ان کی تلخیص قارئین کے سامنے پیش کی جارہی ہیں:

۱- فتاویٰ دارالعلوم دیوبند

''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' مفتی صاحب مرحوم کی شبانہ روز محنت وکاوش کے بعد ترتیب دیا جاسکا۔ اس میں وہ فتاویٰ بھی شامل ہیں جو مرحوم کے منصب افتاء پر فائز ہونے سے پہلے دیگر مفتیانِ کرام بالخصوص دارالعلوم دیوبند کے اوّلین مفتی اعظم، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ نے عوام وخواص کی رہنمائی کے لیے ان کے

استفتاء کے جواب میں دیے اور وہ بھی جو مرحوم نے شریعت کی روشنی میں بذاتِ خود تحریر کیے اور وہ فتاویٰ بھی جو مرحوم کے ہم عصر مفتیانِ دارالعلوم دیوبند نے زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً عبادات، معاملات، تجارت، معاشیات، اخلاقیات وغیرہ جیسے بہت سے موضوعات پر شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً پوچھے جانے والے سوالات کے جواب میں دیے۔

مفتی صاحب نے بڑی عرق ریزی سے ان فتاویٰ کو موضوعاتی ترتیب سے اس وقت میں ترتیب دیا جب کہ نہ تو کمپیوٹر کا تصور کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی انٹرنیٹ جیسی سہولیات کا۔ ہزار ہا بلکہ لاکھوں استفتاء کو اس انداز سے ترتیب دینا کہ طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تجارت، معاشرت وغیرہ کے تعلق سے جزوی و فروعی مسائل الگ الگ جلدوں میں آجائیں۔ مفتی صاحب مرحوم کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اگر اسے اردو داں دین دار طبقہ پر احسان کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ کیوں کہ مفتی صاحب مرحوم کی محنت و کاوش سے اب یہ سہولت فراہم ہوگئی ہے کہ زندگی کے جس گوشے سے بھی متعلق شرعی رہنمائی کی ضرورت ہو اسے آپ اُسی موضوعات کے لحاظ سے ترتیب دی جانے والی جلد میں دیکھ سکتے ہیں۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کی اشاعت و طباعت کا کام لیتھو پریس پر شروع کیا گیا تھا، آج الحمد للہ کمپیوٹر طباعت سے آراستہ و پیراستہ چودہ ضخیم جلدوں میں یہ فتاویٰ شائع ہو چکے ہیں ان میں بارہ جلدیں مفتی صاحب مرحوم کی مرتب کردہ ہیں۔ پہلی جلد میں مفتی صاحب نے ایک طویل مقدمہ فقہ و فتاویٰ کی تاریخ، اہمیت، مزاج اور دارالعلوم دیوبند کے فقہی سرمایہ سے متعلق لکھا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ عوام و خواص میں شہرت و مقبولیت کے باعث اس خوش گمانی کو پختگی عطا کرتے ہیں کہ انشاء اللہ وہ عنداللہ بھی مقبول و ماجور اور مفتی صاحب مرحوم کے لیے ذخیرہ آخرت ہوں گے۔

۲- ''تعارف مخطوطات دارالعلوم دیوبند'' کی فہرست دو جلدوں میں

دارالعلوم دیوبند سے شائع ہوئی۔ پہلی جلد ۱۹۷۰ء میں اور دوسری جلد ۱۹۷۳ء/ ۱۳۹۳ھ میں منظر عام پر آئی۔ پہلی جلد 20x26/8 کے ۲۶۸ صفحات اور دوسری جلد ۲۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک عظیم علمی کام ہے۔ مخطوطات کسی بھی لائبریری یا علمی ادارہ کی شناخت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ تمام لائبریریوں میں ان کو جتنی وقعت و اہمیت دی جاتی ہے اس سے علمی حلقے بخوبی واقف ہیں۔ مفتی صاحب مرحوم نے اس وقت تک دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں موجود تمام مخطوطات کا پورا علمی و تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس وقت تو تمام لائبریریوں میں مخطوطات پر جدید انداز سے بہت کام ہو رہے ہیں لیکن اب سے چالیس سال قبل اس کام کو پوری تفصیلات کے ساتھ تعارف کرانا ''کارے دارد'' کے مانند تھا جسے مفتی صاحب مرحوم نے اپنی علمی و تحقیقی طبیعت کے باعث سہل اور آسان بنا دیا، دونوں جلدوں میں تقریباً بارہ سو سے زائد ان مخطوطات کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ جو دارالعلوم دیوبند کی لائبریری میں اس وقت تک موجود تھے۔

مخطوطات کی پہلی جلد میں پانچ سو سے زائد نوادرات اور ان کے مصنفین کا جامع تعارف اور مصنفین کے مکمل حالاتِ زندگی کے لیے مختلف کتابوں کی نشان دہی کی گئی ہے جب کہ دوسری جلد میں اسی انداز پر سات سو سے زائد مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۳- جماعت اسلامی کے دینی رجحانات

مدرسہ سانحہ مونگیر سے دارالعلوم دیوبند آنے کے بعد مفتی صاحب نے یہ پہلی کتاب لکھی، مفتی صاحب کے اندر تحریر و تصنیف کی جس صلاحیت کا مشاہدہ مولانا حسین احمد مدنی اور قاری محمد طیبؒ نے مونگیر کے جلسہ میں کیا تھا اس کو استعمال کرنے کے لیے ان کو دارالعلوم میں ملازمت کی پیش کش کی گئی اور ان سے

جماعت اسلامی کے خلاف کتاب لکھنے کا کام لیا گیا۔

مفتی صاحب کے بقول ان کا قلم اختلافی مسائل میں نہیں چلتا تھا، مگر مولانا حسین احمد مدنی کے احترام میں اور قاری صاحب کے حکم پر ان کو یہ کام کرنا پڑا، چنانچہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

''حضرت قاری صاحب نے فرمایا کہ حضرت شیخ الاسلام کو مودودی جماعت سے سخت ذہنی بعد ہے، آپ پہلے ایک کتاب اس جماعت پر لکھ دیں پھر اس کے بعد کوئی دوسرا کام مثبت انداز کا شروع کریں'' (زندگی کا علمی سفر، ص:۱۲۹)

مولانا مودودیؒ پہلے الجمعیۃ اخبار کے ایڈیٹر تھے، بعد میں اس سے علیٰحدہ ہوگئے اور مسئلہ قومیت پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نقطہ نظر کے مخالف ہوئے، اصل مخالفت تو علامہ اقبال نے کی تھی اور اس حد تک کی کہ مولانا مدنی کی تضحیک کے لیے پوری نظم لکھ ڈالی جس کے یہ اشعار مشہور ہیں:

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سر منبر کہ قوم از وطن ست
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین از ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

مولانا مودودیؒ نے بھی ترجمان القرآن میں وطن کی بنیاد پر ہندو اور مسلم قوموں کو ایک قوم قرار دینے پر تنقید کی، نیز قومیت ''نیشنلزم'' کے موجودہ تصور پر تنقیدی مضامین لکھے، ان مضامین کا مجموعہ ۱۹۴۱ء میں مسئلہ قومیت کے نام سے شائع ہوا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ اب تک صرف جمعیۃ العلماء مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھی جاتی تھی مولانا مودودیؒ نے جماعت اسلامی کی بنا ڈالی اور پڑھے لکھے روشن خیال لوگ اس سے جڑنے لگے، اس لیے مولانا حسین احمد مدنی کو اس جماعت سے ذہنی بعد تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اس کے خلاف لٹریچر تیار کیا جائے، مفتی صاحب نے جب یہ کتاب لکھی تو دارالعلوم نے نہ صرف اس کتاب کو اچھی کتابت وطباعت کے ساتھ شائع کیا بلکہ بقول مفتی صاحب:

''اس وقت کے قاعدہ کے مطابق تمام مدرسین و ملازمین کو دی گئی، بحمداللہ پسند کی گئی اور سب سے زیادہ ہمارے مرشد حضرت شیخ الاسلام (مولانا حسین احمد مدنی) نے پسند کیا اور حوصلہ افزا کلمات فرمائے''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص:۱۲۹)

وقت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ایمرجنسی کے زمانہ میں جب جماعت اسلامی کے افراد کو قید کیا گیا تو قاری محمد طیب صاحب اور مفتی ظفیر صاحب پر بھی جماعت اسلامی سے وابستگی کا الزام عائد کیا گیا، مفتی صاحب نے لکھا ہے:

''اس جماعت کے مخالفین نے جس میں دارالعلوم کے بعض متعلق افراد بھی داخل تھے درخواست دی کہ مہتمم صاحب کا جماعت اسلامی سے تعلق ہے اور اس میں خاکسار کا نام بھی دے دیا کہ یہ بھی جماعت اسلامی کا آدمی ہے''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص:۱۶۶)

اس سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ قاری صاحب کو ان کی وفات سے پہلے دارالعلوم کے اہتمام سے بے دخل کیا گیا او راس کے بعد مفتی ظفیر الدین صاحب کا کمرہ لوٹا گیا اور سامان جلایا گیا۔ حالاں کہ یہ دونوں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے متوسلین میں تھے۔

۴- تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانی صاحب

مولانا عبداللطیف نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق شیخ الحدیث و ناظم جامعہ مفتاح العلوم مئو، مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کے محبوب ترین اساتذہ میں سے تھے۔ آپ کا انتقال ۶؍جنوری ۱۹۷۳ء کو بالکل اچانک ہوا۔ شفیق استاذ کی موت کے صدمہ سے بے تاب شاگرد رشید نے چند رفقاء کے متوجہ کرنے پر پورے انہماک کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مولانا مرحوم کے شاگرد، رفقاء، احباب و اکابرین سے مولانا نعمانی مرحوم کے متعلق مختلف النوع مضامین تحریر کرا کر انھیں یکجا کر کے ''تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ'' کے نام سے شائع کیا، اس تذکرہ میں مولانا نعمانی کی علمی، درسی، ملّی و سیاسی خدمات پر بھرپور طریقہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا عبداللطیف نعمانیؒ یوپی اسمبلی کے رکن، کانگریس سے وابستہ اور جمعیۃ علمائے ہند کے صوبائی قائدین میں سے تھے۔ آپ نے مختلف پلیٹ فارموں سے ملّت کی جو وسیع تر خدمات انجام دی تھیں ان سب کا اعتراف اس مجموعۂ مضامین میں ملتا ہے۔ اخیر میں صوبائی اسمبلی کی وہ تعزیتی قرارداد بھی شامل ہے جس میں مرحوم کی خدمات کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل اس تذکرہ کو مفتاح العلوم مئو کے شعبۂ تصنیف وتالیف نے جنوری ۱۹۷۴ء میں شائع کیا ہے۔

۵- زندگی کا علمی سفر

مفتی صاحب مرحوم کی تصنیفات میں اہم ترین تصنیف ہے جسے المعہد الاسلامی حیدرآباد نے نہایت اہتمام کے ساتھ مکتبہ نعیمیہ دیوبند سے غالباً ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰۰۳ء میں شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں مرحوم نے اپنی زندگی

کے بہت سے تجربات کا نچوڑ قارئین کے سامنے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ صرف قرأت تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ان واقعات کا عینی شاہد بن جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند، اگرچہ مرحوم کی مادرِ علمی نہیں رہا لیکن میدانِ عمل ضرور بنا۔ اپنی زندگی کا نصف سے زائد حصّہ مرحوم نے اس ادارے کی خدمت میں گذارا۔ اس میں اپنے علم وفضل کا لوہا منوایا، حاسدین ومخالفین کو کبھی کوئی ایسا جواب تو نہیں دیا جو کسی کی شان کے منافی ہو، لیکن اپنے کام سے ہر محاذ پر انھیں خاموش ضرور کیا۔

دارالعلوم دیوبند کے اجلاسِ صدسالہ کے بعد پیش آنے والے تکلیف دہ واقعات کو آپ نے اس خوبصورتی اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی داد دیے بنا نہیں رہا جاسکتا۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ اور ان کے ہم نوا علمی قافلے کے ساتھ مذہبی جبّہ و دستار سے آراستہ سیاسی شخصیات نے دارالعلوم دیوبند پر قبضہ واقتدار حاصل کرنے کے لیے جو ہتک آمیز رویّہ اختیار کیا اس کا اندازہ اسی واقعہ سے ہوجاتا ہے جو مولانا مرحوم نے اس بیش بہا تصنیف میں ص ۱۷۵ سے ص ۱۷۸ تک قدرے اشارات و کنایات میں کیا ہے۔ انتظامیہ میں تبدیلی کے اثرات سے مولانا مرحوم جیسے مصنف ومحقق کو، کن تکلیف دہ حالات سے گذرنا پڑا اس کا اندازہ مولانا مرحوم کے اس کرب ناک اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

> ''۱۹؍اپریل کا ٹکٹ بنوا کر ۲۰؍اپریل ۱۹۸۲ء کو دیوبند دو بجے رات میں آ گیا۔ پہلے ایک نظر کمرہ پر ڈالی، سکتہ میں آ گیا۔ یہاں اینٹ کے سوا کوئی چیز نہیں تھی، کپڑے، بستر، جاڑے کے گرم سامان، ایک شادی کا سامان اور ساری کتابیں لٹ چکی تھیں، پھٹے ہوئے بہت سارے خطوط کے ٹکڑے ایک فٹ اونچے، کمرہ میں بکھرے

ہوئے تھے (اناللہ وانا الیہ راجعون)'' (ص ۱۷۷)

آگے تحریر فرماتے ہیں:

''اب فکر یہ تھی کہ رات میں سونے کا انتظام کیا ہوگا؟ کچھ بھی کمرہ میں نہیں تھا، ایک لڑکے نے ایک چارپائی لاکر دی، دوسرے نے بستر لاکر دیا، اپنے کمرے کے برآمدے میں لیٹ گیا، کسی نے مچھر دانی بھی دی، کمرہ میں نہ بلب تھا نہ پانی کا سلسلہ''۔ (۱۷۸-۱۷۷)۔

مزید تکلیف دہ حالات ان جملوں سے ظاہر کرتے ہیں کہ:

''میں نے دو ایک طالب العلم سے کہا کہ بکھرے ہوئے خطوط جو سالم ہیں، یا ایسے جو پڑھے جاسکتے ہیں، ان کے چننے میں میری مدد کرو، میں نے خود ان کے ساتھ مل کر ان کو چن کر اکٹھا کیا، مسوّدات سارے غائب تھے، کتابوں کے مسودوں کے غم نے نڈھال کردیا، میری ساری سندیں بھی لے گئے، توانائی ایسا معلوم ہوا سلب ہوتی جارہی ہے، کافی دل و دماغ متاثر تھا''۔ (ص ۱۷۸)

درج بالا عبارتوں کے ٹکڑوں سے ایسے شخص کی کیفیت کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں جس کی متاعِ حیات محض اس جرم کی پاداش میں زیر زبر کردی گئی ہو جس نے کبھی کسی ایسی سرگرمی میں حصّہ نہیں لیا جس سے کسی کا وقار مجروح ہوتا ہو، لیکن اپنی علم پسند طبیعت کے باعث وہ اس طبقۂ علماء کے ساتھ رہا جو سیاست سے کنارہ کشی کیے ہوئے دارالعلوم دیوبند کو محض علمی وقار عطا کرنے میں اپنا سب کچھ نچھاور کیے ہوئے تھا۔

کتاب کا اسلوب نگارش بہت ہی عمدہ ہے، لیکن کہیں کہیں کوئی تسامح بھی

نظر آجاتا ہے جس کی وجہ غالباً مفتی صاحب مرحوم کی کبرسنی کی بنا پر یادداشت کی وہ کمزوری ہے جو عموماً اس عمر میں لاحق ہوجاتی ہے۔ مثلاً

''ایک واقعہ یاد آیا، اندرا گاندھی نے ۱۹۷۷ء سے ملک میں ایمرجنسی کا قانون نافذ کیا یہ وقت بڑا سخت تھا۔'' (ص ۱۶۶)

آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

''درخواست دی کہ مہتمم صاحب کا جماعت اسلامی سے تعلق ہے اور اسی میں خاکسار کا بھی نام دے دیا کہ یہ بھی جماعت اسلامی کا آدمی ہے۔ اسی طرح عامر عثمانی مرحوم کے خلاف بھی درخواست دی گئی''۔ (ایضاً)

مذکورہ بالا واقعات کی صداقت سے قطع نظر اس سلسلے میں دو باتیں طالبعلمانہ عرض کرنی ضروری ہیں (۱) ایمرجنسی کا نفاذ ۲۵ر جون ۱۹۷۵ء کو ہوا تھا، ۱۸ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ختم کردی گئی تھی۔ (۲) عامر عثمانی صاحب مرحوم ایمرجنسی کے نفاذ سے قبل ہی اپریل ۱۹۷۵ء میں پونا کے ایک عالمی مشاعرہ میں شرکت کرتے ہوئے اسٹیج پر ہی داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے تھے۔ میرے خیال میں اس سلسلہ میں مصنف مرحوم کو تسامح ہوا ہے۔

18x22 سائز کے ۲۱۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ہر ہر لفظ تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب مرحوم کے دلی جذبات کا آئینہ دار بھی ہے۔

۶- مجالسِ حکیم الاسلام

بقیۃ السلف حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا شمار ماضی قریب کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے رشد و ہدایت، علم و فضل اور انتظام و انصرام کی وہ تمام ذمّہ داریاں بحسن وخوبی نبھائیں جو ان کے بزرگوں نے

اللہ کی مدد کے بھروسہ پر ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں تفویض کی تھیں۔

نمونۂ اسلاف قاری محمد طیب صاحبؒ جن کے سابقے ''حکیم الاسلام حضرت مولانا'' اور لاحقے ''مہتمم دارالعلوم دیوبند'' اس ذات کا جزو لاینفک بن گئے تھے، ان کی ساٹھ سالہ خدماتِ دارالعلوم کا صلہ غیروں نے نہیں بلکہ اپنوں نے ہی جس بھیانک ومکروہ انداز سے دے کر انھیں وفات سے صرف سوا سال پہلے اُس دارالعلوم دیوبند کے اقتدار سے بے دخل کیا جو ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا اور جس کی ہر خدمت انھوں نے بطورِ عبادت انجام دی تھی، اُسی دارالعلوم پر ۲۲/ ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء کی درمیانی رات کچھ سیاسی شہ زوروں کے اشارے پر پی-اے سی اور غنڈوں کی مدد سے شب خون مار کر اقتدار کی منتقلی کا عمل انجام دیا گیا۔ نیک طینت، صابر وشاکر اللہ کے اس ولی نے اُن صبر آزما اور تکلیف دہ حالات میں جس کردار کا مظاہرہ کیا وہ اپنی جگہ ایک تاریخ ہے اس کی مثال موجودہ خودغرض زمانے میں تو کیا ماضی قریب کی کئی صدیوں میں بھی مشکل سے ہی ملے گی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، صرف اپنی تقریر وتحریر کی وجہ سے ہی متعارف نہیں ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو انتظام وانصرام کی بھی بھرپور صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اور رشد وہدایت کے درجہ پر بھی فائز کیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے انتظام کے ساتھ ساتھ عوام وخواص کی ظاہری وباطنی اصلاح کی ذمہ داریاں بھی مرحوم نے تاعمر نبھائیں۔ مفتی ظفیر الدین صاحب مرحوم نے دیوبند آنے کے بعد مرحوم قاری صاحبؒ کے اخلاق وکردار، حسن سلوک اور معاملات کا قریبی مشاہدہ کیا تھا۔ آپ کو اپنے مرشد مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بعد کسی ایسے مرشد کی تلاش تھی جو اصلاح باطن کا فریضہ انجام دے سکے، چنانچہ نظر انتخاب حکیم الاسلام علیہ الرحمہ پر جا کر ٹھہر گئی اور آپ اس مرشدِ کامل کے کاروانِ

رشد وہدایت میں شامل ہو کر ان ہیروں وجواہرات کی تلاش میں لگ گئے جو انسان کے اخلاقی وروحانی خزانوں کو مالا مال کردے، چنانچہ آپ نے بالاستیعاب حکیم الاسلام کی ان عمومی وخصوصی مجالس میں جانا شروع کر دیا جہاں علم وحکمت کے موتی اور الفاظ کے پھول بکھرتے تھے، آپ نے ان موتیوں اور پھولوں کو یکجا کر کے قیمتی ہار کی مانند ''مجالسِ حکیم الاسلام'' کے نام سے ترتیب دیا جو 18x22 سائز کے تقریباً ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ربیع الاول ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء میں (حکیم الاسلام کی وفات کے تقریباً چار سال بعد) ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان، پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب بہ یک وقت پورے برِّ صغیر یعنی ہندوستان، پاکستان وبنگلہ دیش میں شائع ہوئی اور ہر جگہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ابتدائی تقریباً ساٹھ صفحات میں خاندانِ قاسمی کے مختصر ترین احوال ذکر کر کے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کے ابتدائی ایام سے اس وقت تک کے حالات جب کہ وہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بنائے گئے تھے، قدرے ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد مجالس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں تقریباً تئیس مجالس کی تفصیلات ہیں۔

مفتی صاحب مرحوم نے مجالس حکیم الاسلام کی صورت میں جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ بعد میں بہت مقبول ہوا اور اس نام سے بعد میں بہت سے حضرات نے اس سلسلہ کو مفید وکارآمد سمجھتے ہوئے اپنی قلمبند یادداشتوں کو زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔

مفتی صاحب مرحوم نے اپنی اس تصنیف میں حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کے اس زمانے کے حالات کا تذکرہ نہ کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ کسی قضیہ یا متنازعہ بات میں پڑ کر اپنی اس شاہ کار کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتے۔

۷- حیات مولانا گیلانیؒ

اکابرینِ دیوبند میں تصنیف وتحقیق کے میدان میں جن شخصیات کا نام فرطِ عقیدت سے لیا جاتا ہے ان میں ایک نام مولانا سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ کا بھی ہے۔ جن کی پیدائش ۸؍ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو موضع استھانواں ضلع پٹنہ بہار میں ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی جو سوانح مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے لکھی تھی وہ بہت ہی مجمل ومختصر تھی اسے شرح وبسط کے ساتھ ترتیب ثانی کے لیے دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کو منتخب کیا جنھوں نے بہت ہی محققانہ ومدبرانہ انداز سے اس کام کو علمی وتحقیقی بنادیا۔

علاوہ ازیں مولانا گیلانیؒ نے دارالعلوم دیوبند میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے اور دوسرے اداروں میں بھی تدریسی وتصنیفی خدمات انجام دیں جن میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں صدر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے آپ نے بہت زیادہ شہرت پائی۔

تصنیف وتالیف، مولانا گیلانیؒ کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ اپنے دور کے ان علماء، ادباء وفضلاء میں شمار ہوتے تھے جو علم وتحقیق کی آخری سند کا درجہ حاصل کیے ہوئے تھے۔

۵؍جون ۱۹۵۶ء کو گیلان صوبہ بہار میں مولانا گیلانی کا انتقال ہوا تو مفتی صاحب مرحوم کو اپنے محسن ومربّی کی دائمی جدائی کا شدید احساس ہوا، انھیں احساس وجذبات کو علمی وقلمی شکل دینے کے لیے مفتی صاحب مرحوم نے مولانا گیلانی مرحوم کی سوانح بہ عنوان ''حیاتِ مولانا گیلانیؒ'' تحریر فرمائی، جس میں مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف ادوار اور آپ کی علمی، دینی اور تعلیمی خدمات کا تذکرہ دل نشیں

انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو مولانا یوسف اکیڈمی بنارس نے ربیع الاول ۱۴۱۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ فاضل مصنف نے کتاب کو مولانا گیلانی کی حیات وخدمات اور والہانہ عقیدت تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اسے حقیقت کی کسوٹی پر بھی پرکھا۔

اس کتاب میں مولانا مناظر احسن گیلانی کے خاندان اور ان کے آباو واجداد پر بھی سرسری تذکرہ ملتا ہے اور مولانا کی ولادت، تعلیم وتربیت، مادرِ علمی سے ان کے تعلق، اساتذہ کے ساتھ ان کی محبت، تدریس وتحقیق کے میدان سے مولانا کے طبعی میلان اور تصنیف وتالیف کے میدان میں مولانا کی خدمات کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب 18x22 سائز کے ۳۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا گیلانی کے تعلق سے یہ کتاب نہایت معلوماتی اور مفید ہے۔

۸- اسلام کا نظامِ تعمیر سیرت

مارچ ۱۹۶۵ء میں مصطفائی کتب خانہ سالم کمپنی دیوبند سے شائع شدہ مفتی صاحب کی پیش نظر کتاب کو اگر ''اسلام کا نظامِ عفت وعصمت'' کی تلخیص کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا، لیکن دونوں میں ایک فرق یہ ہے کہ ''عفت وعصمت'' میں مفتی صاحب مرحوم نے اسلام کے اس پورے نظام کو پیش کیا ہے جو انسان کے کردار کو بلندی، نظر کو پاکیزگی اور نفس کو ضبط کی تلقین کرتا ہے جب کہ پیش نظر کتاب میں مصنف نے بطورِ خاص اُس اخلاقی خرابی کو اپنی تحریر کا مرکزی نقطۂ بنایا ہے جو نہ جانے کن دروازوں سے اور کس طریقہ پر اپنی قباحت وشناعت کے باوجود انسانی سماج میں جڑ پکڑ گیا ہے اور اس کی خباثت سے نہ تو وہ اقامت گاہیں محفوظ رہ سکیں جہاں نئی نسل کی تربیت سازی کا کام ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ادارے

پوری طرح محفوظ رہ سکے جو دین و مذہب کی چھاؤنیاں کہلاتی ہیں۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں موجودہ دور میں اس غیر انسانی فعل کو قانونی جواز دے دیا گیا ہے۔ خود ہندوستان میں بھی گذشتہ دنوں اس قسم کی کوششیں کی گئیں جن سے اس بُرائی کو قانونی درجہ حاصل ہوکر معاشرے کی رہی سہی آبرو کو جنسی بے راہ روی کی بھینٹ چڑھادیا جائے۔

مفتی صاحب مرحوم نے 20x30/16 سائز کے ۱۴۴ صفحات کی اس کتاب میں اس عملِ قبیح کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے اوراُن کے انجام پر بھی جو اس بدکرداری کے موجد کہلاتے ہیں۔ اسلام نے اخلاق و کردار سازی کے لیے کیا نسخے تجویز کیے آپ نے اُن نسخوں کی بھی نشان دہی کی اوراگر کوئی لعنتی اس کے باوجود بھی ان حرکات و اعمال سے باز نہ آئے تو اس کی سزا کا تعین اسلامی تعلیمات میں ملتا ہے اس کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس برائی کی طرف ترغیب دینے والے عوارضات سے بچنے کے جو طریقے اسلامی تعلیمات میں ملتے ہیں ان سب پر آپ نے قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں تفصیلات فراہم .....ان وجوہات پر بھی متوجہ کیا ہے جس کی بنا پر یہ وبا تعلیمی اداروں میں پھیلتی اور پھولتی ہے اور قارئین کو اس دَلدَل سے دور رہنے کی تلقین اس انداز سے کی ہے کہ:

> ''اسکول، کالج، یونیورسٹی اور ساتھ ہی عربی مدرسوں کے اساتذہ ان (امرد لڑکوں) سے بے تکلف ہوتے ہیں، اس سلسلے میں وہ پورے احتیاط سے کام لیں، اس طرح بے ریش لڑکوں کو نظر بھر کر دیکھنے کی کوشش بھی نہ کریں، نہ ان کو تنہائی میں اپنی خدمت کے لیے رکھیں اور نہ اپنے سے بے تکلف بنائیں۔
>
> جو لوگ احتیاط نہیں برتتے اوران سے خدمت لیتے ہیں وہ ہر وقت جہنم کے کنارے کھڑے ہوتے ہیں، پتہ نہیں کہ کس وقت وہ اس

> دہکتی آگ میں اپنے کو ڈال دیں''۔(ص ۱۲۸)

کتاب پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا منت اللہ رحمانی صاحب مرحوم اور مولانا عبدالصمد رحمانی مرحوم کی تقاریظ نے کتاب کو مستند بنادیا ہے۔

۹- اسلام کا نظامِ امن

اسلام میں امن وامان کی اہمیت، دینی حکومت کا امتیاز، خلفائے راشدین کے انصاف کا اثر، دشمنوں سے حسن سلوک، فتنہ وفساد کی روک تھام، عہد و پیمان کی عظمت، اخوّت ومساوات، عدل وانصاف، جان و مال اورعزتِ نفس کے تحفظ پر مفتی صاحب مرحوم کی محققانہ تحقیق کا نام ''اسلام کا نظام امن'' ہے۔

یہ کتاب جنوری ۱۹۶۶ء/ رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ میں مدرسہ مفتاح العلوم مئو ناتھ بھنجن کے شعبۂ تصنیف و تالیف نے شائع کی۔ مولانا کی نسبت ''مفتاحی'' کا تعلق اسی درس گاہ سے شرفِ تلمّذ حاصل کرنے کی بنا پر ہے اسی لیے آپ نے اپنی اس تالیف کو اپنی مادرعلمی کے نام انتساب کیا ہے۔

کتاب کے مرکزی موضوعات میں ''اسلام سے پہلے امن وامان اور عدل ومساوات کی پامالی'' عہد اسلام میں امن و امان، صحابہ کرام کی عملی زندگی، حکمراں طبقہ اسلام کی نظر میں، اسلام میں عدل ومساوات، جنگ اور انتقام، مذہبی آزادی وغیرہ جیسے موضوعات پر تاریخی وشرعی حوالوں سے گفتگو کرکے اسلام میں عالمگیر اخوت ومحبت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد اسلام نے جن دفاعی تدابیر یعنی بدامنی وقتل وغارت گری کو روکنے کی جو تدابیر بیان کی ہیں ان کے ساتھ ساتھ ان کی مصلحتوں پر بھی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلام میں حفاظتِ جان اور اس کی قدر و قیمت، قتل کی سزا، قتل خطا اور

اس کی روک تھام، فتنہ وفساد اور رہزنی، مال کا تحفظ، عفت وعصمت اور انساب کا تحفظ، عقل کی حفاظت وغیرہ پر اسلام نے جو رہنمائی کی ہے اس کی تمام جزئیات پر بحث کی گئی ہے اور پھر اخیر میں اسلام کے تعزیری قوانین پر کتاب ختم ہوجاتی ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ مصنف نے اپنے انداز پر ارباب اقتدار کو نصیحت بھی کی ہے اور انہیں ظلم وستم سے بچنے کی تلقین بھی۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

''یہ اصول اربابِ حکومت کے ذہن نشیں کردینا چاہیے کہ ظلم و تعدی اور نا انصافی حکومت کی جڑ کو کھوکھلا کردیتی ہے اور عدل و مساوات سے حکومت کی بنیاد استوار ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بھی اسی سلطنت کو باقی رکھتا ہے جو انصاف پسند ہو، ظالم سلطنت کی مدد من جانب اللہ نہیں ہوتی''۔ (ص ۱۰۵)

آگے اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ:

''ہر شعبۂ زندگی میں ایسا پرسکون ماحول ہو کہ کسی انسان کی حرّیت فکر مجروح نہ ہونے پائے، مذہبی آزادی کا گلا نہ گھٹے، پھر قتل و عصمت دری، لوٹ مار، فتنہ وفساد اور مردم آزاری کا نام ونشان تک باقی نہ ہو بلکہ ہر جگہ اور ہر شعبۂ حیات میں امن وسلامتی ہو اور صلح وآشتی کا جذبہ کارفرما ہو''۔ (ص ۱۹۷)

الغرض 20x26/8 کے ۳۸۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کو اسلام کی دستاویزِ امن بھی کہا جاسکتا ہے جس میں امن وامان پر مشتمل معاشرے کی تشکیل کا مکمل خاکہ جامع انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۰- مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند، برِّ صغیر کی اُن ممتاز، دینی تعلیمی درس گاہوں میں ہے

جس کے فضلاء نے گذشتہ ڈیڑھ سو سالوں میں زندگی کے تمام شعبہ جات میں امتِ مسلمہ کی ہر سطح پر رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں اس درس گاہ نے اپنے قیام کے زائد از ایک سو سال مکمل کرلینے پر ایک بڑا اجلاس بہ عنوان ''اجلاس صدسالہ'' منعقد کیا۔ اس موقع پر منتظمینِ دارالعلوم دیوبند کو یہ خیال آیا کہ اس درس گاہ کے مشاہیر فضلاء کرام کی مختلف النوع خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے ان کا تذکرہ کتابی صورت میں ہو، اس کام کے لیے نظرِ انتخاب مفتی ظفیر الدین صاحب پر جاکر ٹھہر گئی، وقت کی قلت کے باوجود حضرت مفتی صاحب نے اس کام کو بہ حسن وخوبی انجام دیا۔

دارالعلوم دیوبند کے دفتر اجلاسِ صدسالہ سے ۱۱۲ صفحات کے چھوٹی تقطیعی صفحات پر زائد از نوے ان علمائے کرام کا تذکرہ شامل ہے جو درس و تدریس، تصنیف وتالیف، وعظ وتبلیغ اور تعلیم وتربیت سے انسانی زندگی کے تنِ مردہ میں روح پھونک کر اگرچہ دنیا سے مونہہ موڑ گئے لیکن اپنے علم وعمل سے دنیا کو پیغام دے گئے کہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

کتاب مختصر ہے جو دارالعلوم دیوبند کے اکابرین کے مختصر ترین ضروری تذکروں پر مشتمل ہے۔ مفتی صاحب مرحوم کے اسلوب نگارش اور ادبی ذوق نے اس تذکرہ جاتی کتاب کو بھی ایک بہترین ادبی قالب عطا کیا ہے۔

۱۱- اسوۂ حسنہ (مصائب سرورِ کونین ﷺ)

یہ کتاب محرم ۱۳۷۹ھ مطابق جولائی ۱۹۵۹ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی، اس وقت مفتی صاحب مرحوم ندوۃ المصنفین کے اعزازی رفیق کے

ساتھ ساتھ دارالعلوم معینیہ سانحہ، ضلع مونگیر میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔

یہ کتاب 20x30/16 سائز کے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، سیرت سے متعلق اس کتاب کو ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع وہ مصائب و آلام ہیں جو رسولِ اکرم ﷺ کو اسلام کی دعوت کے تعلق سے مکی زندگی میں پیش آئے، ابتدائی چند صفحات میں مؤلف نے نبوت سے پہلے کے ان مصائب و آلام کا بھی ذکر کیا ہے جو ذاتِ نبویؐ کو پیش آئے، لیکن یہ مصائب عوامی نہیں قدرتی تھے، مثلاً داغِ یتیمی، مادرِ مہربان کی دائمی مفارقت، دادا کی وفات ومعاشی پریشانیاں وغیرہ۔ اسی کے ساتھ ساتھ مکہ کے ماحول پر سرسری نظر ڈال کر رسول اکرم ﷺ کی حساس طبیعت پر اثر انداز ہونے والے ان اثرات کا ذکر کرتے ہوئے عہدِ نبوت میں پیش آنے والے مصائب و آلام کو بطور خاص ذکر کیا ہے، مشرکین مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے کی غرض سے جو تدابیر اختیار کی تھیں، وہ کبھی تو بذاتِ خود ذاتِ رسولِ اکرم ﷺ ہوتی تھی اور کبھی دوسرے طریقوں سے تکالیف پہونچائی جاتی تھیں۔ آپؐ پر کیے جانے والے بے انتہا مظالم کے ساتھ ساتھ اہل بیت بھی مصائب کا سلسلہ مکہ مکرّمہ میں مشرکین کی طرف سے دراز رہا تو مدینہ منورہ میں منافقین کی شیطنت وشرارتیں بھی ایذا رسانی میں کسی درجہ کم نہیں تھیں۔ مصنف نے ان تمام واقعات کو کہیں اشارت و کنایات میں اور کہیں کہیں تاریخی وضاحتوں کے ساتھ قارئین تک پہونچایا ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کو مٹانے کی ناپاک تدبیروں میں ''قتلِ نبی'' کی تجویز سے لے کر آنحضرتؐ پر کیے جانے والے جادو تک کے مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔

''رحمت عالم کا فقر و فاقہ'' اور اس سلسلے کی اذیتوں کے علاوہ اپنے جاں نثاروں سے نادانستہ پہونچنے والی اذیتوں اور قدرتی مصائب و آلام پر اس کتاب کا اختتام کیا گیا ہے۔

''اختتامی تتمّہ'' مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو اس کتاب کی اشاعت کا مقصد کہا جاسکتا ہے۔ اس میں مصنف نے قارئین کی دکھتی رگوں پر اس طرح ہاتھ رکھا ہے:

> ''تھوڑی دیر کے لیے ہر چیز سے یکسو ہوکر غور کیجیے، کون سی ایسی اذیت، تکلیف، درد، دکھ اور مصیبت باقی رہ گئی جو رحمتِ عالمؐ کو نہ پہونچائی گئی ہو، جان، مال، اولاد، عزت و آبرو کس چیز پر مصیبت نہ آئی''۔ (ص ۱۸۹)

مصنف نے اخیر میں جو پیغام دینے کی کوشش کی وہ اس طرح ہے:

> ''مسلمانوں پر آخری نبی کی امت ہونے کی حیثیت سے بڑی ذمہ داری ہے۔ ان واقعات کو جو لکھے جاچکے ہیں عبرت کی نگاہ سے پڑھیں اور سبق حاصل کریں، مصائب پر ماتم نہ کریں، اپنا فریضہ یاد کریں اور طے کرلیں کہ انہی مصائب سے دوچار ہوکر ہمیں بھی تبلیغ کا یہ فریضہ ادا کرنا ہے''۔ (ص ۱۹۰)

پوری کتاب مستند احادیث اور تاریخی حوالوں سے بھری ہوئی ہے، مفتی صاحب مرحوم نے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب کو ترتیب دیا ہے، غالباً یہ اس سلسلے کی پہلی جلد ہے جو سیرت کے تعلق سے مفتی صاحب مرحوم قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ موضوعاتی فہرست میں ہر موضوع کے اختتام پر آپنے رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ پیش کرکے قارئین کو رسولِ اکرم ﷺ کی عملی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لیے ترغیب دلائی ہے۔

سیرت کے موضوع پر یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے، اس کی دوسری جلدیں طبع ہوئیں یا نہیں اس کے متعلق معلومات فراہم نہ ہوسکیں اور نہ ہی وہ جلدیں دیکھنے کو ملیں۔

اللہ تعالیٰ مصنف مرحوم کی اس کوشش کو قبول فرمائے۔

۱۲- اسلام کا نظامِ مساجد

پیش نظر کتاب مفتی صاحب مرحوم کی پہلی معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ یہ کتاب ندوۃ المصنفین دہلی نے اپنے سلسلۂ مطبوعات کے تحت چوالیسویں نمبر پر ۱۹۵۱ء/ ۱۳۷۰ھ میں شائع کی۔ 20x30/8 سائز کے ۲۴۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مفتی صاحب مرحوم نے اسلام کے نظامِ مساجد کے تمام گوشوں پر مکمل و مدلل دل پذیر بحث کی ہے، کتاب پر مشہور مؤرخ مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا پیش لفظ بہ عنوان ''نقاب کشائی'' ہے جس میں مفتی صاحب مرحوم کی اس کوشش کو سراہا گیا ہے۔

کتاب کے مرکزی موضوعات تمہید، قدرتی نظامِ اجتماع، دعوتِ اجتماع، قدرتی نظامِ دعوت، باطنی اصلاح، اجتماع کے مرکزی گھر اور اس کی تعمیر، مواضعِ مسجد، دربارِ الٰہی میں دنیا کے کام، دربارِ الٰہی کی صفائی وغیرہ ہیں، اسی کے ضمن میں وقف اور تولیت کے چند فقہی جزئیات پر الگ سے بحث کی گئی ہے، تمام مرکزی موضوعات کے بہت سے ذیلی عنوانات ہیں۔

تمہیدی عنوانات میں کتاب کا آغاز ''روئے زمین کی پہلی مسجد'' سے ہوتا ہے پھر عہدِ نبوی کی پہلی مسجد، مسجد نبوی کی حیثیت، درجاتِ مساجد، مساجد کا قدرتی نظام اور مساجد کی اجتماعی حیثیت پر شرعی، فقہی و تاریخی حوالوں سے مستند و مدلل انداز میں ''نظامِ مساجد کی برتری'' کو ثابت کیا گیا ہے۔

''قدرتی نظامِ اجتماع'' کے ذیلی عناوین میں مساجد کے مرکزی گھر ہونے پر قرآن و احادیث سے ثبوت فراہم کر کے رسول اللہ ﷺ کے دستور کے ساتھ ساتھ ''نظمِ جماعت کی حکمتیں'' بیان کی گئی ہیں۔

''دعوت اجتماع'' کے تحت ''اذان کی ابتداء'' کلماتِ اذان کی حیثیت،

اذان کی تاریخ اور اس کی عظمت کے ساتھ ساتھ مؤذن کی حیثیت اور اس کی اجرت پر بھی فقہی و تاریخی حوالوں سے بحث کی گئی ہے، موجودہ دور میں مؤذن کی اجرت کے تعلق سے پوری بحث کرنے کے بعد آپ نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اس طرح ہے:

> ''اس بحث سے معلوم ہوا کہ مؤذن کو حتی الوسع اجرت سے بچنا چاہیے مگر کیا کیا جائے؟ ہمارے اس زمانے میں اذان دینا کسرِ شان ہے، بڑے لوگ اذان دینے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو مشاہرہ پر مؤذن کی نوبت ہی نہ آتی۔ خوش حال لوگوں نے دین غریبوں کو بخش دیا ہے اور خود بری الذمہ ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ جس اذان اور اذان دینے والے کی اتنی عظمت ہو، دین کے ماننے والے اس کو عار سمجھیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ (ص ۱۰۰)

درج بالا اقتباس سے حضرت مفتی صاحب مرحوم کا وہ درد بھی صاف جھلکتا محسوس ہوتا ہے جو عصرِ حاضر میں مساجد یا اربابِ مساجد میں ائمہ و مؤذنین کے ساتھ مسلم معاشرے کے رویے سے صاحبِ بصیرت علماء و مفتیان کرام کو محسوس ہوتا ہے۔

مسجد کے نظام پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد آخری باب میں ''وقت اور تولیت'' پر مختصر مگر جامع گفتگو کی گئی ہے، یہ گفتگو وقت اور تولیت کے بہت سے احکام پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے، اس ذیل میں ''موجودہ دور میں متولّی'' کے عنوان سے مفتی صاحب مرحوم نے وقف اور تولیت میں پائی جانے والی بدعنوانیوں پر اپنا دل کا درد اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''بایں ہمہ متولّی کی وقف کی اصلاح و ترقی سے چشم پوشی حد درجہ

افسوس ناک ہے اور قصداً وقت کے انتظام میں کوتاہی ناقابلِ برداشت ،عموماً یہ منظر کم وبیش ہر جگہ نظر آتا ہے کہ کافی آمدنی ہوتے ہوئے بھی مسجد کا نظام خراب سے خراب تر ہو رہا ہے، نہ مسجد میں صفائی ہے نہ روشنی کا انتظام ،فرش ٹوٹ رہا ہے، دیواریں گر رہی ہیں، وضو خانے میں پانی ناپید ہے، امام ومؤذنین وقت کی پابندی سے کام نہیں کرتے ہیں مزید یہ اور غضب ہے کہ وقت نامہ کی صراحت کے باوجود امام کا انتخاب صرف مشاہدہ کی وجہ سے نامعقول ہے، ایسا امام جو خود مسائلِ ضروریہ سے واقفیت نہ رکھتا ہو دوسروں کی رہنمائی کیا کرے گا؟''۔(ص۲۲۶)

مفتی صاحب مرحوم کی اس کتاب نے عوام وخواص میں مقبولیت حاصل کی، دانش ور طبقہ نے اسے بہت زیادہ سراہا۔لکھنؤ میں ظہیر النبی صاحب نے اس کا انگریزی ترجمہ کبھی کیا جو کتاب کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

۱۳- اسلام کا نظامِ عفت وعصمت

مفتی ظفیر الدین صاحب مرحوم کی یہ کتاب بھی ندوۃ المصنفین دہلی نے شوال المکرّم ۱۳۷۳ھ (جون ۱۹۵۴ء) میں شائع کی ہے۔ 20x26/8 کے ۲۹۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو وقت کا تقاضا بھی تھا اور شرعی ضرورت بھی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق میں جو عوامل کارفرما رکھے ہیں اگر ان کی بنیاد میں عفت وعصمت نہ ہو تو پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

ایک مرد اور ایک عورت سے چلنے والی انسانی دنیا کی بقاء کا دارومدار انھیں دونوں اصناف پر ہے لیکن ان دونوں اصناف میں کس قدر حزم واحتیاط سے کام لینا

پڑتا ہے اس کا تصور اسلامی تعلیمات میں ہی سب سے اچھے انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اگرچہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے بھی مرد وزن کے آزادانہ اختلاط کو پسند نہیں کیا لیکن اسلام نے اس مسئلہ پر جس قدر حسّاسیت کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔

زن وشوہر کے رشتہ کو وہ ''ھن لباس لکم وانتم لباس لہن'' سے تعبیر کرتا ہے،تو علاوہ ازیں دوسری نامحرم خواتین کے ساتھ مردوں کا اختلاط تو بعید از قیاس، ان تصورات سے بھی پرہیز کا مشورہ دیتا ہے جو اس کو غلط راستوں کی طرف لے جانے والے ہوں۔ الغرض اسلام نے عفت وعصمت کی پاکیزگی پر بہت زیادہ زور دیا ہے، مولانا مرحوم کی یہ کتاب انھیں موضوعات پر مشتمل ہے جو ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کے لیے مذہبی وعقلی طور پر ضروری ہے۔

مذکورہ کتاب میں عصمت وعفت کی جامعیت واہمیت پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے عفت وعصمت اور ان کے لوازمات کے ایک ایک گوشے پر عقلی و نقلی دلائل پیش کر کے اسلامی نظامِ عفت وعصمت کی خصوصیات کو اعتدال اور احتیاط کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔

بطورِ تمہید مفتی صاحب مرحوم نے ''قبل از اسلام عورتوں کی حیثیت اور ان کی عفت وعصمت کی بربادی'' پر تاریخی حوالوں سے روشنی ڈال کر ''عورتوں کی مظلومیت'' کو ثابت کیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے اسلام سے قبل دوسرے مذاہب میں عورتوں کی سماجی حیثیت پر بھی مدلّل بحث کی ہے۔

اسلام کے آنے کے بعد اس نے عورتوں کی اہمیت کو جس واشگاف انداز سے بیان کیا ہے اس سے ''لڑکیوں سے حسنِ سلوک کی ترغیب'' بھی ملتی ہے اور ''میراث میں عورتوں کے حصہ'' کی راہیں بھی فراہم ہوتی ہیں۔عورت کی مختلف النوع حیثیتوں کے حقوق کو بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔

زنا اور اس کے محرکات، نیز اس کی برائی اور اس کے جرمِ عظیم کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں ارشاداتِ نبوی نقل کرنے کے بعد ''اسلامی تعلیم سے روگردانی کا انجام'' عنوان کے تحت موجودہ زمانے میں اس برائی کے مرتکب ممالک میں اس کے اثراتِ بد پر تاریخی حوالوں سے گفتگو کی گئی ہے۔

''تحفظ عفت وعصمت اور شادی'' کے مرکزی عنوان کے تحت نکاح کا حکم، اس کی اہمیت، اس کے ذریعہ تحفظ عفت، افزائش نسل، پاک دامنی وغیرہ پر دلائل فراہم کرکے اسے رسولوں کی سنت ثابت کیا گیا ہے۔

المختصر مفتی صاحب مرحوم کی یہ تصنیف اپنے موضوع پر اسلام پسندوں کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہے جو مصنف مرحوم کے کثرتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ سماج پر ان کی وسعتِ نگاہی کو بھی ثابت کرتی ہے۔

۱۴- اسلامی حکومت کے نقش ونگار

درجِ بالا کتاب مفتاحی اکیڈمی مئو، کی پہلی تصنیف ہے جو سلسلۂ ''تاریخی حقائق'' کے ضمن میں پیش کی گئی ہے۔

مصنف نے اس کتاب کی غرضِ تالیف درج ذیل الفاظ میں اس طرح بیان کی ہے:

> ''زیرِ نظر کتاب سلسلۂ ''تاریخی حقائق'' کا ایک حصہ ہے جو حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم اور آپ کے عہد خلافت کے دوسرے ذمّہ دارانِ خلافت کے مخصوص واقعات پر مشتمل ہے۔ جس جذبہ کے تحت یہ مفید سلسلہ شروع کیا گیا ہے خدا کرے اسی جذبے کے ساتھ پڑھنے والے بھی ہاتھوں ہاتھ لیں اور مسلمانوں میں یہ تذکرہ عام ہوجائے۔ اگر ایسا ہوا تو اس کے بقیہ حصّے بھی بہت جلد

> پہونچتے رہیں گے۔ اپنا یقین ہے کہ یہ خوشگوار سلسلہ سیرت سازی کے لیے بے انتہا مفید اور معاون ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ یہ حقیر خدمت قبول فرمائے۔ (آمین)

مفتی صاحب مرحوم کی یہ تصنیف 20x30/16 سائز کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی شخصیات اور ان کی سیرت وکردار پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن اس سے قبل اصولی طور پر کچھ امور مثلاً جہاد، امارت اور خلافت وغیرہ پر ضمنی گفتگو کی گئی ہے۔

اگرچہ حجم کے اعتبار سے کتاب زیادہ بھاری نہیں ہے مگر اپنے موضوع کے لحاظ سے گراں قدر کتاب ہے۔ مصنف نے دونوں خلفاء کے اخلاق پیش کرنے کے بعد اختتام میں جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اس طرح ہے۔

''اللہ اکبر! یہ تھی مساوات! پھر وہ دنیا کے لیے باعث خیر و برکت کیوں نہ ہوتے۔ اب تو بڑے سے بڑا زاہد بھی اس طرح کا تصور پیش نہیں کرسکتا چہ جائے کہ حکمراں طبقہ کا کوئی فرد، جو اپنے کو فرعون ونمرود سے کم نہیں سمجھتا''۔ (ص ۱۴۰)

مفتی صاحب مرحوم کی درج بالا کتابیں ہیں، مفتی صاحب مرحوم کے ذوقِ تصنیف وتالیف کو سمجھنے کے لیے ہی بہت مواد فرہم کرتی ہیں، بہت سی کتابیں تلاشِ بسیار کے باوجود راقم کو نہیں مل سکیں۔

۱۵- مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے

اس کتاب میں ہندوستان کے بیس ممتاز علماء، فقہاء، مفکرین اور مصلحین کے ان مکتوبات کو جمع کیا گیا ہے جو اس کتاب کے مؤلف مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کے نام مختلف وقتوں میں لکھے گئے۔ یہ کتاب سوا تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور IOS کے چیرمین ڈاکٹر منظور عالم صاحب کے تعاون سے قاضی پبلشرز نئی

دہلی سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے:

''مکاتیب کا یہ گراں قدر مجموعہ جو مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی کے نام ہیں علمی وفکری قدر و قیمت کے ساتھ ایک تاریخی اہمیت و افادیت بھی رکھتا ہے اور اس کی طباعت واشاعت اس مجموعہ میں جو مشاہیر کے مکاتیب وخطوط کے عنوان سے کتب خانوں کی زینت ہے گراں قدر اضافہ کرتا ہے، جس کے لیے علمی وتاریخی ذوق رکھنے والوں اور زمانہ و ملک کی نبض اور نفسیات کے سمجھنے کا شوق رکھنے والوں کو مولانا کی اس پیش کش کا ممنون وشکر گذار ہونا چاہیے۔

جن بزرگوں کے مراسلوں کو کتاب میں جمع کیا گیا ہے مفتی صاحب نے ان کا مختصر تعارف اور ان سے اپنے ربط وتعلق کا حال بھی لکھا ہے، اس کتاب میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبداللطیف نعمانی، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی کفایت اللہ، مولانا زکریا کاندھلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا یوسف بنّوری اور مولانا نسیم احمد فریدی جیسے اہل علم کے خطوط ہیں۔

۱۶- امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب

مسلمانوں کو شریعت کا پابند بنانے اور اسلامی معاشرہ میں قوانین اسلامی کا احترام کرنے اور اس کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں ہندوستان میں جو منظّم کوششیں ہوئی ہیں ان کا ایک علمی نمونہ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھاڑکھنڈ ہے، مفتی صاحب نے اس کتاب میں امارت شرعیہ کے طریقہ کار اور کارناموں کا تعارف کرانے کے

ساتھ ہندوستان میں امارت کی شرعی حیثیت اور اس تحریک کے نشو ونما وغیرہ پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس کتاب پر گراں قدر مقدمہ تحریر کیا ہے۔ کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ سے ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی ہے۔

۱۷- تاریخ مساجد

یہ کتاب مفتی صاحب نے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے ایما پر لکھنا شروع کیا تھا۔ مولانا گیلانی نے مفتی صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا تھا:

''تاریخ المساجد کے متعلق مطالعہ جاری رکھیے، یہ آسان کام نہیں ہے۔ چند کتابوں کو پڑھ لینے کے بعد آپ کو کافی مواد مل جائے گا۔ جلدی سے کام نہ لیجیے۔ برس دو برس یا جتنی مدت بھی لگ جائے اس کا خیال نہ کیجیے۔ یادداشت کی ایک کتاب بنالیجیے اور مطالعہ جاری رکھیے''۔ (علمی مراسلے، ص ۸۷)

مفتی صاحب نے تدریسی وتصنیفی زندگی کے ابتدائی ایام میں اس کا مواد جمع کرنا شروع کردیا تھا، اس میں ہندوستان اور دنیا کی دوسری قدیم مساجد کے احوال جہاں تک ان کو معلومات فراہم ہوسکیں رقم کیا ہے اور کہنا چاہیے کہ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے بھی مفید معلومات کو جمع کیا ہے۔ یہ کتاب ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا گیلانی کے حرف آغاز اور مولانا منت اللہ رحمانی کے تعارف کے ساتھ یہ کتاب ۱۹۹۰ء میں جامع مسجد کھٹیکان جموں سے شائع ہوئی ہے۔ مفتی صاحب کے شاگرد مولانا صدرالحسن قاسمی نے اس کی طباعت کا اہتمام کیا ہے۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کی تصانیف ایک نظر میں

ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی

	نام کتاب	صفحات	سن اشاعت	مطبع
۱-	اسلام کا نظام مساجد	۳۹۲	باراول	ندوۃ المصنفین، دہلی
			دوم ۲۰۰۴ء	دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ظہیر النبی صاحب نے Mosque in Islam کے نام سے کیا ہے جو IOS نئی دہلی سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے۔

۲-	اسلام کا نظام عفت عصمت	۲۹۱	اول ۱۹۶۲ء	ندوۃ المصنفین ، دہلی ۔
			سوم دوم ۱۹۹۰ء	
			۲۰۰۷ء	دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ Modesty and chastity in Islam کے نام سے پہلے کویت سے اور دوسری بار ۱۹۹۳ء میں قاضی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔
فارسی ترجمہ 'حجاب وعفت از دیدگاہ اسلام' کے نام سے تہران سے شائع ہوا ہے۔

۳-	تاریخ مساجد	۲۷۲		جموں کشمیر
۴-	اسوۂ حسنہ	۱۹۱	طبع اول	ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۵۹ء
			دوم ۲۰۰۴ء	فرید بکڈپو، نئی دہلی
۵-	فتاوی دارالعلوم جلد اول	۳۴۸	اول ۱۹۶۲ء	دارالعلوم دیوبند
۶-	،، دوم	۲۶۸	اول ۱۹۶۳ء	،، ،،
۷-	،، سوم	۴۰۴	دوم ۱۹۷۱ء	،، ،،

۸-	،، چہارم	۴۹۶		،،	،،
۹-	،، پنجم	۴۸۰	دوم ۱۹۷۲ء	،،	،،
۱۰-	،، ششم			،،	،،
۱۱-	،، ہفتم	۵۲۷	۱۹۷۰ء	،،	،،
۱۲-	،، ہشتم	۴۴۸	۱۹۷۲ء	،،	،،
۱۳-	،، نہم	۴۸۸	۱۹۷۴ء	،،	،،
۱۴-	،، دہم			،،	،،
۱۵-	،، یازدہم	۱۶۴	۱۹۸۰ء	،،	،،
۱۶-	،، دوازدہم			،،	،،
۱۷-	تعارف مخطوطات اول	۲۶۸	۱۹۷۰ء	،،	،،
۱۸-	تعارف مخطوطات دوم	۲۹۶	۱۹۷۳ء	،،	،،
۱۹-	جماعت اسلامی کے دینی رجحانات	۲۳۰	۱۳۷۶ھ	،،	،،
۲۰-	مشاہیر علماء دیوبند	۱۱۱	۱۹۸۰ء	،،	،،
۲۱-	دارالعلوم قیام اور اس کا پس منظر	۳۲	۱۹۸۰ء	،،	،،
۲۲-	دارالعلوم ایک عظیم مکتب فکر	۲۴	۱۹۸۰ء	اجلاس صدسالہ، دارالعلوم دیوبند	
۲۳-	نظام تربیت			اس کتاب کا عربی ترجمہ دارالعلوم دیوبند نے عنایۃ الاسلام بتربیۃ الاطفال کے نام سے شائع کیا ہے۔	
۲۴-	نظام تعمیر سیرت	۱۷۶	۱۹۷۲ء	مصطفائی کتب خانہ، دیوبند	
۲۵-	مسائل حج وعمرہ				

۲۶- اسلام کا نظام حیات	۳۲		مجلس تحقیقاتِ علمیہ دارالعلوم شاہ بہلول، سہارنپور	
۲۷- درس قرآن، جلد اول، پارہ ۱ تا ۳			ادارہ درس قرآن دیوبند	
۲۸- ،، دوم ،، ۴-۶		۱۹۶۷ء	،،	،،
۲۹- ،، سوم ،، ۷-۹			،،	،،
۳۰- ،، چہارم ،، ۱۰-۲۱		۱۹۶۷ء	،،	،،
۳۱- ،، پنجم ،، ۱۳-۱۵		۱۹۶۸ء	،،	،،
۳۲- ،، ششم ،، ۱۶-۱۸		۱۹۶۸-۶۹ء	،،	،،
۳۳- ،، ہفتم ،، ۱۹-۲۱		۱۹۷۰ء	،،	،،
۳۴- ،، ہشتم ،، ۲۲-۲۴		۱۹۷۰-۷۱ء	،،	،،
۳۵- ،، نہم ،، ۲۵-۲۷			،،	،،
۳۶- ،، دہم ،، ۲۸-۳۰		۱۹۷۱ء	،،	،،
۳۷- حکیم الاسلام اور ان کی مجالس				
۳۸- جرم و سزا کتاب و سنت کی روشنی میں	۱۱۲	۱۹۷۱ء	قاسمی کتب خانہ، جموں کشمیر	
۳۹- اسلامی حکومت کے نقش و نگار	۱۴۴	۱۹۶۵ء	مفتاحی اکیڈمی، مئو	
۴۰- اسلام کا نظام امن	۳۸۴	اول ۱۹۶۶ء	شعبہ تصنیف و تالیف مفتاح العلوم مئو	
		دوم ۱۹۹۸ء	قاسمی کتب خانہ، جموں کشمیر	
۴۱- تذکرہ مولانا عبداللطیف نعمانیؒ	۱۸۴	۱۹۷۴ء	شعبہ تصنیف و تالیف مفتاح العلوم مئو	
۴۲- تذکرہ مولانا عبدالرشید رانی ساگریؒ	۲۴۰	۱۹۸۰ء	خانقاہ رشیدیہ چترا ہزاری باغ بہار	

۴۳- حیات گیلانی	۳۳۶	۱۹۸۹ء	مولانا یوسف اکیڈمی، بنارس
۴۴- حضرت نانوتویؒ ایک مثالی شخصیت	۸۸	اول ۱۹۷۶ء	سجاد اکیڈمی، دیوبند
	۹۶	دوم ۲۰۱۱ء	واصف کمپیوٹر سینٹر، دیوبند
۴۵- تاریخی حقائق جلد اول	۴۲۴	۱۹۹۶ء	قاسمی کتب خانہ، جموں کشمیر
۴۶- اسلامی زندگی کے آثار و نقوش	۲۳۰	۲۰۰۴ء	انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، دہلی
۴۷- اسلام کا نظام معیشت	۱۲۰	۱۹۸۵ء	مرکز نشریات اسلام، پھلواری شریف
۴۸- جنگ آزادی کا ایک یادگار سفر	۴۰	۱۹۹۸ء	مکتبہ عکاظ، دیوبند
۴۹- مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے	۳۲۶	۱۹۹۷ء	قاضی پبلشرز، دہلی
۵۰- زندگی کا علمی سفر	۲۱۴	۲۰۰۳ء	مکتبہ نعیمیہ، دیوبند
۵۱- کشف الاسرار جلد اول	۶۰۰	دوم ۱۹۹۹ء	فیض القرآن، دیوبند
۵۲- کشف الاسرار جلد دوم	۴۸۸	دوم ۱۹۹۹ء	فیض القرآن، دیوبند
۵۳- امارت شرعیہ- دینی جدجہد کا روشن باب	۲۴۸	۱۹۷۴ء	امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ
۵۴- عناوین بر نظام تعلیم و تربیت اول	۴۷۲	۱۹۶۶ء	ندوۃ المصنفین، دہلی
۵۵- عناوین بر نظام تعلیم و تربیت دوم	۴۱۴		ندوۃ المصنفین، دہلی
۵۶- عناوین بر تفسیر حل القرآن			
۵۷- اضافات بر اشرالجواب			

۵۸- امارت شرعیہ- کتاب وسنت کی روشنی میں ۱۶ اول۱۳۸۸ھ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

۵۹- جماعت اسلامی، تحقیقی جائزہ ۵۶ سوم۱۴۰۷ھ مکتبہ اشاعت اسلام دارالعلوم شاہ بہلول، سہارنپور

۶۰- مجموعہ قوانین اسلامی (نقش اول) ۴۱۱ چہارم۲۰۰۲ء مسلم پرسنل لا بورڈ

اس کے علاوہ مختلف رسائل میں تقریباً تین سو مضامین لکھے اور ۱۷/ سالوں تک ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے اداریے بھی حضرت مفتی صاحب نے تحریر فرمائے۔

●●●

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کا اسلوب نگارش

مولانا اشرف عباس قاسمی ☆

خطۂ برصغیر میں ایسے بوریہ نشیں اصحاب ذوق علماء کی کمی نہیں ہے، جنھوں نے مدرسوں اور خانقاہوں کے بوسیدہ اور تاریک کمروں میں بیٹھ کر قرطاس وقلم سے اپنا رشتہ استوار رکھا، اور لوح وقلم کے ذریعہ شخصیت کی تعمیر، صالح معاشرے کی تشکیل اور حقائق سے نقاب کشائی کے رسم کہن کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ انہی اصحاب قلم میں ایک ممتاز نام استاذ گرامی قدر حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی کا ہے؛ جن کی تحریر کی سلاست، روانی اور برجستگی قاری کے ذہن پر چھاجاتی ہے اور اس تأثر کو بھی ختم کردیتی ہے کہ اہل مدارس کی تحریروں میں محض عربی کا ساز وآہنگ ہوتا ہے اور وہ اردو رسم الخط میں عربی یا فارسی لکھتے ہیں: مدارس کے علماء میں حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب اپنے اسلوب نگارش کے لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہیں، سادگی بے ساختگی اور برجستگی ان کی تحریر کا امتیاز ہے۔

مفتی صاحب منفرد سہل نگار اسلامی اہل قلم ہیں، اسلوب نگارش فطری اور پرکشش ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے اسلوب نگارش کی خود اس طرح وضاحت کی ہے ''میں نے لکھنے کے لیے کسی تکلف کو راہ نما نہیں بنایا، بس بلا ارادہ اور بلاتکلف اپنی بات کو اپنی زبان میں کسی آورد اور گہری سوچ کے بغیر لکھنے کا میں نے اپنے آپ کو عادی بنایا۔ لفظوں اور ترکیبوں کی تحسین وتزیین کی کبھی نہیں سوچی، نہ خود

☆ استاد حدیث، جامعہ مظہر سعادت، ہانسوٹ، گجرات

اس پر توجہ دی، نہ اس کو مسئلہ بنایا''۔(پس مرگ زندہ صفحہ:۹۱۹)

آپ کی خودنوشت سوانح حیات ''زندگی کا علمی سفر'' بھی شائع ہوچکی ہے۔ اسلوب میں اس قدر روانی، بے ساختگی، سلاست اور اچھوتا پن ہے کہ قاری جب شروع کرتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے اور ختم کرکے ہی دم لیتا ہے۔

اپنے سن شعور کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ایسا یاد آتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں عقل و ہوش نے کروٹ لی اور اس وقت کچھ شعور جاگا، ۱۵؍جنوری ۱۹۳۴ء میں بہار کا تاریخی زلزلہ آیا جس میں بہت سارے مکانات منہدم ہوگئے تھے اور زمین پھٹ گئی تھی جس سے پانی کے چشمے پھوٹ نکلے تھے، اس وقت میرا بچپن تھا، پانی نکلنے کا تماشہ دیکھ کر ہم لوگ خوش ہوا کرتے تھے۔(زندگی کا علمی سفر، صفحہ:۲۵)

مفتی صاحب کی طبیعت کی سادگی اور ظاہر و باطن کی یکسانیت ان کی تحریروں میں بھی خوب نمایاں ہے۔ وہ صاف لفظوں میں بات کہنے کے عادی ہیں ''لیڈری اور ناتجربہ کاری'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں:

''اس سال کے اخیر میں اگست ۱۹۴۲ء کی ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع ہوگئی، میں اپنی ناتجربہ کاری سے اس تحریک کا لیڈر بن گیا اور گرما گرم تقریریں شروع کردیں، صف اول کے لیڈر پورے ملک میں گرفتار ہوچکے تھے، قیادت طلبہ کے ہاتھوں میں آگئی تھی۔ بڑا لمبا جلوس نکلا کرتا تھا، اس کا نقصان یہ ہوا کہ امریکن فوج برطانیہ کی حمایت میں ہندوستان آئی تو وہ مئو بھی آئی، دس دنوں کے بعد پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی، اس لیے کہ چاروں لائنوں کے ٹیلیفون کے تار کٹوادیے گئے تھے اور یہ کام ''رام جیون ہائی اسکول'' کے طلبہ کے ذریعہ خاکسار نے ہی کرایا تھا، گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا، مجبوراً مجھے چھپ جانا پڑا، کئی دن فاقے کے

گزرے، بے سروسامانی کا عجیب عالم تھا، کس نمی پُرسد کہ بھیا کون ہو؟ کا مصداق بنا ہوا تھا، اس وقت میری لیڈری کچھ کام نہیں آئی بلکہ اپنے لیے مصیبت بن گئی۔(ص:۳۲-۲۳)

مفتی صاحب کی فکر میں آفاقیت ہے، وہ گہرائی کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کرتے ہیں اور مؤثر اور سیدھے سادے اسلوب میں قارئین کے دل و دماغ تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تاریخ کو سامنے رکھ کر تجزیہ کریں گے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ امن و امان کو جو چیز تباہ کرتی ہے وہ انسان کی تنگ نظری ہے، کوئی مذہب کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے، کوئی رنگ و نسل کے نام پر معرکہ آرائی کے لیے میدان کارزار گرم کرتا ہے، کوئی وطن اور ملکی حدود کے تعصب میں مبتلا ہوکر انسانی خون سے ہولی کھیلتا ہے''۔(اسلام کا نظام امن، ص:۲۷)

منظر نگاری میں بھی آپ کو بڑا کمال حاصل ہے، گو کہ آپ شاعر نہیں ہیں، مگر شاعرانہ حساسیت اور تخیل کی بلند پروازی کے نمونے بہ کثرت آپ کی تحریروں میں مل جائیں گے۔ ایک جگہ غروب آفتاب کی شاندار منظر کشی کی ہے بلکہ آزادی کے ایک مخلص سپاہی ہونے کے ناطے اپنے جذبات و احساسات کا بھی ساغر چھلکا دیا ہے۔

''دیکھتے ہی دیکھتے آفتاب کا حسین چہرہ نگاہوں سے اوجھل ہوکر مغرب میں روپوش ہوگیا، اس وقت کا دلفریب منظر جذبات کو چھیڑ رہا تھا، اجالے کی جگہ تاریکی اپنا تسلط قائم کرنے کی جدو جہد میں مصروف تھی کہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد افق پر لالی دوڑ گئی، معلوم ہوا کہ شہیدان وطن کے خون میں ابال آگیا ہے، پھر اسی سرخی سے

ایک درخشاں، سنہرا گول حلقہ نمودار ہوا اور اس کی روشنی پھیلنے لگی، تاریکی نے اپنا دامن سمیٹ لیا، اور بالآخر تاریکی پر روشنی غالب آ گئی، اس وقت کانوں میں ایک غیبی صدا آ رہی تھی کہ شہیدان وطن کا خون بھی رائیگاں نہیں جائے گا، ایک دن اسی طرح آزادی کا نیر تاباں بھی جلوہ گر ہوگا، اور انشاء اللہ غلامی کی سیاہی پامال ہوکر رہے گی''۔ (جنگ آزادی کا ایک یادگار سفر، ص: ۲۲)

''صبح کی آمد پر'' مفتی صاحب کی تحریر کی تازگی اور شیفتگی ملاحظہ فرمائیں:

''آج ستاروں کے ڈوبنے کا منظر بھی جی بھر کر دیکھا اور زبان پر علامہ اقبالؔ کا شعر آتا رہا۔

خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

ستارہ می شکنند و آفتاب می سازند

رات میں ایسا دریائی سفر نہ اس سے پہلے ہوا تھا، نہ بعد میں ہوا اور عجب اتفاق کہ پندرہویں شب تھی، ماہتاب پوری رات ہمیں دیکھتا رہا اور ہم اسے تاکتے رہے، سارے رنج وغم کے باوجود اس سفر میں رات کا منظر بہت خوش گوار رہا۔ پھر کہنا چاہیے کہ زندگی میں پہلی مرتبہ پانی کی سطح پر آفتاب نکلنے کا منظر سامنے آیا جہاں حد نگاہ تک پانی ہی پانی تھا، موجیں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں، نہ درخت، نہ جھاڑ جھنکار، نہ آدمی، نہ آدم زاد، نہ عمارت اور نہ کوٹھی، نہ جھونپڑی اور نہ محل۔ تاروں کے غروب ہوتے ہی خاور مشرق کی آمد آمد کا بگل بجا، شعاعوں کی فوجیں صف بستہ پھیلنے لگیں، پھر پورب میں لالی پھیل گئی اور آسمان پر اس کی شعائیں بکھر گئیں پھر بڑے جاہ و

جلال سے وہ سورج طلوع ہوا، جس کو ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے دیکھ کر کہا تھا ''ہذا ربی ہذا أکبر'' ایک دہکتا سرخ گولا تھا، پھر بہت جلد اس کی کرنیں پھوٹنے لگیں، اور اندھیرے کا نام ونشان تک باقی نہ رہا''۔ (جنگ آزادی کا ایک یادگار سفر، ص: ۴۲)

مفتی صاحب کی تحریر میں ندرت اور اچھوتے پن کا اظہار اس تبصرے سے بھی ہوسکتا ہے جو آپ نے استاذ گرامی حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب کی کتاب ''وہ کوہ کن کی بات'' پڑھ کر کیا تھا۔

''آپ کی کتاب کا لب ولہجہ اور بے ساختگی دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ اگر میرا کوئی ایسا شاگرد ہوتا، تو مرجانے میں فائدہ تھا، جو بھی آپ کی کتاب پڑھے گا اور اہل دل ہوگا، تو وہ ایسے تلمیذ رشید کی سعادت مندی پر لازماً فخر کرے گا اور کہے گا کاش ایسا ہونہار شاگرد مجھے مل جاتا اور میں مرجاتا''۔ (وہ کوہ کن کی بات- پس مرگ زندہ، ۹۲۷)

ارباب قلم علماء کا خراج تحسین

مفتی صاحب کی تحریروں کا صحیح لطف اصحاب ذوق اسی وقت اٹھا سکیں گے جب وہ براہ راست ان کی کتابوں یا مقالات کا مطالعہ کریں گے، جن کی زبان اور انداز بیان شاداب گلاب کی طرح تروتازہ ہے۔ چند اہل قلم علماء کی آراء نقل کی جارہی ہیں جن سے مفتی صاحب کی تحریر کے حسن کی کچھ نہ کچھ عکاسی ضرور ہوجاتی ہے۔

ابتدائی دور کی ایک قلمی کاوش پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''مضامین کا اسلوب، معلومات کی فراہمی، بیان کی شستگی اور طریقۂ تعبیر کی درستگی ہر چیز پسند آئی''۔ (نظام مساجد، ص:۶)

سلطان القلم مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا:

''ماشاء اللہ عبارت، الفاظ، ترتیب، سب میں سنجیدگی، متانت اور صفائی و روشنی پائی جاتی ہے''۔ (ایضاً، ص:۵)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے کچھ اس طرح تبصرہ کیا:

''زبان صاف و سادہ اور انداز بیان سلیس و شگفتہ، کتاب ٹھیٹھ مذہبی رنگ کی ہونے کے باوجود مولویانہ خشک نگاری سے پاک ہے'' (صدق جدید، لکھنؤ، ۲۲/ ۱۹۵۲ء)

مذکورہ اساطین علم و ادب اور سلاطین قرطاس وقلم کی اثر انگیزی سے علمی دنیا بخوبی واقف ہے، ان حضرات کا مفتی صاحب کی تحریر کو داد تحسین دینا ان کے اعتبار قلم اور وقار فن کی روشن دلیل ہے۔

مشہور صاحب قلم، عالم دین مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مفتی صاحب کا خاکہ اور اسلوب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''سادہ مزاج، سادہ دل اور سادہ زبان، اچھے مقرر اور ان سے بڑھ کر مایۂ ناز مصنف، زود قلم اور خوش رقم، زندگی بھر لوح وقلم کی رفاقت رکھی اور مختلف موضوعات پر ہزاروں صفحات لکھے''۔

(ابتدائیہ: زندگی کا علمی سفر، ص:۱۰)

مفتی صاحب نے اپنے چھوٹوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور ان کی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کی کوشش کی ہے، اس طرح ایسے درجنوں افراد ہیں جن کے قلم کی نوک و پلک درست کرنے اور ان کی تحریری صلاحیتوں کو صحیح راہ دکھانے میں مفتی صاحب کی تربیت کا بڑا دخل ہے، جن میں سے بعض اس وقت ملک کے

ممتاز اہل قلم اردو عربی مجلّات کے ایڈیٹر، یونیورسٹی کے پروفیسر اور شعبۂ اردو کے ذمہ داران ہیں۔ ان میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر سعود عالم قاسمی اور ڈاکٹر ابوبکر عباد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات زیادہ بہتر انداز میں یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں اور مدارس کی گدڑیوں میں چھپے علم و ادب کے سینکڑوں لعل و گہر کو اہل ادب کے روبرو کرکے انھیں اپنی جاگیر سنبھالنے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

میں اپنی اس تحریر کا اختتام حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی کے اس تبصرے پر کررہا ہوں جو مفتی صاحب کے منفرد اسلوب نگارش کی بہترین ترجمانی کررہا ہے۔

''وہ نہ لفظیات کی شوخی سے قاری کے لیے باعث تکان ہوتے ہیں، نہ اسلوب کی شوکت سے باعث مرعوبیت، نہ ساختیات کے بناؤ سنگار سے باعث الجھن، نہ فصاحت و بلاغت کی بے جا زور آوری سے باعث اذیت، نہ جملوں کی درازی، اور پُر پیچ ہونے کی وجہ سے ہمت شکن، آپ پڑھتے اور سنتے جایئے، آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کو، آپ ہی کی بات، آپ ہی کی زبان میں، کہی جارہی ہے''۔

(پس مرگ زندہ، ص:۹۱۹)

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ ایک نامور اہلِ قلم

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر☆

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ طالب علمی میں کچھ ایسے لوگوں اور افراد کو دیکھنے کا موقع ملا جو اپنی نظیر آپ تھے۔ اور یہ صرف ایک فرد کی بات نہیں بلکہ جماعت کی جماعت ایسی تھی جسے اللہ نے خصوصی کمالات او رامتیازات سے نوازا تھا ہر زاویہ سے ان کی زندگی قابل رشک تھی علم وفضل، کردار و عمل، حسن اخلاق، حسنِ سلوک، رواداری ومروّت جن کے خمیر میں پڑی ہوئی تھی اور یہ لوگ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن کے یہاں دوسروں کے کام آنا، معاون بننا اور دکھ درد میں شریک ہونا اوّلین فریضہ کی حیثیت رکھتا تھا تصنع و بناوٹ سے یہ لوگ کوسوں دور تھے اور کسی کو نقصان پہنچانے کا کوئی جذبہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ شرافت، انسانیت اور آدمیت نے ان کے گرد اس طرح بسیرا کیا تھا کہ ان کا نفس انھیں کسی ایسی بات اور عمل پر نہیں ابھارتا تھا جو کسی کی تکلیف یا معمولی اذیت کا سبب بنے، سب اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کرتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی ان کی یہی خواہش رہتی تھی مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو اپنی ذات پر دوسروں کو فوقیت دیتے تھے اور خاموشی و یکسوئی کے ساتھ کاموں میں مشغول رہتے تھے مفتی صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں میری عمر تقریباً چار پانچ سال رہی ہوگی اس سے چند سال پہلے ہی پہنچے

☆ استاذ دارالعلوم (وقف) دیوبند

ہوں گے اور ان کی ملازمت کو زیادہ سال نہ گزرے ہوں گے کہ انھیں دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع ملتا رہا وہ دارالعلوم دیوبند میں ملازم ہوکر آئے تو ان کی ملازمت کے سلسلے میں والد مرحوم مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر کی دلچسپی اور کوشش شامل تھی۔ دارالعلوم دیوبند کو اس وقت ترتیب کتب خانہ کے لیے کسی عالم اور مستعد آدمی کی ضرورت تھی جس کی جانب حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کو والد مرحوم نے توجہ دلائی اور حکیم الاسلامؒ نے مفتی صاحب مرحوم کی صلاحیت، قابلیت اور کمال کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کو دارالعلوم دیوبند میں آنے کے لیے کہا اور وہ باقاعدہ دارالعلوم دیوبند پہنچ گئے۔

ان کے دیوبند پہنچنے سے پہلے ہی رسالہ دارالعلوم دیوبند میں ان کے مضامین ومقالات شائع ہوتے رہتے تھے اور یہی والد مرحوم سے ان کے تعلق کی بنیاد تھی پہلے اور پھر بعد کے ملازمت کے عرصے میں ان کے لاتعداد مضامین اور مقالات اور کتابوں وغیرہ پر تبصرے خوب شائع ہوئے اور ایک زمانہ وہ آیا کہ وہ دارالعلوم دیوبند کا اداریہ بھی لکھنے پر مامور ہوئے اور سترہ سال تک وہ والد مرحوم کی ادارت کے زمانہ میں اداریے سپردِ قلم کرتے رہے۔ اس طرح ان کا والد مرحوم اور میرے خاندان سے ابتدائی ملازمت سے ہی ایک مضبوط اور گہرا تعلق قائم ہوگیا وہ پابندی کے ساتھ رسالہ دارالعلوم کے دفتر میں آتے اور کافی وقت وہاں گزارتے پھر یہ سلسلہ دراز ہوتے ہوتے ان کی آمد گھر تک ہوگئی اور گھر بھی وہ عصر کے بعد آتے اور اکثر مغرب اور عشاء کی نمازیں وہیں ادا فرماتے ان کے ساتھ تشریف لانے والے لوگوں میں حضرت الاستاذ مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا حکیم عزیز الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا سید محبوب رضویؒ، مولانا محمد اسلم قاسمی، مولانا عبداللہ جاوید مرتب: مظاہر حق، مولانا قاری عبداللہ سلیم، وغیرہ ہوتے۔ کچھ حضرات مغرب کی نماز پڑھ کر رخصت ہوجاتے کچھ عشاء کی نماز ادا کرکے چلے جاتے تنہا مفتی ظفیر الدین

صاحب مفتاحیؒ تھے جو بعد نماز عشاء کئی گھنٹے ٹھہرتے اور ان کی گفتگو جاری رہتی مفتی صاحبؒ کو اللہ نے بڑی صلاحیت کا مالک بنایا تھا اور ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا مشکل سے مشکل موضوعات پر وہ لکھنے کے عادی تھے اور جو کچھ لکھتے پوری تحقیق کے بعد لکھتے۔ موضوع کے اعتبار سے مضامین کافی طویل اور پھیلے ہوئے ہوتے جو بسا اوقات کئی کئی قسطوں میں شائع ہوتے اسی زمانے میں مختلف موضوعات اور شخصیات پر منعقد ہونے والے سمیناروں میں بحیثیت مقالہ نگار ان کی شرکت لازمی تھی گو وہ زمانہ زیادہ سمیناروں کا نہیں تھا مگر امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ مختلف عنوانات کے تحت مفتی صاحب مرحوم سے کام لیتے اور ان کے کام پر اطمینان کا اظہار فرماتے امارتِ شرعیہ بہار اور مسلم پرسنل لاء بورڈ نے ان سے انتہائی نازک اور حساس مسائل پر بہت سی چیزیں لکھوائیں اور مفتی صاحبؒ نے انھیں شرح وبسط کے ساتھ لکھا۔

مفتی صاحبؒ کا اپنا ایک اسلوب تھا جو سادگی سے عبارت تھا مگر ان کی تحریریں رواں ہوتی تھیں کہیں الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں اپنی بات نہایت خوبی اور سلیقے کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی ندوۃ المصنّفین دہلی سے شائع ہونے والی سیرت پر ان کی ایک کتاب پڑھنے کا موقع ملا جس میں مفتی صاحبؒ کا رنگ ہی دیگر ہے نہایت شگفتہ اور شاداب تحریر خالص ادبی رنگ لیے ہوئے مگر ساتھ ساتھ صحت واقعات کا بھرپور اہتمام یہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ مفتی صاحبؒ کے قلم کا شاہکار ہے ہر جملے سے ان کی ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت، محبت، تعلق، دلی وروحانی وابستگی کا ایسا نقش ابھرتا ہے کہ مفتی صاحبؒ اپنے تمام تحریروں کے مقابلے میں اس مقام پر الگ کھڑے دکھائی دیتے ہیں یہ کتاب انھوں نے پورے جذبے کے ساتھ لکھی کافی کتابیں ان کی بازار میں آئیں اور اہل علم کے یہاں انھیں قدر کی نظر سے دیکھا گیا۔

ذاتی اعتبار سے مفتی صاحبؒ سادہ اور شریف انسان تھے اور یہ سادگی ان کی گفتگو، ان کے لباس ان کے رہن سہن، ان کے معاملات سب سے عیاں تھی۔ ان کو دور سے دیکھنے والا یہ اندازہ ہی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ شخص اتنے کمالات کا مالک ہے۔ بڑے خاموش اور گوشہ گیر انسان تھے اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ان کا نصب العین تھا ضیاع وقت کو کامیاب زندگی کے لیے یا کسی بھی انسان کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے اور اپنے شب و روز کو انھوں نے اس طرح سے تقسیم کیا ہوا تھا کہ کاموں کا ہجوم بھی نہ ہوتا اور وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ اپنے تمام کام پورا کر لیتے۔

۸۵؍سال کی عمر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے اپنی زندگی میں انھوں نے بے شمار بڑے انسانوں کو دیکھا اور ہر شخص سے کچھ نہ کچھ حصہ پایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ایک عالم کی زندگی تھی ایک ایسا عالم کہ جس کے یہاں علمی دینی اور تحقیقی کاموں کے علاوہ اور کسی کام کی گنجائش نہ تھی۔ ان کے تین صاحبزادے دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے مولانا احمد سجاد قاسمی، مولانا حماد قاسمی، ہم سے عمر میں بڑے بھی تھے اور تعلیمی اعتبار سے سینئر بھی۔ تیسرے صاحبزادے ڈاکٹر ابوبکر عباد بھی پڑھ رہے تھے مگر وہ مجھ سے کافی چھوٹے تھے دونوں بڑے صاحبزادے بہار ہی میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں اور ڈاکٹر ابوبکر عباد دہلی میں مقیم ہیں اور ان کے مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں میرا تعلق عمر کے فرق کے باوجود مولانا حماد قاسمی سے رہا میں ان کے اور وہ میرے گھر کے فرد کی حیثیت سے لگ بھگ دس سال ساتھ رہے۔ مفتی صاحبؒ اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ اللہ نے انھیں سنجیدہ، صالح اور فرماں بردار اولاد عطا فرمائی تھی اس میں ان کی تربیت اور محنت کا بھی بڑا دخل رہا اور آج تینوں ہی لڑکے مضبوط روزگار اور معاش کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔

مفتی صاحبؒ کی ذات سے وابستہ کتنی یادیں ہیں کہ جن پر اگر نظر ڈالیں تو دفتر کے دفتر تیار ہوجائیں ان کی رہائش دارالعلوم دیوبند کے ایک کمرے میں تھی اور ہمارا اکثر ان کے کمرے پر جانا ہوتا۔ وہ اگر موجود ہوتے تو کچھ لکھتے ہوئے دکھائی دیتے یا پھر کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوتے کبھی میں نے انھیں ان دوحال سے خالی نہیں پایا الا یہ کہ وہ کچھ ساعتوں کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئے ہوں۔ انھیں کے کمرے کے قریب حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ اور مولانا بدرالحسن قاسمی دربھنگوی مقیم حال کویت کی بھی رہائش گاہ تھی۔ اور تینوں کا تعلق بڑا قریبی تھا اس طرح مفتی صاحبؒ کے یہاں حاضری ہوتی تو ان دونوں حضرات سے ملنے اور ان کے قریب بیٹھنے کے مواقع ملتے رہتے۔ اپنی مضمون نگاری کے ابتدائی دور میں مفتی صاحبؒ سے اصلاحِ مضامین کا تعلق بھی قائم ہوا۔ مگر مفتی صاحبؒ کی یکسوئی اور تنہائی پسندی ومصروفیت کی بناء پر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور ذہنی تربیت کا مفتی صاحب کو خاصہ ملکہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ نئی نسل ایک کارآمد اور کامیاب زندگی گزارے۔ خود چوں کہ ان کا مزاج یہی تھا اس لیے ہر شخص کے لیے ان کی سوچ یہی تھی۔

ان کا اصل تعلق تو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے تھا اور ان کے وصال کے بعد انھوں نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے یہ رشتہ استوار کرلیا تھا مگر چوں کہ طبیعت میں انتہائی سادگی اور خود کو چھپانے کی عادت تھی اسی وجہ سے بیعت وخلافت کی راہ اختیار نہیں کی۔ حالاں کہ حکیم الاسلام کی جانب سے انھیں اجازت حاصل تھی انھوں نے بہت اچھی اور کامیاب زندگی گزاری۔ اور کوئی موقع اپنی گفتگو، رکھ رکھاؤ سے ایسا نہیں آنے دیا کہ کوئی ان سے کبیدہ خاطر ہوا ہو۔ وہ طوفان جو ۱۹۸۰ء کے بعد دارالعلوم دیوبند

میں آیا اور جس میں بڑے بڑے کھوگئے مفتی صاحبؒ اپنی جگہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہے اور ان کی زبان وقلم سے کوئی جملہ اور لفظ ایسا ادا نہیں ہوا جس سے کسی کی تحقیر اور تضحیک ہو۔ دونوں جانب ان کا تعلق برابر رہا اور ان تعلقات کو انھوں نے ملازمت سے کبھی متاثر نہیں ہونے دیا یہ ان کی صالح طبیعت اور اعتدالِ فکر کا نتیجہ ہے جس سے ان کے مزاج اور طبیعت تک آسانی کے ساتھ رسائی حاصل ہوتی ہے۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کے اکابر علماء سے روابط

مولانا اختر امام عادل ☆

ہر دور میں بعض ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جن کے ظاہری سراپا کو دیکھ کر ان کے علمی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ان کا علم ان کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے، ان کے علمی کارنامے ان کی عظمت اور جلالت شان کی دلیل ہوتے ہیں، جن کی ظاہری زندگی بہت خاموش مگر باطنی طور پر وہ سارے زمانے سے ہم کلام، جو اسباب کی دنیا میں مسکین اور بے وسیلہ، مگر علم وفن کے حقیقی ہتھیاروں سے لیس، جو بظاہر ساری دنیا سے کنارہ کش اور لاتعلق، مگر وقت آنے پر متحرک زندگی کے لیے وہی سب سے پیش پیش، جن کا انداز اپنے شاگردوں اور اہل تعلق کے ساتھ دوستانہ اور متواضعانہ، مگر اہل معرفت کے لیے وہ عظمت واحترام کے پہاڑ، جن کی زبان وعلم بالکل سادہ و عام فہم، مگر درحقیقت وہ سہل ممتنع اور معانی سے لبریز، مصنوعی تکلفات سے بالاتر، جو ہر تکلف سے تکلیف محسوس کریں، جن کے لیے ہر دل میں جگہ، جن کی خاطر دیدۂ تر محو استقبال، جو ہر شخص کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کریں، جو ہر غم کو اپنا غم اور ہر درد کو اپنا درد سمجھیں ..... یعنی ہمارے اس تکلفات کی دنیا کے لیے بالکل اچھوتی شخصیت، ایسے لوگ ہر دور میں پیدا ہوئے

☆ مہتمم جامعہ امام ربانی، منورواشریف، ضلع سمستی پور (بہار)

مگر بہت کم، جو بوریہ نشین تھے مگر لوگوں کے دل ان کی طرف جھکتے تھے، جن کو دیکھ کر فقیری میں شاہی کا تصور ابھرتا تھا، ایسے لوگ تاریخ میں بہت کم ہوئے اور آج بھی بہت کم ہیں۔

میرے استاذ مکرم فقیہ ملت، استاذ الاساتذہ، رئیس القلم، حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ (ولادت ۷/مارچ ۱۹۲۶ء، وفات ۳۱/مارچ ۲۰۱۱ء)، مفتی دارالعلوم دیوبند انہی کمیاب شخصیتوں میں ایک تھے۔

تعلیم وتربیت

مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم وطن میں، مدرسہ محمودیہ راج پور نیپال اور مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم جامعہ مفتاح العلوم مئو میں حاصل کی۔ مولانا عبداللطیف نعمانی اور محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ان کے اساتذہ تھے۔

مفتی صاحب نے علم کی کسی منزل پر قناعت اختیار نہیں کی، بلکہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہے، ان کی اسی جستجو اور ذوق وشوق نے ان کو اوج کمال تک پہنچایا۔ حضرت مفتی صاحب کی اسی جستجو کی کہانی خود انہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔ اپنی کتاب ''علمی مراسلے'' میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے تذکرے کے ذیل میں رقم طراز ہیں:

> ''سالانہ امتحان دے کر گھر نہیں گیا، مئو میں رک گیا، حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مدظلہٗ کی خدمت میں جاتا آتا رہا، ایک دن دل کی بات زبان پر آئی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں رکھوادیں، تاکہ لکھنے کے ذوق کی تکمیل ہوجائے۔ مولانا نے فرمایا سعی کروں گا، اعظم

گڑھ جانا ہوا اور سید صاحب سے ملاقات ہوئی تو تذکرہ ضرور کروں گا، اس جواب سے مجھے بہت خوشی ہوئی، میری خوش قسمتی سے ایک ہفتہ بعد ہی حضرت الاستاذ اعظم گڑھ تشریف لے گئے، کوئی اپنا علمی کام تھا، میری خوش بختی دیکھیے کہ اس سفر میں سید صاحب سے جب آپ کی ملاقات ہوئی تو از خود حضرت سید صاحب نے حضرت الاستاذ سے فرمایا کہ آپ اپنا کوئی اچھا شاگرد دے دیں، جو فقہ کے لیے تیار اور لکھنے پڑھنے کا عمدہ ذوق بھی رکھتا ہو، اس موقعہ پر حضرت الاستاذ مدظلہ کو میری باتیں یاد آئیں، سید صاحب سے فرمایا: ایک طالب علم ایسا ہے اور وہ اسی سال فارغ ہوا ہے اور ماشاء اللہ اس کی مجموعی صلاحیت قابل اطمینان ہے، میں جاکر اسے آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا، آپ خود اندازہ لگالیں گے، حضرت الاستاذ مدظلہ جب واپس آئے اور خدمت میں میری حاضری ہوئی تو یہ سارا واقعہ کہہ سنایا اور فرمایا تم میرا خط لے کر چلے جاؤ اور سید صاحب سے ملاقات کر آؤ، میں نے عرض کیا بہت اچھا، دو ایک دن بعد خط لکھوا کر اعظم گڑھ حاضر ہوا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سید صاحب جونپور اپنی بچی کے یہاں گئے ہوئے ہیں، تیسرے دن تشریف لائیں گے۔ تیسرے دن کوئی دس بجے حضرت سید صاحب تشریف لے آئے، گھر سے ہوکر جب دفتر میں آکر بیٹھ گئے تو مولانا نگرامی نے فرمایا اب جاکر ملیں، دفتر میں حاضر ہوکر میں نے سلام عرض کیا، سامنے کرسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا بیٹھ جائیں، یہ میری سب سے پہلی ملاقات تھی، چند منٹ بعد فرمایا کہاں سے آنا ہوا؟ عرض کیا مئو سے حاضر ہوا،

فرمانے لگے اچھا مولانا اعظمی نے آپ کو بھیجا ہے؟ عرض کیا، جی ہاں، اور مولانا کا خط نکال کر سامنے رکھ دیا، .....فرمایا آپ نے دورۂ حدیث پڑھ لیا؟ میں نے جواب دیا جی ہاں، اسی سال ختم ہوا ہے، فرمایا پھر اب کیا چاہیے؟ ماشاء اللہ آپ عالم دین بن گئے، پھر خود ہی فرمانے لگے دیکھ رہے ہیں کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، اپنے تجربہ کی روشنی میں یقین دلاتا ہوں کہ اس علم سے دنیا نہیں ملتی ہے، رہی دین کی بات وہ عمل سے متعلق ہے اور عمل کے لیے جتنا آپ پڑھ چکے ہیں بہت کافی ہے، عمل کرکے آخرت سنواریے۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ سچی بات یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں نہ دنیا طلب کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں اور نہ آخرت سنوارنے کی جستجو میں، میری یہ کھری کھری باتیں سن کر حضرت سید صاحب میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے، فرمایا پھر آپ کا مقصد کیا ہے، عرض کیا حضرت! میں نے بچپن سے اب تک پندرہ سال مدرسہ میں گذار دیے ہیں، تھوڑا بہت جو ہوسکا پڑھا بھی، مگر صحیح یہ ہے کہ رسوخ فی العلم جسے کہتے ہیں یا علمی شدھ بدھ اور بصیرت وہ حاصل نہیں ہوسکی ہے، دل کی تڑپ یہ ہے کہ کچھ آئے اور کسی درجے میں علمی مناسبت پیدا ہوجائے ..... میرے اس جواب کے بعد حضرت بالکل خاموش ہوگئے، فرمایا آپ کا کہاں قیام ہے؟ عرض کیا مولانا نگرامی صاحب کا مہمان ہوں، ہنس کر فرمایا جایئے کھا کر آرام کیجیے۔ اب ظہر بعد ملاقات ہوگی۔'' (علمی مراسلے، ص:۹ تا ۱۲)

اس روداد سے مفتی صاحب کا نقطۂ نظر سامنے آتا ہے اور علم کے بعد علم

اور پھر رسوخ فی العلم کی کیسی طلب اور جستجو ان کے اندر تھی، اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

بزرگوں سے تعلق

انھوں نے اپنے بزرگوں سے علمی استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا اور ہمیشہ اپنے کو طالب علم سمجھا، حضرت مفتی صاحب نے اپنے نام بزرگوں کے جو مراسلات جمع فرمائے ہیں، ان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو فراغت کے بعد عہد تدریس میں بھی ہمیشہ اپنے بزرگوں سے گہرا علمی تعلق رہا اور مختلف علمی مسائل و مراحل میں وہ ان سے مشورے لیتے رہے ..... ہر مشکل وقت میں مفتی صاحب نے اپنے بزرگوں سے رجوع فرمایا اور ان بزرگوں نے بھی کبھی مفتی صاحب کی حوصلہ افزائی میں کمی نہیں کی، آگے بڑھ کر سینے سے لگایا اور ہر ممکن طور پر مدد فرمائی، مفتی صاحب علامتی طور پر مکتوبات سلیمانی کے بارے میں اپنا حال تحریر فرماتے ہیں:

''اپنا حال یہ رہا کہ جب کبھی فراغت زمانہ نے بے رخی دکھائی یا دل پر زخم لگے تو مکتوبات سلیمانی نے ڈھارس بندھائی اور صبر و شکیبائی کی ایک آہنی دیوار کھڑی کردی، جس کو بڑے سے بڑا طوفان بھی متأثر نہیں کرسکا اور جس کے سہارے زندگی کی ٹرین فراٹے بھرتے چلتی رہی، ان مکتوبات میں والدین کی سی محبت، اساتذہ کی سی شفقت اور مربّی کی تربیت اور رشد و ہدایت سب کی سب جمع ہیں، پڑھنے والے آنکھیں کھول کر پڑھیں گے تو انھیں اپنے سوالات کے جوابات ملیں گے، دیدۂ بصیرت میں روشنی آئے گی اور قلوب رحمت خداوندی سے معمور ہوتے نظر آئیں گے۔
(علمی مراسلے، ص:۱۶)

بزرگوں سے استفادہ

حضرت مفتی صاحب نے اپنے جن بزرگوں کا بہت گہرا اثر قبول کیا ہے ان میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی بھی ہیں، علامہ گیلانی نے مختلف مواقع پر مفتی صاحب کو اپنے علمی مشوروں اور رہنمائیوں سے نوازا ہے، ۴/اپریل ۱۹۵۰ء کے ایک طویل مکتوب میں مفتی صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

''آپ ابھی زندگی کے ابتدائی ایام میں ہیں، سب سے بڑا دشوار مسئلہ تصنیف و تالیف کے کاروبار میں کتابوں کا ہے، جن کا موجودہ حالات میں وسیع پیمانے پر مہیا ہونا آسان نہیں ہے، تاہم کچھ کتابوں سے تو چارہ نہیں، درسی کتابیں تو کم از کم آپ کے مدرسہ میں یا آس پاس کے مولویوں کے پاس مل جائیں گی، اسی امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک مشورہ تو ایسی کتابوں سے تعلق رکھتا ہے جن کے لیے کتابوں کی چنداں ضرورت نہ ہوگی، صرف فکر و غور کی صلاحیت ہے اور وہ یہ ہیں جن کو اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے، (پھر حضرت مولانا گیلانی نے چار عنوانات اور ان سے متعلق ضروری تفصیلات تحریر کی ہیں اور مفتی صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ آپ ان پر کام کریں: ۱- مصائب النبی و آل النبی ۲- انسانیت بیمار ہے ۳- الوفود والمکاتیب ۴- بعض مشاہیر صحابہ۔ (ص:۷۹ تا ۸۱، مکتوب:۴)

حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی بانی ندوۃ المصنفین، دہلی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

'اسلام کا نظام عفت و عصمت، بہت خوب ہے، جی جما کر لکھیے،

قدیم کتابوں کے علاوہ جدید کتابوں سے بھی مدد لینی چاہیے''۔

(:۱۲۷،مکتوب:۲۱)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

''تاریخ ملت کے حصوں پر آپ کا مضمون پڑھ کر مولانا عبدالماجد صاحب نے بھی وہ حصص طلب فرمائے ہیں'' جامع اموی دمشق'' جلد ارسال فرمائیے، کوئی اور بھی دلچسپ اور معیاری مضمون لکھیے، حلقۂ برہان میں بحمد اللہ اب آپ کافی نیک نام ہیں، مضامین کم لکھیے، مگر جو کچھ لکھیے معیار کے مطابق لکھیے، معیار کی بقا بڑی بات ہے''۔(ص:۱۲۶،مکتوب:۲۰)

مفتی صاحب پر بڑوں کا اعتماد

مفتی صاحب کے دور کی کوئی ایسی قابل ذکر شخصیت نہیں ملتی جن سے آپ کے علمی مراسم نہ ہوں، کچھ مفتی صاحب کی اپنی صلاحیت اخذ کرنے والی طبیعت اور فطرت کی سلامتی کا دخل ہے اور کچھ ان بزرگوں سے روابط کا فیض کہ اللہ نے ان سے بڑے بڑے کام لیے اور اکابر اور داعیان امت نے ان پر بھر پور اعتماد کا اظہار فرمایا، بڑے اہم اہم کام ان کے سپرد کیے اور مفتی صاحب ایسے تمام آزمائشی مرحلوں سے پوری کامیابی کے ساتھ گذرے۔

اعتماد کا اصل اظہار اہم ذمہ داریوں کی تفویض سے ہوتا ہے، لیکن بعض مرتبہ زبان وقلم سے بھی ایسے جملے نکل جاتے ہیں جن سے اعتماد اور عظمت واحترام کا اظہار ہوتا ہے، ''علمی مراسلے'' میں ایسے بعض مکاتیب ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب پر اکابر کو کس قدر اعتماد تھا اور ان کی قدر و قیمت بزرگوں کے دل میں کیسی تھی؟ بعض نمونے ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مفتی صاحب کی پہلی شاہ کار تصنیف ''اسلام کا نظام مساجد'' (جو پہلی بار ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی اور اب دوسری بار دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے) سید العلماء حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے ملاحظہ فرمائی تو اپنے تأثرات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''اپنی محدود معلومات کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ مساجد کے متعلق اتنی جامعیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی میری نظر سے نہیں گذری، وقت کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل میں مولانا موصوف نے اپنا وقت صرف فرمایا ہے، اگرچہ تالیف وتصنیف کے میدان کے تازہ واردوں میں ہیں، لیکن خالص نیت ان کی محنت کے بارآور کرنے میں مدومعاون ثابت ہوئی، بظاہر موضوع کے متعلق مشکل ہی سے کوئی قابل ذکر مسئلہ غالبًا ایسا باقی رہا ہے جس کا تذکرہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس کتاب میں نہ آگیا ہو، ماشاء اللہ عبارت والفاظ، ترتیب سب میں سنجیدگی، متانت اور صفائی وروشنی پائی جاتی ہے، اختلافی مسائل میں مولوی صاحب نے رفق وملامت کا پہلو اختیار کرکے علماء کے طبقہ متصلّبہ کے لیے ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے''۔

(حاشیہ،ص ۷۳)

''تاریخ مساجد'' کا موضوع مفتی صاحب کو مولانا گیلانی نے دیا تھا، ابھی کتاب تیار بھی نہیں ہوئی تھی مگر اعتماد کی بنیاد پر حضرت مولانا گیلانی نے مفتی صاحب کو اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

''نظام المساجد کے مقدمہ کی ضرورت کب پیش آئے گی، میرا تو جی چاہتا تھا کہ تاریخ المساجد پر مقدمہ آپ مجھ سے لکھواتے، اس

وقت آپ کا یہ نیازمند زندہ رہا تو تعمیل ارشاد کو اپنی سعادت خیال کرے گا''۔ (علمی مراسلے، ص۷۶، مکتوب:۱)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

''واقعہ تو یہ ہے کہ اس میدان کے آپ تازہ وارد نوجوانوں میں ہیں، آپ کی صلاحیتوں کو دیکھ کر دل اس پیشین گوئی کی جرأت کرتا ہے کہ مستقبل میں آپ کا قلم انشاء اللہ اسلام کی کوئی نمایاں خدمت انجام دے گا''۔ (ص۸۷، مکتوب:۹)

ایک خط کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا:

''رفیع القدر، سلیم القدر، الصوفی الصافی الکاتب مولانا ظفیر الترهتی المتهلاتی ایدکم الله بروح منه''۔ (ص:۹۹، مکتوب:۱۹)

ایک خط میں اس طرح مخاطب فرمایا:

''سیدی! ومتم بالصلاح والعافیة''۔ (ص:۱۰۵، مکتوب:۲۵)

امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ مفتی صاحب کے خصوصی قدردان تھے، حضرت امیر شریعت نے مفتی صاحب سے کئی اہم کام لیے، کئی تحریرات ان کی شائع کیں، کئی اہم موضوعات پر مقالے لکھوائے، حضرت مفتی صاحب، حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر دارالعلوم دیوبند تشریف لے جا چکے تھے، مگر حضرت امیر شریعت ان کو امارت شریعہ کا نظام سنبھالنے کے لیے امارت لانا چاہتے تھے، کئی خطوط حضرت امیر شریعت نے اس مضمون کے لکھے، مگر حضرت حکیم الاسلام نے مفتی صاحب کو اجازت نہیں دی، یعنی حضرت حکیم الاسلام، مفتی صاحب کو دارالعلوم دیوبند کی ضرورت سمجھتے تھے اور حضرت امیر شریعت امارت شرعیہ کی ضرورت، حضرت امیر شریعت کے ایک مکتوب

گرامی کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان شائد کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے، مجھ سے آپ کی تو یہ بات طے ہوچکی تھی کہ آپ کو دفتر امارت شرعیہ میں تشریف لانا ہے اور مستقلاً آنا ہے، مگر یہ پھلواری شریف جیسی جگہ ہے، شاید آپ کا دل نہ لگ سکے، اسی لیے میں نے عرض کیا تھا کہ چھ ماہ کی چھٹی لے لیں، اگر دل لگ جائے تو بے حد خوشی کی بات ہے،.....اسی وقت یہ گفتگو بھی آپ سے ہوئی تھی کہ آپ نقیب اور افتاء کو سنبھالیں گے، بعد کو میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ محکمۂ قضا خالی ہے۔

بہر حال اس وقت میں چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لاکر افتاء اور اخبار نقیب کا کام کریں میں نے پچھلی بار امارت کی مالی حالت کے پیش نظر ماہ -/۱۵۰ کی پیش کش کی تھی، شاید یہ بات پیش نظر ہو، اس لیے اب عرض ہے کہ اس وقت جو یافت آپ کی دارالعلوم میں ہے وہ پیش کی جائے گی''۔ (ص:۲۳۴، مکتوب:۱۳)

حضرت مفتی صاحب کی کتاب تاریخ مساجد پر اپنی تعارفی تحریر میں حضرت امیر شریعت تحریر فرماتے ہیں:

''عزیز محترم مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی علمی اور دینی حلقہ میں بہت جانی پہچانی شخصیت کے مالک ہیں، وہ لانبے عرصے سے علمی وتحقیقی وتصنیفی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی گئی ہیں اور کاموں کے علاوہ صرف فتاویٰ دارالعلوم کی تحقیق، استخراج اور ترتیب ہی اتنا بڑا اور اہم کارنامہ ہے، جو ان کے علمی وتحقیقی وقار

واعتبار کو ممتاز کرتا ہے، خدائے تعالیٰ نے ان کے وقت میں برکت اور خدمات کو قبولیت سے نوازا ہے، صرف فتاویٰ دارالعلوم ہی نہیں، نظام مساجد، نظام عفت وعصمت، نظام امن، سیرت و سوانح اور متعدد موضوعات پر ان کی کتابیں آئیں اور ہاتھوں ہاتھ لی گئیں''۔ (تاریخ مساجد، ص: ۱۳)

حکیم الاسلام قاری طیب صاحب کی جوہر شناسی

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند کس اعزاز و احترام کے ساتھ بلائے گئے اس کا اندازہ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب کے اس اولین مکتوب سے ہوتا ہے جس میں مفتی صاحب کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی گئی ہے، اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مہتمم صاحب کی نگاہ میں مفتی صاحب کا کیا مقام تھا؟ خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس وقت ایک خاص ضرورت سے عریضہ لکھ رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت دارالعلوم کے شعبۂ تبلیغ اور یہاں کے نشر واشاعت کو ایک ایسے فاضل کی ضرورت ہے جو صاحب قلم، خوش تحریر اور شرعی مسائل وحقائق کو دلنشیں پیرایہ میں اچھے اسلوب کے ساتھ موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے پر قادر ہو، بالخصوص مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے ان نظریات کا جو اہل سنت والجماعت کے مسلک سے ملے ہوئے ہیں اصول و دلائل کی روشنی میں تجزیہ کرکے اس کا کھرا اور کھوٹا واضح کرسکتا ہو، ہر مخالف تحریرات سے انصاف واعتدال کے ساتھ اخذ کرنے اور اس پر سنجیدہ گرفت کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو، اور معاندین کے شبہات

و اعتراضات کا شرعی مواد کی روشنی میں متانت کے ساتھ جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہو، ساتھ ہی اکابر دارالعلوم کے بتائے ہوئے اسالیب بیان وعنوانات کلام پر ان کے ذوق وفکر کی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے اچھے ڈھنگ سے ان کے مقصود کی ترجمانی کرسکتا ہو، اور اسی کے ساتھ احیاناً دارالعلوم کی ضروریات یا بیرونی دعوت پر حسب موقعہ تقریر و بیان پر بھی قادر ہو، اس سلسلہ میں مختلف شخصیتوں کے نام کے ساتھ جناب کا اسم گرامی بھی سامنے آیا، بندہ کا حسن ظن تو ذات سامی کی نسبت جو ہے وہ ہے اور وہی اس تحریر کا باعث ہوا، لیکن درخواست یہ ہے کہ معیار بالا کی رو سے اپنے بارے میں خود جناب بے تکلف اظہار خیال فرمادیں کہ ان خدمات مطلوبہ کو جذبات مذکورہ کے ساتھ انجام دے سکیں گے یا نہیں؟''۔ (ص: ۶۳، مکتوب: ۲)

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنی قدر مفتی صاحب کی ان کے بڑوں نے کی، چھوٹوں سے اتنی قدر نہ ہوسکی، یہ ہماری معرفت کی کمی ہے، مفتی صاحب کی عظمت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مفتی صاحب نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جس طرح دین اور علم دین کی خدمت کے لیے صرف کیا ہے اور تلامذہ کے علاوہ کتابوں کا بڑا علمی سرمایہ جمع فرمایا ہے وہ ان کی جلالت علمی کے لیے کافی ہیں۔

مفتی صاحب ایک خاموش طبع انسان ہیں، ان کے یہاں شور و پکار، اعلان وتشہیر کے ہنگامے نہیں ہیں، وہ خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کے قائل ہیں اور انھوں نے اسی خاموشی کے ساتھ ایسے بڑے بڑے کام کیے جو بڑی بڑی ہنگامہ خیز شخصیتیں نہ کرسکیں، میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا، آنے والا مؤرخ

اورمبصر جب اس کا تجزیہ کرے گا تو تفصیلات سامنے آئیں گی، لیکن میں اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مفتی صاحب کے اہم علمی کارنامے

☆ ''نظام مساجد'' کے بارے میں آپ نے مولانا گیلانی کی زبانی سن ہی لیا کہ:

''مساجد کے متعلق اتنی جامعیت کے ساتھ تمام پہلوؤں پر اتنی حاوی کتاب نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور عربی میں بھی میری نظر سے نہیں گذری''۔ (ص: ۳۷، علمی مراسلے)

☆ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کی تدوین وترتیب کا کام، کام نہیں عظیم الشان کارنامہ ہے اور حضرت امیر شریعت رابع نے درست فرمایا ہے:

''اور کاموں کے علاوہ صرف فتاویٰ دارالعلوم کی تحقیق، استخراج اور ترتیب ہی اتنا بڑا اور اہم کارنامہ ہے، جو ان کے علمی وتحقیقی وقار و اعتبار کو ممتاز کرتا ہے''۔ (تاریخ مساجد، ص: ۱۲)

جو کام دارالعلوم میں برسوں میں نہیں ہوسکا تھا، مفتی صاحب نے اس اہم ترین کام کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا اور فتاویٰ دارالعلوم کی بارہ جلدیں چند سالوں میں سامنے آگئیں، پھر انقلاب کے بعد بعض ایسے ناخوشگوار حالات پیش آئے کہ مفتی صاحب دل شکستہ ہوگئے اور باقاعدہ ان کو یہ کام بھی نہیں دیا گیا، چنانچہ مفتی صاحب کے اس کام سے الگ ہوجانے کے بعد آج تک کوئی جلد سامنے نہ آسکی، مفتی صاحب نے تن تنہا وہ کام کیا جو پوری کمیٹی انجام دیتی ہے۔

☆ کتب خانۂ دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب نے بحیثیت مدیر کتب خانہ جو انقلابی اور تعمیری خدمات انجام دیں وہ دارالعلوم کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں

کی جاسکیں گی۔ کتب خانہ میں جدید ترین کیٹلاگ کا نظام، کتابوں سے استفادہ کی صورتیں، دارالمطالعہ کا نظام وغیرہ کئی غیر معمولی اصلاحات مفتی صاحب نے فرمائیں۔ مفتی صاحب کتب خانہ سے پھر دارالافتاء چلے آئے، لیکن جس مرحلے پر وہ کتب خانہ کو چھوڑ آئے تھے اتنے سال گذرنے کے باوجود کتب خانہ آج تک اسی مرحلے پر رکا ہوا ہے، یہ ہے مفتی صاحب کا امتیاز، بظاہر بہت سادہ اور ہلکے پھلکے، لیکن ایسے صاحب تاثیر کہ جس کام پر ہاتھ ڈالا، تکمیل تک پہنچا کر دم لیا اور جس کام سے ہاتھ کھینچ لیا یا ان کو روک دیا گیا وہ کام بھی وہیں پر رک گیا۔

☆ مجموعہ قوانین اسلامی (مسلم پرسنل لا بورڈ) کا اصل مسودہ مفتی صاحب ہی نے تیار کیا، بعد میں کمیٹیوں نے اس پر غور وخوض کیا اور ترمیمات کیں، لیکن اصل چیز تو مسودہ ہے، کسی ذمہ دار ادارہ کی طرف سے قانونی مسودہ تیار کرنا آسان کام نہیں ہے، ہندوستان میں بہت سی علمی شخصیات موجود تھیں اور ہیں، لیکن ان میں حضرت مفتی صاحب کا انتخاب بلاوجہ نہیں تھا، قانون اور تعبیرات کی دنیا میں یہ ان کی امتیازی شان کی دلیل ہے۔ مسودہ تیار ہونے کے بعد دس ہزار ترمیمات بھی کردی جائیں تب بھی وہ اسی مسودہ اور فکر کے تابع مانی جائیں گی، بات سے بات نکالنا آسان ہے، لیکن پہلی بات پیدا کرنا آسان نہیں ہے اور یہی وہ مشکل کام تھا جس کو حضرت مفتی صاحب نے انجام دیا، **فجزاہ اللہ عنا احسن الجزا**۔

☆ مفتی صاحب نے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے مخطوطات سے جو علمی دنیا کو متعارف کرایا ہے وہ بھی اپنی جگہ بے انتہا اہم کام ہے، مخطوطات اور قلمی کتابوں سے مناسبت ہر عالم کو نہیں ہوتی، چند عبقری لوگ ہوتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے دو جلدوں میں مخطوطات کا تعارف لکھ کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، اور دارالعلوم کی طرف سے ایک بڑی ذمہ داری پوری فرمائی ہے۔

ایک شفیق مربّی

ایک محسن استاذ اور شفیق مربی کی حیثیت سے بھی مفتی صاحب کا مقام بہت ممتاز ہے، مفتی صاحب جس اپنائیت اور خلوص کے ساتھ طلبہ پر محنت کرتے ہیں اور ان کو بلند سے بلند مقام تک پہنچنے کی ترغیب دیتے ہیں وہ لاجواب ہے، مفتی صاحب کے فتوی کی زبان ہو یا کسی مقالہ کی، انتہائی سادہ اور عام فہم ہوتی ہے، عام قاری سمجھتا ہے کہ ایسی عبارت کوئی بھی لکھ سکتا ہے، لیکن لکھنے کو بیٹھے تو اچھے اچھے قلم کار ویسی عبارت لکھنے میں دقت محسوس کریں۔ مفتی صاحب چھوٹے اور عام فہم جملے لکھتے ہیں، طول طویل جملوں اور مشکل الفاظ سے فتویٰ یا مضمون کو گراں بار نہیں کرتے، اس طرح ان کا فتویٰ یا مضمون علمی بھی ہوتا ہے اور زبان وادب کے لحاظ سے معیاری بھی، ہندوستان میں ایسے مفتی گنتی کے ہوں گے جو اپنے فتاویٰ میں ان دونوں اوصاف کی رعایت رکھ پاتے ہوں۔

حضرت مفتی صاحب اپنے تلامذہ اور مستفیدین میں بھی اپنا رنگ منتقل کرنا چاہتے ہیں، وہ زبان سے کچھ نہیں بولتے لیکن غیر محسوس طور پر ان کے تلامذہ ان سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کا رنگ قبول کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ خواہش منداور باذوق طلبہ کی علمی اور فکری تربیت سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، حالاں کہ مفتی صاحب عمر کی جس منزل میں تھے وہ ان کے آرام کرنے کی تھی لیکن آخر تک وہ جوانوں سے زیادہ محنت کرتے اور طلبہ وفضلاء کی تعمیر وتربیت کا کام انجام دیتے رہے۔

مفتی صاحب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہونہار طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں اور اپنے بیٹے کی طرح ان سے محبت فرماتے ہیں، میں تو کچھ نہیں ہوں، لیکن میرے خاندانی پس منظر کی بنا پر مفتی صاحب مجھ سے بڑی محبت و

شفقت فرماتے تھے۔

جب میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا تو میری مشق فتاویٰ حضرت مفتی صاحب سے متعلق تھی، مفتی صاحب نہ صرف مشق فتاویٰ پر توجہ دیتے تھے بلکہ بعض دیگر موضوعات پر تحقیق بھی کراتے تھے، پورے ملک سے لوگ علمی طور پر ان سے رجوع ہوتے تھے، انھیں میں سے بعض کام وہ اپنے تلامذہ کے حوالہ کردیتے تھے، میں ان کا ادنیٰ ترین شاگرد تھا، لیکن مجھ پر ان کی عنایات بہت زیادہ تھیں، کئی اہم علمی موضوعات پر مفتی صاحب نے مجھ سے کام لیا اور مجھے کتابوں سے قریب کیا ..... علم وتحقیق، یا فقہی مقالات لکھنے کا جو کچھ بھی ذوق میرے اندر پیدا ہوا اس ذوق کا تخم اولین حضرت مفتی صاحب ہی نے ڈالا، بحث ونظر اور اسلامک فقہ اکیڈمی کو میں نے انہی کے خم وابرو سے پہچانا، علمی کتابوں کے مطالعہ کا شوق آپ ہی کی نظر عنایت کا صدقہ ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو جزائے خیر سے نوازے، آمین۔ میرا رواں رواں آپ کے احسانات سے سرشار ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت

ان تمام علمی کمالات وامتیازات کے ساتھ مفتی صاحب، صاحب دل بھی تھے، وہ تصوف و روحانیت سے بھی بڑا حصہ رکھتے تھے، وہ فقیہ خشک نہیں، بلکہ صاحب دل اور صاحب نظر فقیہ تھے، وہ حالات زمانہ پر بھی نگاہ رکھتے تھے اور احوال قلب اور کیفیات درون پر بھی۔

حضرت مفتی صاحب شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے بیعت ہونا چاہتے تھے اس لیے کہ ان کی بعض باطنی اصلاحات پہلے سے جاری تھیں، اور علامہ کے بعض وظائف بھی مفتی صاحب پڑھتے تھے، پھر مئو میں تعلیم

حاصل کرنے کی بنا پر مقامی اور ذہنی قرب بھی ان سے تھا، اگرچہ ایک خیال مولانا سید حسین احمد مدنی سے بیعت کا بھی آتا تھا، چنانچہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے تمام معاملات کی طرح آخر اس معاملہ میں بھی حضرت علامہ سے مشورہ کیا، علامہ ندوی نے جواب میں تحریر فرمایا:

''حضرت مولانا مدنی دامت فیوضہم کی ذات کے مقابلہ میں میرا نام لینا صرف آپ کی چشم محبت کا کرشمہ ہے ورنہ میں تو ان کے جوتہ کا تسمہ کھولنے کے قابل بھی نہیں۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

بزرگوں کا مشورہ یہی ہے کہ ''خاک از تودۂ کلاں بردار'' .....

میرے پاس حضرت والا تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی نسبت کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے میرے باب میں آپ کو غلط فہمی نہ ہو''۔

(علمی مراسلے، ص:۲۸، مکتوب:۱۸)

چنانچہ علامہ کے حکم کے مطابق حضرت مفتی صاحب، حضرت مدنی کی طرف رجوع ہوئے، مگر اس کے لیے علامہ سے سفارشی خط لکھنے کی درخواست کی، حضرت علامہ ندوی نے درخواست قبول کرتے ہوئے جواب تحریر فرمایا:

''مولانا مدنی کی خدمت میں آپ کا خط مع اپنے خط کے بھیج دیا ہے اور آپ کے نام کا لفافہ بھی پتہ لکھ کر اس میں رکھ دیا ہے، امید ہے کہ وہ آپ کو جواب دیں گے..... آپ کے اس کارڈ سے آپ کے اضطراب کا حال معلوم ہوا، جس بات سے آپ ڈرتے ہیں اس کے مآل وعواقب دنیاوی اور اخروی کو پوری طرح ذہن نشین کر کے اور اس کو بقوت دفع کیجیے اور یہ دعا پڑھیے، **اللھم اجعلنی اخشاک کانی اراک ابداً حتی القاک واسعدنی**

بتقواک ولا تشقنی بمعصیتک۔ اپنے کو ہر وقت علم یا عمل میں مشغول رکھیے، تاکہ بیہودہ افکار دل و دماغ میں جگہ نہ پائیں، دلی دعا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھیں، والسلام''۔ (علمی مراسلے، ص:۳۰، مکتوب:۲۱)

حضرت مفتی صاحب بالآخر مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہوگئے، ''علمی مراسلے'' میں خود تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت سید صاحب کے حکم سے ۱۰/مئی ۱۹۴۷ء کو بعد نماز مغرب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے مکان واقع لکھنؤ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے باضابطہ بیعت ہوگیا تھا''۔

(حاشیہ، ص:۳۳)

پھر علامہ ندوی نے باطنی تعلیمات کا سلسلہ بند کر دیا اور مشورہ دیا کہ اب وہ تعلیمات کے باب میں حضرت مدنی ہی سے رجوع کریں۔ اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا:

''اب آپ تعلیمات کے باب میں حضرت مولانا مدنی ہی سے معلوم کریں اور ان پر عمل کریں''۔ (ص:۳۳، مکتوب:۲۹)

مولانا فضل اللہ جیلانیؒ سے خلافت

اس طرح ایک خاصی مدت تک حضرت مدنی کی روحانی تربیت سے آپ نے استفادہ فرمایا اور سلوک کے منازل طے کیے، حضرت مدنی کے وصال کے بعد آپ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب سے رجوع ہوئے اور سلوک کی تکمیل فرمائی، بالآخر حضرت قاری صاحب کے مجاز ہوئے۔ اس کا پس منظر حضرت مفتی صاحب کی زبانی سنیے:

''حضرت مولانا فضل اللہ صاحب صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے پوتے تھے اور ان کو اولاً دادا رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت بیعت تھی، حضرت مولانا نے بے وہم وگمان ۴؍صفر ۱۳۹۵ھ مسجد دارالعلوم دیوبند میں بعد نماز ظہر روک لیا اور مولانا محمد رضوان امام مسجد عامرہ، حیدرآباد کو بلایا جو حضرت کے ساتھ آئے ہوئے تھے اور فرمایا میرے کپڑوں میں سے شیخ سنوسی والا جبہ لے آؤ، جب وہ آ گیا تو انھوں نے میرے حوالہ یہ کہتے ہوئے فرمایا کہ میں تم کو مسلمانوں کو بیعت کرنے کی اجازت دیتا ہوں اور یہ جبہ عطا کرتا ہوں، میرے نزدیک اس کے مستحق تم ہی ہو''۔ (علمی مراسلے، حاشیہ: ۲، ص: ۷۰)

یہ پورا واقعہ حضرت مفتی صاحب نے اپنے پیر ومرشد حضرت حکیم الاسلامؒ کو لکھ بھیجا جو اس وقت بمبئی کے سفر پر تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ نے جواب میں جو خط تحریر فرمایا ہے اس میں مفتی صاحب کو اجازت بیعت عنایت فرمائی، حضرت حکیم الاسلامؒ کے اس تاریخی خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سلام مسنون، نیاز مقرون، گرامی نامہ صادر ہوا، خوشی ہوئی، حضرت مولانا فضل اللہ صاحب دام مجدہٗ اپنے طریقے کے ایک شیخ اور بے نفس بزرگ ہیں، ان کی توجہ اور اجازت دِہی بلاشبہ فضل خداوندی ہے، اس پیش کش کو آپ نے قبول فرمایا، انشاء اللہ یہ خیر و برکت کا باعث ہوگی، آپ کے عمل اور مجاہدہ سے بڑھ کر یہ شہادت اور پیش کش بلاشبہ وقیع ہے اور فضل خداوندی ہے، اس بنا پر میں بھی آپ کو اجازت دیتا ہوں، جو بھی اللہ کا نام پوچھے اسے بتلادیا کریں، یہ آپ کے لیے اور اس کے لیے نافع ہوگا، حق تعالیٰ ہم

سب کو تقویٰ وطہارت عطا فرمائیں''۔ (ص: ۷۰، ۷۱، مکتوب: ۱۲)

غرض حضرت مفتی صاحب ایک صاحب نظر اور صاحب دل فقیہ تھے، زندگی میں بڑے انقلابات سے دوچار ہوئے اور مشکل سے مشکل حالات کا سامنا کیا، مگر علم کا یہ مسافر پوری استقامت کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن رہا اور دوست دشمن سب کے پیغام محبت دیتا ہوا اپنی حقیقی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ آمین

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ
اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ

ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی ☆

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ ایک غریب اور دین دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، آپ کی شخصیت اس دور میں صوبۂ بہار کے لیے سرمایۂ افتخار تھی، آپ نے اپنی زندگی کا سفر ایک معمولی اور غریب طالب علم کی حیثیت سے شروع کیا اور شب و روز کی محنت سے غیر معمولی ترقی کرتے ہوئے فضل و کمال کے بلند مقام تک پہنچے، انھوں نے علم وفن کی جو یادگار اور بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمیشہ یاد رکھے جانے کے لائق ہیں۔

مفتی صاحب مفتاح العلوم کے اس عہد کے فیض یافتہ ہیں، جو اس کا عنفوان شباب تھا اور نہایت تیز رفتاری سے ترقی کے منازل طے کررہا تھا اور جس سے مفتی صاحب کی زندگی کی بہت سی یادیں اور خوشگوار لمحات وابستہ ہیں۔

مولانا محمد ایوب اعظمی علیہ الرحمہ (متوفی ۱۴۰۴ھ- ۱۹۸۴ء) حضرت محدث الاعظمیؒ کے رفیق اور معاون تھے اور جب آپ نے ۱۳۴۷ھ میں مدرسہ مفتاح العلوم کی نشأۃ ثانیہ کرتے ہوئے اس کو شاہراہ ترقی پر گامزن کیا، تو مولانا محمد ایوب صاحب کو جو اُس وقت مدرسہ اسلامیہ دیوریا میں درس و تدریس کی خدمت

☆ نائب مدیر مجلّہ المآثر، مدرسہ مرقاۃ العلوم، مئو، یوپی

انجام دے رہے تھے، لاکر مدرسہ کا انتظام ان کے سپرد کیا۔

اس وقت کے ناظم مولانا محمد ایوب صاحب نے مفتی صاحب کا داخلۂ امتحان لیا اور جماعت کا انتخاب آپ ہی کے اوپر چھوڑ دیا، انھوں نے اپنے لیے ہدایہ کی جماعت کا انتخاب کیا، ہدایہ کے ساتھ اس وقت نورالانوار، مقامات حریری، قطبی اور ہدیہ سعیدیہ ان کے زیر درس تھیں۔ اول الذکر تینوں کتابیں مولانا محمد یحییٰ علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۶ھ-۱۹۷۷ء) سے اور قطبی و ہدیہ سعیدیہ مولانا شمس الدین صاحب علیہ الرحمہ (متوفی ۱۳۹۲ھ-۱۹۷۲ء) سے پڑھیں۔

اس سال ان کو علامہ اعظمی اور مولانا نعمانی کے درس سے استفادہ کا موقع نہیں مل سکا، اس کو بہت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں:

> ''جن دو اساتذہ کی شہرت پر داخلہ لیا تھا، ان میں سے کسی کے پاس میرا کوئی سبق نہیں گیا، یعنی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا عبداللطیف نعمانی کے یہاں، اس کا دلی افسوس رہا'' [۱]

لیکن دوسرے سال یہ حسرت پوری ہوگئی اور دیرینہ مراد برآئی، مسرت و انبساط کے عالم میں اس دوسرے سال کی نسبت مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> ''بعد رمضان وسط شوال میں آیا، تو اب جلالین کی جماعت میں داخلہ ہوا، اس لیے کہ ہم لوگ اچھے نمبرات سے کامیاب ہوئے تھے، اس سال جلالین اور حماسہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے یہاں؛ سلم اور میبذی اور مختصر المعانی حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی کے پاس اور مولانا شمس الدین صاحب کے یہاں [۲] اور متنبّی اور سبعہ معلقہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کے یہاں۔ قدرتاً دلی خوشی ہوئی کہ اب ان حضرات سے پڑھنے کی نوبت آئی، جن کی شہرت

علمی سن کر آنا ہوا تھا''۔[۳]

اساتذہ کی قابلیت کے ساتھ ان کی توجہ و تربیت اور مردم سازی کی فکر، اور اس پر طالب علم کا شوق و ولولہ اور محنت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، صلاحیت و استعداد میں پختگی اور نکھار آنا شروع ہوگیا، مفتی صاحب نہایت عمدہ پیرائے میں علامہ اعظمی کے درس کی خصوصیات کی تصویر کشی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ایک سال میں اندازہ ہو چکا تھا کہ مولانا اعظمی جو ''بڑے مولانا'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے سخت ہیں، عبارت خوانی ان کے درس میں لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں، کیا مجال کہ کوئی طالب علم ایک زبر زیر کی غلطی کر کے نکل جائے، اسی طرح ترجمہ میں بھی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، جہاں غلطی ہوئی مولانا کی طرف سے ''ہوں'' کی آواز آئی، اگر عبارت ٹھیک ہوگئی، تو کچھ نہیں فرماتے، مگر ''ہوں'' کے بعد بھی غلطی ٹھیک نہیں ہوتی تو مولانا کی چھڑی اٹھ جاتی تھی اور ساتھ نحوی وصرفی ترکیب وتعلیل کے سوالات شروع ہوجاتے، طالب علم پر کپکپی طاری ہوجاتی۔ اسی وجہ سے جس کو عبارت پڑھنا ہوتی وہ دو چار کتابوں کی مدد سے سارے مسائل حل کر کے جاتا تھا، مجھے یاد ہے کہ میرے پچیس ساتھیوں میں شاید کوئی میرے سوا پٹائی سے بچا ہو، میری نحو وصرف غالبًا اچھی تھی، ترکیب بھی صحیح کرڈالتا، اور صرفی سوالات کے جوابات بھی برجستہ دیتا اور شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا کی توجہ مجھ پر بہت زیادہ تھی، حالاں کہ میں بالکل نیا تھا، لیکن مطالعہ جم کر کیا کرتا تھا، ایک کتاب کے حل کے لیے کم از کم تین چار معاون کتابیں بالاستیعاب دیکھا کرتا تھا، سہ ماہی امتحان میں فرمایا کہ جلالین کے

ان دو صفحوں کی ترکیب کر جاؤ، تمہارا آج یہی امتحان ہے۔ الحمد للہ میں نے صحیح ترکیب کر کے سنادی، حضرت الاستاذ بہت خوش ہوئے، فرمایا تم نے جی خوش کر دیا''۔[۴]

مفتی صاحب ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا اعظمی مدظلہ اور مولانا نعمانی دونوں عبارت خوانی میں ایک زیر و زبر کی غلطی برداشت نہیں کرتے تھے، ترجمہ میں مولانا نعمانیؒ ایک حد تک نرم تھے، مگر حضرت مولانا اعظمی مدظلہ ترجمہ میں بھی اتنے ہی سخت تھے، جس قدر عبارت کی صحت میں، کیا مجال کہ کوئی غلط ترجمہ کر کے نکل جائے''۔[۵]

اس دور کی خوشگوار یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

''ان ساری سختیوں کے باوجود ہم طلبہ کے دلوں میں ان دونوں بزرگوں کا جو احترام اور جیسی محبت تھی، آج اس کا تصور بھی مدارس کے عام طلبہ نہیں کر سکتے، ہم طلبہ ان حضرات کے عاشق تھے اور ان پر جان نچھاور کرتے تھے، مدرسہ مفتاح العلوم کی طرف سے آج جو راحت کے سامان فراہم ہیں، اس زمانہ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا، صرف چار کمرے پختہ تھے، جن پر سائبان نہیں تھا، بقیہ کمرے مٹی کے کھپریل تھے، کہاں کی بجلی، کہاں پانی کا نل، اور کہاں کمروں میں موٹی موٹی دریاں اور بجلی کے قمقمے، خواب میں بھی کوئی یہ سوچ نہیں سکتا تھا''۔[۶]

دورۂ حدیث اور فراغت

مفتی صاحب نے حدیث کی کتابیں پڑھ کر وہیں سے فاتحۂ فراغ بھی

پڑھی، لکھتے ہیں:

''پھر ۱۳۶۴ھ-۱۹۴۴ء میں دورۂ حدیث بھی ان ہی دونوں بزرگوں سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی''۔ے

دورۂ حدیث میں آپ نے بخاری شریف اور ترمذی شریف حضرت محدث الاعظمی علیہ الرحمہ اور مسلم شریف و ابوداؤد شریف حضرت مولانا نعمانی مرحوم کی خدمت میں پڑھ کر تعلیم کے سفر کی تکمیل کی۔

دوران تعلیم مفتی صاحب کا قیام محلّہ چھترپورہ کی ایک مسجد میں رہا کرتا تھا، جو'' کھیت والی مسجد'' کے نام سے مشہور ہے، اس کے قریب ہی محلّہ باغیچہ میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب علیہ الرحمہ (متوفی ۱۴۱۴ھ- ۱۹۹۳ء) کا آبائی مکان تھا، مفتی صاحب حضرت مولانا مرحوم سے بھی استفادہ کرتے رہے، بلکہ گھر قریب ہونے کی وجہ سے گویا ان ہی کے زیر سرپرستی رہے، یہ مسجد چونکہ مئو اسٹیشن سے قریب ہے، اس لیے حضرت محدث الاعظمیؒ کے سفر کے آمد و رفت کے موقع پر آپ کی خدمت گزاری کرتے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ کا عموماً سفر ہوا کرتا تھا، بلا کر فرماتے کہ فلاں دن، مولوی امیر اللہ کو ساتھ کر لینا، زیادہ رات ہوتی تو مولانا یہیں محلّہ چھترپورہ کی مسجد میں قیام فرماتے اور صبح میں نماز فجر پڑھ کر گھر جاتے، جب کبھی مولانا کی طبیعت ناساز ہوتی تو میں رات بھر جاگ کر خدمت کرتا تھا، اس لیے مولانا کو بہت انس تھا''۔۸

تحریک آزادی میں حصہ

مفتی صاحب کی مئو میں طالب علمی کا زمانہ ہندوستان کی تحریک آزادی

کے شباب کا زمانہ تھا، مطالبۂ آزادی کی چنگاری جو عرصۂ دراز سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، وہ اگست ۱۹۴۲ء میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ ۹/اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے انگریزی حکومت کے خلاف ''ہندوستان چھوڑو تحریک'' کا ریزولیوشن پاس کیا، اس قرار داد کی منظوری انگریزی حکومت کے آشیانے پر برق بن کر گری اور برطانوی حکومت کو اپنا نوے سالہ اقتدار خطرے میں نظر آنے لگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۰/اگست کا سورج بھی نہیں طلوع ہوا تھا کہ ملک گیر پیمانے پر دارو گیر شروع ہوگئی، مفتی صاحب اس وقت اگرچہ طالب علم تھے، لیکن اس اہم تحریک میں قائدانہ رول ادا کیا، وہ مفتاح العلوم کے طلبہ کا کارواں لے کر باہر آگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر اور کالجوں کے طلبہ کا انبوہ ان کے گرد جمع ہوگیا اور وہ اپنی شعلہ بار تقریروں سے چشم زدن میں مقامی تحریک کے لیڈر بن گئے، برٹش گورنمنٹ نے ان کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے، وہ روپوش ہوکر اور کسی طرح بچ بچا کر مئو سے باہر نکلے، پھر جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور ان کا وارنٹ گرفتاری منسوخ ہوا، تو ایک سال کے بعد واپس آکر انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی، اس طرح اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں انھوں نے ملی قیادت اور قائدانہ صلاحیت کا لوہا منوالیا، لیکن اس صلاحیت کا گلا انھوں نے وہیں گھونٹ دیا اور اپنی توجہ تمام تر تدریسی، تصنیفی اور علمی مشاغل پر مرکوز کردی۔ مفتی صاحب نے اپنی اس سرگزشت کو اختصار کے ساتھ ''حضرت الاستاذ کی رہنمائیاں اور کرم فرمائیاں'' کے عنوان سے اپنے ایک مضمون میں قلم بند کیا ہے، جو المآثر جلد اول شمارہ نمبر ۳ میں شائع ہوا ہے، اسی طرح اس کے متعلق تھوڑا سا ''زندگی کا علمی سفر'' میں بھی لکھا ہے اور پھر ''جنگ آزادی کا ایک یادگار سفر'' کے نام سے اسی پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔

تدریس و افتاء کی مشق

فراغت کے بعد اپنی استعداد و صلاحیت کو فروغ دینے کے لیے یکسوئی کے ساتھ مطالعہ و کتب بینی نیز تصنیف و تالیف کا شوق دامن گیر ہوا، اس مقصد کے لیے مفتی صاحب کے دل میں دارالمصنفین اعظم گڑھ سے منسلک ہوکر اس شوق کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا، مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''فراغت کے بعد مئو میں رک گیا اور حضرت والا سے ہمت کرکے ایک دن درخواست کی کہ مجھے ایک سال کے لیے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں رکھوادیں۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ (م ۱۳۷۳ھ) سے آپ کے کافی مراسم تھے اور استاذ محترم برابر جاتے آتے بھی تھے، فرمانے لگے، غیر ندوی کو غالباً نہیں رکھتے ہیں، یوں موقع آیا تو سید صاحب سے ضرور تذکرہ کروں گا''۔[۹]

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ کی سید صاحب سے سفارش اور اس سفارش کے بعد مفتی صاحب نے اپنا اعظم گڑھ جاکر سید صاحب کی خدمت میں پیش ہونا اور سید صاحب کا سوالات کے ذریعہ امتحان لینا اور پھر ندوہ جاکر ایک سال کی تکمیل کے لیے سید صاحب کے شرط لگانے کو اپنی اُن تحریروں میں مفصل ذکر کیا ہے، جن کا حاشیہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ مفتی صاحب اس کے لیے آمادہ ہوگئے کہ رمضان کے بعد ندوہ جاکر داخلہ لے لیں گے۔

دوسری طرف قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، رمضان میں مفتی صاحب بیمار پڑ گئے اور یہ علالت اتنی طویل ہوئی کہ ندوہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، اس دوران سید سلیمان ندویؒ اور علامہ اعظمیؒ سے خط و کتابت رہی، دریں اثنا علامہ اعظمیؒ نے مفتاح العلوم کی کمیٹی سے یہ تجویز پاس کرالی کہ اپنے یہاں کے فارغ التحصیل

دو تین طلبہ کو مختلف شعبوں میں رکھ کر ان سے مختلف چیزوں کی مشق کرائی جائے، ان طلبہ میں سرفہرست مفتی صاحب کا نام تھا، اس سلسلے میں علامہ اعظمیؒ نے مفتی صاحب کو جو گرامی نامہ تحریر فرمایا تھا، اس کا متن حسب ذیل ہے:

''اب غور و فکر کے بعد تمھارے حق میں میں نے یہی بہتر خیال کیا کہ چند دنوں یہیں مدرسہ میں رہو، مدرسہ سے کھانے کے علاوہ کچھ وظیفہ بھی مقرر کردیا جائے گا۔ فتویٰ نویسی یا تدریس جس کا تم کو شوق ہو اس کی مشق ہم لوگوں کی زیر نگرانی کرو، اس کے بعد دیکھا جائے گا، لہٰذا اگر صحت ہوگئی ہو، تو جلد آجاؤ، میں نے اس سال کمیٹی میں اپنی تجویز رکھ کر پاس کرالی ہے کہ مدرسہ میں اپنے یہاں کے فارغ التحصیل دو تین لڑکوں کو مختلف شعبوں میں رکھ کر ان سے مختلف چیزوں کی مشق کرائی جائے، اگر تمھارے آنے میں دیر ہو تو فوراً مطلع کرو اور اندازے سے اپنے آنے کی تاریخ بتاؤ''۔[۱۰]

یہ تجویز مفتی صاحب کے لیے بہت خوش آئند تھی، وہ اس کی خوشی میں اپنی بیماری کی تکلیف بھول گئے، انھوں نے سید صاحب کے ایک مکتوب سامی اور علامہ اعظمیؒ کے مذکورہ بالا گرامی نامے کو ذکر کرکے لکھا ہے:

''اس خط کے بعد سارا مسئلہ حل تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل و کرم فرمایا اور خاکسار کے لیے ایک اچھی راہ پیدا فرمادی، اپنا مدرسہ اور اپنی مادر علمی میں یہ بڑا اعزاز تھا، جو حصہ میں آیا اور پہلا نام اس سلسلہ میں اس حقیر کا آیا، میں بار بار ان دونوں خطوں کو پڑھتا تھا اور رحمت خداوندی پر شکر گزار تھا کہ غیب سے یہ ایک بیمار اور مایوس طالب علم کی دلدہی کا کتنا عظیم انتظام ہوا ہے۔ ایک طرف سید صاحب جو ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالمصنفین کے سب

کچھ تھے، ان کا محبت نامہ اور مشورہ؛ اور دوسری طرف اپنے شفیق استاذ اپنی مادر علمی کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کا شفقت نامہ اور ہدایت نامہ''۔[۱۱]

اس کے بعد کا قصہ یہ ہے کہ وسط محرم ۱۳۶۴ھ مطابق اوائل جنوری ۱۹۴۵ء میں مفتی صاحب مئو آئے، ان کو عربی کے ابتدائی درجات کے لیے مدرس اور افتاء کی مشق کے لیے مفتاح العلوم میں رکھ لیا گیا، عین اسی دوران مفتاح العلوم میں ایک بھونچال سا آ گیا اور اس کا سبب یہ ہوا کہ مفتی صاحب کے اس دفعہ مئو آنے سے کچھ پہلے دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (م ۱۳۷۷ھ- ۱۹۵۷ء) اور حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ (م ۱۴۰۳ھ- ۱۹۸۳ء) مجلس شوری کی تجویز پر دارالعلوم کے صدر مفتی کے منصب کے لیے حضرت محدث الاعظمیؒ کو لینے مئو آئے تھے۔ یہ مفتاح العلوم کے لیے بڑی آزمائش کا وقت تھا، مدرسہ کی کمیٹی نے اپنی میٹنگ میں پہلے تو حضرت محدث الاعظمیؒ کے دیوبند جانے کی تجویز منظور کر لی، اس فیصلے کی اطلاع سے مئو شہر میں ہلچل مچ گئی اور مفتاح العلوم پر اہل شہر کا ایسا دباؤ پڑا، جس کی وجہ سے کمیٹی اپنی منظور کردہ تجویز واپس لینے پر مجبور ہوگئی، اس کی تفصیل مفتی صاحب کی کتاب ''زندگی کا علمی سفر'' (۴۳-۴۴) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مفتی صاحب کا بھی اس واقعے سے متاثر ہونا ناگزیر تھا، مگر اس کے باوجود وہ اپنا فرض منصبی ادا کرتے رہے اور محرم ۱۳۶۴ھ سے لے کر شعبان ۶۴ھ تک تدریس و افتاء کا کام کرتے رہے۔ شعبان کے بعد حالات ان کے حق میں سازگار نہیں رہ گئے اور علامہ اعظمیؒ کے مشورے سے وہ اس سال ندوہ چلے گئے۔

تدریسی خدمات

تکمیل کے لیے آئندہ تعلیمی سال یعنی ۱۳۶۴ھ میں مفتی صاحب ندوۃ

العلماء لکھنؤ گئے، مگر یہ بہت مختصر سا وقفہ رہا، ندوے میں صرف دو مہینے رہے کہ معدن العلوم نگرام میں درس و تدریس کی خدمت کے لیے وہاں کے بعض ذمہ داروں کی طرف سے سلسلہ جنبانی شروع کر دی گئی، مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''ابھی دو ماہ گزرے تھے کہ مولانا محمد اویس نگرامی جو ندوہ کے مدرس تھے تشریف لے آئے، ان سے اعظم گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی، وہ جانتے تھے کہ میں حضرت مولانا اعظمیؒ کا شاگرد ہوں، ایک دن بلا کر فرمانے لگے، آپ کیوں پڑھنے آ گئے؟ حالاں کہ آپ فارغ ہیں، آپ کو مدرسی کرنی چاہیے، میرے یہاں صدر مدرس کی ضرورت ہے، مشکوٰۃ وغیرہ پڑھانی ہوگی، آپ تیار ہوں تو وہاں بھیج دوں''۔[۱۲]

اس پیش کش کے بعد مفتی صاحب بہت حیص بیص میں پڑ گئے، ایک طرف تکمیل کا خیال، دوسری طرف تدریس کے لیے طلب اور پیش کش، بالآخر اپنے استاذ حضرت محدث الاعظمیؒ کے پاس خط لکھ کر مشورہ کیا، تو آپ نے جواب میں تحریر فرمایا:

''میرے نزدیک موجودہ حالت میں یہی بہتر ہے کہ نگرام کی ملازمت قبول کرو، نگرام میں رہ کر تعلیم کے ساتھ مطالعہ بھی کرو گے تو بہت کافی نفع ہوگا، مولانا اویس صاحب کے والد سے بہت مدد ملے گی انشاء اللہ''۔[۱۳]

یہ مکتوب سامی ۲۴/ اکتوبر ۱۹۴۵ء کا تحریر فرمودہ ہے، اکتوبر کے آخر یعنی اواخر ذی قعدہ ۱۳۶۴ھ میں مفتی صاحب نے مشغلۂ تدریس کا فیصلہ کرتے ہوئے معدن العلوم نگرام جا کر یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

نگرام میں دو سال کی مدت نہیں گزری تھی کہ ملک انگریزوں کے پنجے

سے آزاد ہوگیا، آزادی کے ساتھ ہی اس کے دوٹکڑے ہوئے اور فتنہ وفساد کا وہ طوفان برپا ہوا کہ پورا ہندوستان لہولہان ہوگیا۔ حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ سفر کرنا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا جانا جان پر کھیلنے کی طرح ہوگیا، مظفر پور سے لکھنؤ تک کا سفر مشکل ہوگیا، تو مفتی صاحب نے نگرام کو چھوڑ کر گھر کے قریب ہی ایک مدرسے میں مدرسی اختیار کرلی۔

والد کی وفات

ملک کے حالات کے ساتھ ساتھ ممکن ہے والد محترم کی وفات نے وطن سے قریب رہنے پر مجبور کیا ہو، آپ کے والد کی وفات کا سانحہ ۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ، ۲۷ر مئی ۱۹۴۶ء کو پیش آیا، اس دل گداز واقعے سے زندگی کی رفتار کا متاثر ہونا فطری تھا، چنانچہ مفتی صاحب نے ۲ر ج ون ۱۹۴۶ء کو گھر سے حضرت محدث الاعظمیؒ کو یہ خط لکھا:

''والد صاحب ۲۷ر مئی یوم دوشنبہ کو ۷ر بجے دن میں دار فانی سے دار بقا کو کوچ فرما گئے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ دے، حضور بھی دعا فرماویں گے۔

ممکن ہے والد کے سایہ اٹھ جانے کا مجھ پر کوئی خاص اثر نہ پڑے، آزادی تو بڑی حد تک ختم ہی ہوچکی ہے، گھر کا اب تک کوئی بار مجھ پر نہ تھا، اب تو بہر حال میں بھی شاید نہ بچ سکوں گا''۔

مدرسہ معینیہ سانحہ میں

دسمبر ۱۹۴۷ء میں مفتی صاحب نے نگرام سے سبک دوشی اختیار کرلی، حالات کی وجہ سے گھر والوں نے نگرام جانے کی اجازت ہی نہیں دی، اسی دوران

ضلع مونگیر کے ایک موضع سانحہ سے آپ کو درس وتدریس کے لیے پیش کش کی گئی، جس کو آپ نے منظور کرتے ہوئے وہاں طرح اقامت ڈال دی، لکھتے ہیں:

''۲ر ربیع الاول ۱۳۶۷ھ مطابق ۱۶ر جنوری ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر آیا، جو اس وقت ابتدائی مدرسہ تھا، بعد میں عربی درجات جاری ہوئے اور کوئی آٹھ سال وہاں قیام رہا''۔ ۱۴

سانحہ پہنچنے کے بعد دوسرے ہی دن ۱۷ر جنوری کو حضرت محدث الاعظمیؒ کی خدمت میں خط لکھا:

''ضلع مونگیر کے ایک معمولی قصبہ میں ایک مدرسہ کے لیے مجھے بلایا گیا، مونگیر سے چھ میل کی دوری پر واقع ہے۔ کل یہاں پہنچا، ارباب مدرسہ سے ملا، آج مدرسہ بھی دیکھا، چونکہ عرصہ سے کوئی عربی مدرس نہیں تھا، اس لیے کوئی عربی درجہ کا طالب علم نہیں ہے، میزان وغیرہ اور فارسی پڑھنے والے لڑکے ہیں..... نگرام کے لیے چونکہ گھر والوں کی مطلق رائے نہیں ہوتی تھی، اس لیے یہاں چلا آیا، لہٰذا اس سلسلہ میں حضور کی رائے سب سے پہلے معلوم کرنی ہے، تاکہ کوئی قطعی فیصلہ کیا جائے''۔

مفتی صاحب کو سانحہ میں صدر مدرس کا عہدہ تفویض ہوا، آپ پورے انہماک اور دلجمعی کے ساتھ اس کی آبیاری میں مشغول ہوگئے اور اس کو ترقی دینے میں کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کیا، اس کی تعمیر وترقی میں آپ اپنی پوری صلاحیت بروئے کار لاتے رہے۔ مفتی صاحب کی خودنوشت سوانح اور علامہ اعظمیؒ کے نام آپ کے لکھے ہوئے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب سانحہ گئے تو مدرسہ معینیہ کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی، کسی صاحب خیر کے مکان سے مدرسے کا کام لیا جاتا تھا، مفتی صاحب کی مساعی جمیلہ سے مدرسے کی عمارت وجود میں آئی

اور جہاں تک تعلیمی ترقی کا مسئلہ تھا تو اس کی نسبت مفتی صاحب نے لکھا ہے:

''مدرسہ تعلیمی اعتبار سے سال بسال ترقی کرتا رہا، عربی پڑھنے والوں کی دو تین جماعتیں تیار ہوگئیں، میری ساری توجہ ایک طرف طلبہ پر مرکوز تھی، دوسری طرف یہاں کے مسلمانوں میں علمی ذوق پیدا کرنے کی دلی خواہش، بحمداللہ میں ان دونوں میں کامیاب تھا۔

حضرت الاستاذ مولانا اعظمی برابر ترغیب فرماتے رہے تھے کہ خود اپنے مطالعہ پر زور دینا اور یہ کہ طالب علموں کی علمی صلاحیت سے کبھی چشم پوشی نہ ہونے پائے''۔ ۱۵

چند دن ڈابھیل میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سانحہ کے کچھ خاندانوں میں باہمی رقابت اور چپقلش تھی اور بعض لوگوں کے دلوں میں مفتی صاحب کا وجود کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا، وہ اپنی خاندانی عداوت کا غصہ مفتی صاحب پر اتارنا چاہتے تھے، مدرسہ کے سیکریٹری مفتی صاحب کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے، اور آپ سے محبت کا معاملہ فرماتے تھے، ان کے بارے میں مفتی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے سیکریٹری صاحب بااثر بھی تھے اور بہت نیک بھی، اور مجھ سے بہت محبت رکھتے تھے''۔ ۱۶

لیکن جو حالات تھے، ان میں مفتی صاحب کا رہنا مشکل تھا، اتفاق سے ان ہی دنوں آپ کے شفیق اور مہربان استاذ حضرت محدث الاعظمیؒ کی توجہ سے ایک بہت ہی اچھی اور مناسب جگہ کا انتظام ہوگیا، جس کی نسبت مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

''پہلے تذکرہ آچکا ہے کہ سانحہ کا ایک خاندان میرے خلاف تھا اور

وہ پروپیگنڈا کررہا تھا کہ مجھے پچاس روپے تنخواہ میری حیثیت سے زیادہ دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ حضرت الاستاذ نے بار بار لکھا کہ تم ڈابھیل چلے جاؤ، وہاں ایک سو پینتیس روپے سردست دیں گے، مشکوٰۃ وغیرہ کتابیں پڑھانی ہیں''۔ ۱۷

اس کے بعد علامہ اعظمیؒ کے لکھے ہوئے تین خطوط کو نقل کرکے مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''اس خط کے بعد اب میرے لیے عذر کا کوئی موقع نہیں رہا، یہ حکم تھا، میں نے یہ سارے خطوط سیکریٹری کو دکھائے اور مشورہ کیا، سیکریٹری صاحب نے فرمایا کہ میں آپ کو دو ماہ کی چھٹی دیتا ہوں، آپ استاذ محترم کے حکم کے بموجب ضرور جایئے، پھر ضرور واپس آنے کا وعدہ کیجیے، میرے گاؤں کے چند افراد جو مجھے کہتے ہیں پچاس روپے تنخواہ بہت ہے، ان کو معلوم ہوجائے کہ آپ کس حیثیت کے استاذ ہیں''۔ ۱۸

اس گفت وشنید کے بعد مفتی صاحب کے لیے ڈابھیل جانے کا راستہ ہموار ہوگیا، اور وہ سانحہ سے رخصت لے کر روانہ ہوگئے، اور وطن سے چل کر مئو اپنے استاذ محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ڈابھیل کا راستہ اور اس کے وسائل وذرائع سے متعلق معلومات بہم پہنچا کر بقول خود مفتی صاحب کے:

''حضرت مولانا اعظمیؒ کی دعا لے کر ۲۸/ یا ۲۹/ ذی الحجہ کو مئو سے روانہ ہوا''۔ ۱۹

اس وقت نہ راستہ اتنا آسان تھا جتنا اب ہے اور نہ آج کل کی طرح تیز رفتار گاڑیاں تھیں، مئو سے چل کر ۴۸ گھنٹے سے زائد میں سورت پہنچے اور وہاں سے ڈابھیل کی مسافت مستزاد۔ یکم محرم ۱۳۶۸ھ کو مفتی صاحب ڈابھیل پہنچے، اسی دن

قیام و طعام کا نظم وضبط اور معاملات طے ہوگئے، اسباق کا بھی نظام بن گیا، آپ کے ذمے جلالین، ہدایہ، مشکوٰۃ اور ابن ماجہ کا سبق سپرد ہوا اور دوسرے ہی روز سے آپ نے درس کا آغاز کردیا۔ پورب کے اہل علم میں مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ اور قاضی اطہر مبارک پوریؒ پہلے سے وہاں مسند درس سنبھالے ہوئے تھے، ان کی موجودگی سے مفتی صاحب کے دل میں اس اجنبی ماحول میں کچھ انس کا احساس پیدا ہوا اور انھوں نے نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض تدریس کی انجام دہی شروع کردی، لیکن یہاں کی آب و ہوا آپ کے حق میں سازگار نہیں ثابت ہوئی، چند ہی دنوں بعد بیمار پڑ گئے اور یہ بیماری اتنی شدید اور طویل ہوگئی کہ وہاں کی ملازمت سے دست بردار ہوکر وطن چلے جانے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ ۲۳ رمحرم ۱۳۶۸ھ کو ڈابھیل سے علامہ اعظمیؒ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''گذشتہ جمعہ سے بخار کا اثر تھا، دوشنبہ کو صبح تک پڑھاتا رہا، اس کے بعد بخار نے جب مجبور کرڈالا تو اسباق بند کردیے، ڈاکٹری علاج ہورہا ہے، رو بہ صحت ہوں، میں نے تحریر کیا تھا کہ اپنی ہمت تو ابھی ٹوٹی نہیں ہے، مگر اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اب ارباب مدرسہ غالباً میری گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر شاید کھٹک رہے ہیں، مہتمم صاحب پرسوں بھی عیادت کو تشریف لائے تھے تو فرمارہے تھے کہ یہاں کی آب و ہوا آپ کے موافق نہیں آئی، اور اس انداز میں جس سے معلوم ہورہا تھا کہ نہ آئندہ موافقت کی امید ہے ..... میرے خیال میں مدرسہ پر بار بن کر رہنا شاید مناسب نہ ہو، آہ اللہ تعالیٰ کی مشیت! کتنے شوق میں آیا تھا مگر نتیجہ کس قدر حوصلہ شکن ..... میں نے بھی اشارہ کردیا ہے

کہ جب تک مولانا -یعنی حضرت محدث الاعظمی- کا کوئی حکم نہیں آجاتا، میں ٹل نہیں سکتا''۔

بالآخر حالات نے ڈابھیل چھوڑنے پر مجبور کردیا، وہاں سے رخصت ہوکر پہلے مئو آئے، جس کی نسبت مفتی صاحب نے لکھا ہے:

''مختصر یہ کہ میں کسی طرح مئو پہنچ گیا، کافی کمزور ہوگیا تھا، حضرت الاستاذؒ نے دیکھا تو ان پر بھی اثر پڑا''۔ ۲۰

دوبارہ مدرسہ معینیہ میں

ڈابھیل سے واپس آنے کے بعد کچھ روز آرام کرکے جب صحت مند ہوگئے، تو دوبارہ پھر مدرسہ معینیہ سانحہ سے رشتہ استوار کرلیا اور اس کے دامن سے وہ کئی سال تک وابستہ رہے، حتی کہ سانحہ چھوڑنے کے بعد بھی اس کی یادیں آپ کے دل و دماغ سے وابستہ رہیں، ان یادوں کو کریدتے ہوئے مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''سانحہ میں کم وبیش آٹھ، سات سال رہا اور اس طرح کہ مجھے باہر والے وہیں کا باشندہ سمجھتے رہے اور کچھ آج بھی سمجھتے ہیں، مدرسہ کا جب اپنا مکان تیار ہوگیا، تو میرے رہنے کے لیے بھی چھپر کا مکان بنادیا گیا، میں اپنے بال بچوں کو گھر سے یہاں لے آیا اور ایک عرصہ تک میرے بچے، بیوی کا قیام سانحہ میں رہا''۔ ۲۱

دارالعلوم دیوبند میں

۱۳۷۵ھ کی کسی تاریخ میں مدرسہ رحمانیہ مونگیر کے کتب خانے کا افتتاح ہوا، اس میں شرکت کے لیے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مہتمم

دارالعلوم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مونگیر تشریف لائے، اس موقع پر مفتی صاحب نے کتب خانے کی اہمیت وضرورت پر ایک جامع اور پرمغز مقالہ پڑھا، مقالہ بہت پسند کیا گیا، بالخصوص مذکورہ بالا دونوں بزرگوں نے اس کی تحسین و ستائش کی، یہ تقریب مفتی صاحب کے لیے دیوبند جانے کا محرک بن گئی، دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ اورنشر واشاعت کو اس وقت ایک اچھے اور منجھے ہوئے صاحب قلم کی ضرورت تھی اور اس وقت تک مفتی صاحب کی کتابیں -''اسلام کا نظام مساجد''، اور''اسلام کا نظام عصمت وعفت''-طبع ہوکر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرچکی تھیں، جن سے مفتی صاحب کے اندر تصنیف وتالیف کے پوشیدہ جوہر کا پتہ چل رہا تھا۔ دارالعلوم کی ضرورت اور مفتی صاحب کے جوہر قابل کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے دیوبند واپس جاکر ۱۰/ذی قعدہ ۱۳۷۵ھ کو مفتی صاحب کے نام ایک خط تحریر فرمایا، جس میں دارالعلوم کی ضرورت کے مطابق شرائط درج کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''اس سلسلہ میں مختلف شخصیتوں کے نام کے ساتھ جناب کا اسم گرامی بھی سامنے آیا، بندہ کا حسن ظن تو ذات سامی کی نسبت جو ہے وہ ہے اور وہی اس کا باعث ہوا ہے، لیکن درخواست یہ ہے کہ معیار بالا کی رو سے اپنے بارے میں خود جناب بے تکلف اظہار خیال فرمادیں کہ ان خدمات مطلوبہ کو جذبات مذکورہ کے ساتھ انجام دے سکیں گے یا نہیں؟ اگر دے سکیں گے تو مطلع فرمادیں، تاکہ مجلس انتخاب میں اسم گرامی اپنی سفارش کے ساتھ پیش کرسکوں، ساتھ میں اگر کوئی مقالہ یا رسالہ یا مضمون یا تالیفات میں سے ہو تو اسے بھی ارسال فرمادیں، خواہ مطبوعہ ہو یا مخطوطہ''۔ ۲۲

کچھ اور خط وکتابت، غور وفکر ومشورے کے بعد اواخر محرم ۱۳۷۶ھ مطابق ۵/ستمبر ۱۹۵۶ء کو دیوبند کے لیے پابہ رکاب ہوگئے، دیوبند پہنچنے کے بارے میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''جس دن پہنچا اسی دن حضرت مہتمم صاحب سے ملاقات کی، حضرت نے خوشی کا اظہار فرمایا اور حکم دیا کہ آپ آج ہی اس کی رپورٹ لکھ کر مولوی عبدالحق پیش کار کے حوالہ کردیں، آج ۳/صفر ۱۳۷۶ھ/ ۹/ستمبر ۱۹۵۶ء تاریخ تھی اور کوئی آٹھ نو بجے دن کا وقت تھا''۔ ۲۳

مفتی صاحب شعبۂ تبلیغ سے وابستہ کردیے گئے اور اس سلسلے میں اولین کام جماعت اسلامی کے جواب میں کتب نویسی کا تھا، چنانچہ مفتی صاحب نے مختصر سی مدت میں''جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' کے نام سے ایک کتاب کا مسودہ تیار کرلیا۔

شعبۂ تبلیغ سے دارالافتاء میں

ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے دارالافتاء میں مفتی صاحب کے تبادلہ کی تجویز پاس کردی، دارالافتاء میں اولاً مفتی صاحب کے ذمے ترتیب فتاویٰ کا کام تھا، چند مہینوں بعد فتویٰ نویسی کی خدمت بھی آپ کے سپرد کردی گئی، مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

''۸/ذی قعدہ ۱۳۷۶ھ کو دارالافتاء میں آچکا تھا، ذی الحجہ کے بعد محرم میں اہتمام کا آرڈر آیا کہ مرتب فتاویٰ ترتیب فتاویٰ کے ساتھ کارافتاء بھی انجام دیں گے، ان سے یہ بھی کام لیا جائے، یہ حکم ۲۹/محرم ۷۷ھ کا لکھا ہوا، ۳۰ محرم کو موصول ہوا، چنانچہ ڈاک

بھی لکھنے لگا''۔ ۲۴؎

مفتی صاحب نے نہایت محنت، جاں فشانی اور عرق ریزی کے ساتھ ترتیب فتاویٰ کا کام انجام دے کر اصحاب حل وعقد اور ارباب انتظام کی نگاہوں میں قدر ومنزلت اور دلوں میں اثر پیدا کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارالعلوم کے بعض دوسرے شعبوں میں پائے جانے والے رخنوں کو بھی دور کرنے کے لیے شوریٰ کی طرف سے مفتی صاحب کا نام تجویز ہوا، جو آپ کے لیے کسی بلائے ناگہانی سے کم نہیں تھا۔

دارالافتاء سے کتب خانہ میں تبادلہ

اس وقت تک دارالعلوم کے کتب خانے کی حالت خستہ اور غیر منظّم تھی، اس کی ترتیب مناسب طرز پر نہیں تھی، مجلس شوریٰ میں جب اس کی جائزہ رپورٹ پیش کی گئی، تو اس کی بدحالی کی شکایت ملی، جس کو دور کرنے کے لیے بھی قرعہ مفتی صاحب کے نام نکلا، ارقام فرماتے ہیں:

''شوریٰ منعقدہ صفر ۱۳۸۲ھ نے متفقہ طور پر میرا تبادلہ دارالافتاء سے کتب خانہ میں کردیا، شوریٰ تجویز پاس کرکے چلی گئی تو میرے نام تبادلہ کا کاغذ پہنچا، دارالعلوم کے بڑے پیڈ کے پورے صفحہ پر میری تعریف لکھی گئی اور ظاہر کیا گیا تم ہی اس کام کو محنت سے انجام دے سکتے ہو، اسی وجہ سے کتب خانہ میں تبادلہ کیا جارہا ہے، کتب خانہ کی ترتیب بہت ضروری ہے، تاکہ اہل علم کی شکایتوں کا ازالہ ہوسکے۔ میں تبادلہ کا یہ کاغذ پڑھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا، آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا اور سوچا یہ میرے ساتھ زیادتی کس گناہ کی پاداش میں ہوئی، مسلسل کام

کرنے اور محنت کا شاید یہی نتیجہ ہوتا ہے''۔ ۲۵؎

کتب خانۂ دارالعلوم کی ترتیب کے لیے مفتی صاحب کو ہدایت کی گئی کہ وہ علی گڑھ، رام پور اور پٹنہ کا سفر کرکے وہاں کے کتب خانوں کی ترتیب کا جائزہ لے کر اپنا کام شروع کریں، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے مذکورہ بالا مقامات کے سفر کیے، اور واپس آکر اپنے مشاہدات کی روشنی میں زبان اور فن کے لحاظ سے جدید طرز کے مطابق کتب خانہ کو منظّم کرکے استفادہ کرنے والوں کے لیے سہل اور آسان بنادیا، یہ مفتی صاحب کا وہ تابندہ نقش ہے جو تادیر ان کی مستقل مزاجی، استقامت، اخلاص عمل اور حسن کارکردگی کی شہادت دیتا رہے گا۔ مفتی صاحب اپنی اس خدمت کا تذکرہ خود کرتے ہیں:

''مختصر یہ کہ کتب خانہ کی جدید ترتیب ہر اعتبار سے مکمل ہوگئی، زبان وار بھی اور فن وار بھی، ساتھ ہی کارڈ سسٹم بھی، اس وقت جس قدر رجسٹر ہیں، وہ سب میرے نقشے کے مطابق ہیں اور میرے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں''۔ ۲۶؎

کتب خانہ سے پھر دارالافتاء میں

مفتی صاحب تقریباً ۲۱/ برس تک کتب خانہ دارالعلوم میں نہایت صبر و استقلال کے ساتھ نظم وترتیب کا کام انجام دیا اور محنت ومشقت میں کوئی کمی اور کوتاہی نہیں کی، تاآنکہ شعبۂ افتاء میں ایک دفعہ پھر فتویٰ نویسی کے لیے کسی مناسب شخصیت کی ضرورت پیش آئی، تو مفتی صاحب کے نام کی تجویز پاس ہوئی، فرماتے ہیں:

''مجلس شوریٰ کا اجلاس ماہ صفر ۱۴۰۳ھ میں منعقد ہوا تو اس میں مفتی محمود صاحب گنگوہی جو سہارن پور گئے تھے، ان کی جگہ میرا نام

کسی نے پیش کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ملاحظہ ہو، اس نے مجھے
کتب خانہ سے بدل کر دارالافتاء میں مفتی بنا کر بھیج دیا''۔ ۲۷

اس وقت سے لے کر انتقال سے تقریباً دو سال قبل تک منصب افتاء پر فائز رہ کر شعبۂ افتاء سے وابستہ رہے اور درس افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے۔

کچھ دوسری سرگرمیاں اور انقلابات زمانہ

مفتی صاحب پچاس برس سے زیادہ دارالعلوم میں رہے، اس مدت میں آپ نے مختلف جہات سے دارالعلوم کی متنوع اور ٹھوس خدمات انجام دیں اور بہت اہم مواقع پر آپ سے دارالعلوم کے لیے کام لیا جاتا رہا۔ ۱۳۸۴ھ میں ''مطالعۂ علوم قرآنی'' کا شعبہ کھولا گیا، تو اس کی نگرانی کا کام آپ کے سپرد کیا گیا؛ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کے فرائض بھی آپ نے بہت دنوں تک انجام دیے: صدسالہ کے موقع پر دارالعلوم کے مختلف تعارفی کتابچوں کی ترتیب آپ کے ذمے کی گئی اور مفتی صاحب نے ہر ذمہ داری نہایت دیانت داری اور دل جمعی کے ساتھ انجام دی، اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی بھی محنت اور کوشش سے دریغ نہیں کیا۔

ندوۃ العلماء کے مخطوطات کی ترتیب

دارالعلوم دیوبند کے قیام کے دوران ہی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی علیہ الرحمۃ کے تقاضے پر ندوہ کے لیے ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ اس کے بکھرے ہوئے اور غیر مرتب مخطوطات کی ترتیب دی، مفتی صاحب کی علمی خدمات میں یہ ایک نہایت روشن اور تابناک خدمت ہے، جو بالعموم لوگوں کی نگاہوں سے مخفی اور پوشیدہ ہے، ۱۳/ رجب ۱۳۹۵ھ کو حضرت محدث الاعظمیؒ کے نام

ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مولانا علی میاں نے دارالعلوم دیوبند سے مجھے بذریعہ مہتمم صاحب مدظلہ طلب کیا تھا، کہ مخطوطات کا تعارف لکھنے کی سعی کی جائے، چنانچہ ۱۷/ جولائی کو چل کر ۱۸/ جولائی کو لکھنؤ آ گیا، یہاں آ کر معلوم ہوا کہ پہلے رائے بریلی جانا ہوگا، چنانچہ ۱۹/ جولائی ۷۵ء کو وہاں گیا، واپس آ کر مخطوطات کا کام شروع کر دیا، مگر کتابیں غیر مرتب ہیں اور ہر فن اور (کذا) خلط ملط، کوئی رجسٹر بھی مخطوطات کا نہیں ہے، سردست سرسری فہرست فن وار اور زبان وار خود ہی تیار کر رہا ہوں''۔

اس اہم کام کی قدرے تفصیل آپ نے اپنی خودنوشت سوانح میں بھی تحریر فرمائی ہے، اس میں اس سلسلے میں مذکور ہے:

''دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پچاسی سالہ جشن کا اعلان کیا، یہ جشن ۲۵/ ۲۶/ ۲۷/ ۲۸/ شوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۳۱/ اکتوبر و یکم ۲/ ۳ نومبر ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوا، اس سلسلہ میں اجلاس سے چار پانچ ماہ قبل حضرت مولانا علی میاں مدظلہ نے اپنے یہاں کی مخطوطات کی ترتیب کے لیے خاکسار کو یاد فرمایا، میں نے لکھا کہ حضرت مہتمم صاحب کو لکھیں، پھر میں حاضر ہوسکوں گا، انھوں نے مہتمم صاحب کو اس کے لیے لکھا، بالآخر ان کے حکم سے میں جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ میں اس کام کے لیے ندوہ حاضر ہوا، وہاں قلمی کتابوں کا حال بہت برا تھا، میں نے تین ماہ دن رات لگ کر تمام مخطوطات کی فہرست فن وار ترتیب کی خدمت انجام دی، پھر ان کتابوں کا تعارف لکھا، الحمدللہ جشن سے بہت پہلے یہ کام اختتام

پذیر ہوگیا''۔ ۲۸؎

سطور بالا میں اختصار کے ساتھ مفتی صاحب کی ان سرگرمیوں کے احاطہ کی کوشش کی گئی ہے، جو تحصیل علم، طلب معرفت، درس و افتاء، تدریس و افادہ اور ان کے علاوہ متنوع قسم کی جدو جہد اور علمی کاوشوں سے عبارت ہیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مفتی صاحب کی زندگی طالب علمی سے لے کر دم واپسیں تک کس قدر محنت ومشقت، تن دہی و دل جمعی، سعی وعمل، اخلاص و دیانت اور صبر و استقامت سے گزری ہے اور انھوں نے مشکل اوقات میں بھی حالات سے شکست نہیں کھائی، اور نہ ان کے سامنے سپر انداز ہوئے، پوری لگن اور سعی پیہم کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ انھوں نے بڑے سخت اور حوصلہ شکن حالات کا بھی پورے ہمت وحوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا، عسرت کی زندگی گزاری، بہت سے نشیب وفراز سے گزرے، انقلابات کے تند و تیز تھپیڑے سہے، لیکن پائے استقامت میں لغزش نہیں آنے دی۔

حضرت محدث الاعظمیؒ اور دیگر اہل علم سے تعلق

مفتی صاحب طبعی طور پر بہت نیک، شریف، سادہ لوح اور سعادت مند تھے۔ اساتذہ اور بزرگوں کی تعظیم واکرام، اور تلامذہ وخوردوں پر نگاہ شفقت ومحبت آپ کا خصوصی اور امتیازی وصف تھا، انھوں نے اپنے وقت کے اکابر اہل علم کے ساتھ عقیدت مندانہ و نیاز مندانہ تعلق رکھا اور حسب مراتب سب کی قدر ومنزلت کی، اور ان کا پاس ولحاظ رکھا، ان سے خط وکتابت اور سلسلۂ مراسلت رکھا، اہم اور ضروری امور میں ان سے مشورے کیے، ان سے رہنمائی طلب کی، اور ان کے ہدایت و ارشاد کے مطابق حیات مستعار کے مراحل ومنازل طے کرتے رہے۔ جن بزرگوں اور اہل علم سے آپ کے گہرے روابط رہے، ان میں سرفہرست حضرت

العلامہ سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی، حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی، حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب مئوی رحمہم اللہ جیسے ارباب علم وفضل تھے، لیکن آپ کی زندگی کی ڈور سب سے زیادہ جس ذات کے دامن فضل وکمال سے بندھی تھی، وہ آسمان علم ومعرفت کے نیر تاباں محدث ومحقق وفقیہ حضرت ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی شخصیت تھی، سطور ذیل میں حضرت محدث الاعظمیؒ کے ساتھ مفتی صاحب کے روابط وتعلقات کو کچھ مکاتیب کی روشنی میں سپرد قلم کرنا چاہتا ہوں۔

مفتی صاحب کی طالب علمی کے تذکرے میں لکھا جاچکا ہے کہ حضرت محدث الاعظمیؒ کی شہرت کی صدائیں سن کر مئو وارد ہوئے تھے، اور اسی وقت سے آپ کے دامن سے اس طرح بندھے کہ تاحیات ہاتھ سے نہیں چھوٹا، مفتی صاحب نے لکھا ہے:

> ''میرے سب کچھ حضرت اقدس ہی تھے، جب تک حضرت بقید حیات رہے، خاکسار اکتساب علم کرتا رہا، بڑی عنایتیں تھیں''۔ ۲۹؎

حضرت محدث الاعظمیؒ کی رہنمائیوں اور دیرینہ شفقت ومحبت کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''دیکھیے حضرت الاستاذ کی کیسی شفقت ومحبت تھی، اپنے ایک معمولی شاگرد کا کس قدر لحاظ و پاس تھا اور اس کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کا کتنا اہتمام تھا اور اس کی علمی زندگی میں کیسی مدد اور کرم فرمائی تھی''۔ ۳۰؎

اپنے ان ہی جذبات وتاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> ''استاذ محترم نے کہاں کہاں یاد کیا اور یاد رکھا، اپنے معمولی شاگرد

کو کیسے بڑھایا اور روشناس کرایا، اس کی حوصلہ افزائی فرمائی، اور
اخیر میں کتنی نفع بخش دعائیں بے ساختہ ایک نادان شاگرد کو دانا
بنانے کے لیے زبان قلم سے نکل رہی ہیں''۔ ۳۱؎

پھر اس غیر معمولی شفقت ومحبت اور اپنائیت کا ذکر کرتے کرتے از خود رفتہ ہوجاتے ہیں اور اسی عالم میں لکھتے ہیں:

''کوئی اس محبت کا اندازہ لگا سکتا ہے، حضرت الاستاذ باپ سے زیادہ
شفیق تھے اور میرے لیے آپ کے قلب میں بڑی جگہ تھی''۔ ۳۲؎

مفتی صاحب نے اپنے عظیم مربی اور شفیق استاذ حضرت محدث الاعظمیؒ کے ساتھ زمانۂ طالب علمی ہی سے خط وکتابت کے سلسلے کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ تادم آخر برقرار رہا، اس سلسلے میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''اس وقت اس مقالہ میں محدث کبیر نور اللہ مرقدہ کے احسانات
اور کرم فرمائیوں کا تذکرہ مقصود ہے، جن کا سایۂ عاطفت ابھی
سال بھر پہلے تک میرے سر پر قائم تھا اور میں ہر سال پابندی سے
حاضر ہوکر دعائیں لیا کرتا تھا، اور برابر خط وکتابت رکھتا تھا
حضرت اقدس کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے میرے نام خطوط کی
تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی''۔ ۳۳؎

مفتی صاحب کی اس تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ ''مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے'' میں حضرت محدث الاعظمیؒ کے مفتی صاحب کے نام جو خطوط چھپے ہیں، ان کی تعداد اس تعداد کی نصف ہے، جو حضرت محدث الاعظمیؒ نے مفتی صاحب کو تحریر فرمائے ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں جو خطوط طبع ہوئے ہیں ان کی تعداد ۸۴ ہے، ان مکاتیب کو پڑھنے کے بعد استاذ کی شفقت ومحبت، مودت ومروت، کرم گستری ورخوردنوازی، خبر گیری، حوصلہ افزائی اور دست گیری اور سب سے بڑھ کر علم دوستی و

معارف پروری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ہم صرف ان چند خطوط کے نقل پر اکتفا کرتے ہیں، جن سے مفتی صاحب کے قلب میں اپنے استاذ بزرگوار کی عظمت وجلالت اور قدر ومنزلت جھلکتی ہے اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد کے دل میں استاذ کی کس قدر محبت وعقیدت رچی بسی ہے۔ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے لکھتے ہیں:

''چند دنوں سے حال یہ ہے کہ ہمہ دم حضور کا ہی دھیان لگا رہتا
ہے اور سخت پریشان ہوں، درحقیقت میری زندگی حضور سے بہت
وابستہ ہے، منّو کی زندگی سے پہلے تک اخی المکرّم مولانا عبدالرحمٰن
صاحب کی خاص توجہ سے جو کچھ ہوا اور منّو کی ابتدائے زندگی سے
اب تک حضور کے سہارے سب کچھ ہوا، اور آئندہ بھی حضور کی ہی
شفقت اور رحم وکرم کا امیدوار ہوں، حضور کی تحریر سے طمانیت
نصیب ہوتی ہے''۔

یکم نومبر ۱۹۴۵ء کو معدن العلوم نگرام سے اہل علم کی خدمت میں باریابی اور تعارف سے متعلق لکھتے ہیں:

''شاہ حلیم عطا نے اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر صاحب سے میرا
تعارف نہایت اچھے جملوں میں فرمایا، اور بڑی مسرت ہے کہ
حضور کی نسبت سے سبھوں نے اچھا ہی سمجھا، اللہ تعالیٰ اسی نسبت
کی برکت سے صلاحیت بھی پیدا فرمادے، یہاں بھی میرا تعارف
حضور ہی کی نسبت سے کیا جارہا ہے، مولانا اویس صاحب کے
والد محترم حضور کے بڑے مداح اور قدر شناس بزرگ ہیں، اللہ
تعالیٰ ہم لوگوں کی خوش بختی سے حضور کی عمر میں برکت
عطا فرمائے''۔

مفتی صاحب کو اپنے استاذ حبیب ومشفق سے جو والہانہ اور قلبی تعلق تھا، اور دل وجگر میں استاذ کی جو عظمت رچی بسی تھی، اس کا اندازہ حسب ذیل خط سے بھی ہوتا ہے، جو نگرام ہی سے ۴؍ذی الحجہ ۶۵ھ کا تحریر کردہ ہے:

''بیضاوی شروع کرنے سے پہلے میں خود بھی ڈر رہا تھا، مگر الحمد للہ بتوفیق ایزدی اب تک کوئی ایسی بات پیش نہ آئی، آئندہ کے لیے دعا فرمائی جائے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر جلالین مستقل طور پر محنت کے ساتھ حضور کے یہاں پڑھ لی جائے، تو بفضل الٰہی تفسیر کی ہر کتاب بسہولت پڑھائی جاسکتی ہے، جتنی تندہی سے میں نے جلالین سورۂ بقرہ تک پڑھی تھی کاش پوری پڑھے ہوتا، درس کی یہی برکت دیکھ کر اب تک سوچتا ہوں ہر فن کی ایک ایک کتاب موقع نکال کر پڑھ لوں''۔

مفتی صاحب نے جب اپنی کتاب ''نظام مساجد'' تصنیف فرمائی، تو حضرت محدث الاعظمیؒ سے اس پر نظر ثانی کی درخواست یہ سوچ کر کی کہ استاذ کی نظر میں شفقت ومحبت اور کرم وعنایت کا جو جذبہ کارفرما ہوگا، وہ دوسروں کے پہلو میں کہاں پایا جاتا ہوگا، ۲۵؍جنوری ۴۹ء کا سانحہ سے لکھا ہوا خط محبت وعقیدت کی اس گرم جوشی کی ایک ہلکی سی تصویر پیش کررہا ہے، اس میں تحریر ہے:

''میری دلی خواہش ہے کہ حضور موقع نکال کر مجھے حاضر خدمت ہونے کی اجازت دیں اور حضور کی سرسری نظر ہی سہی ہوجائے اور ساتھ ہی ایک مقدمہ لکھ جائے تو پھر کسی اور بزرگ کے پاس بھیجی جائے، اس لیے کہ دوسرے لوگ تو چونکہ پہلی محنت ہے خامیوں پر نظر کرکے نہ معلوم کیا رائے قائم کریں''۔

استاذ کے ساتھ عقیدت واحترام کا تعلق آخر وقت تک کم نہیں ہوا، بلکہ ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اور قوت ومضبوطی پیدا ہوتی گئی، یکم ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ کو دیوبند سے لکھتے ہیں:

''مجھے اس کا شدت سے احساس ہے کہ اس سال حضرت الاستاذ دامت فیوضہم کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا، حضرت بہت یاد آتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۂ استاذی کا فیضان تیز ہوتا جارہا ہے''۔

۷؍رمضان ۱۴۰۸ھ کو دیوبند سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''نومبر میں حاضری کا ارادہ تھا، یہاں سے وطن اسی ارادہ سے نکلا تھا کہ واپسی مئو ہوکر ہوگی، پھر معلوم ہوا کہ حضرت عرب تشریف لے گئے، بلکہ واپسی میں علی گڑھ اترا تو وہاں مولانا یحییٰ ندوی سے ملاقات ہوئی، جو حضرت کے پاس سے ہی آئے تھے، ان سے پوری تفصیل معلوم ہوئی اور بتایا کہ حضرت مولانا دو ہفتہ میں غالباً آسکیں گے، انشاء اللہ شوال میں ضرور حاضری ہوگی''۔

استاذ وشاگرد کا جو باہم ربط تھا، استاذ محترم کو شاگرد پر اعتماد، اور شاگرد کو استاذ کے ساتھ جو غیر معمولی ربط وتعلق اور شیفتگی ووارفتگی تھی، بلکہ بہت حد تک استاذ کے محرم اسرار بھی تھے، اس پر ایک معمولی سی روشنی اس خط سے پڑتی ہے، جس میں حضرت علامہ بلیاویؒ (متوفی ۱۳۸۷ھ- ۱۹۶۷ء) کی وفات کے بعد دارالعلوم کے حالات کا ذکر ہے، مفتی صاحب نے ۲؍شوال ۱۳۸۷ھ کے خط میں لکھا ہے:

''حضرت علامہ کی وفات کی اطلاع کرچکا ہوں، بیماری کے دن ہی سے مشورے شروع ہوچکے تھے کہ صدر مدرس کس کو بنایا جائے، جو حلقہ مولانا اسعد صاحب کی طرف منسوب ہے، ان کی رائے حضرت الاستاذ مولانا حمیدالدین صاحب مدظلہ کے لیے راہیں

ہموار کرنے کی سعی میں ہے اور جو لوگ مولانا معراج صاحب نائب مہتمم کی طرف منسوب ہیں، وہ حضرت مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ کا نام لے رہے تھے اور ان کو مناسب بتا رہے تھے۔ جمیل مہدی جو اس وقت بڑی حد تک شہر کے نوجوان پارٹی کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے بھی جو مجلس مشاورت سے متعلق ہیں، انھوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ ایسے آدمی کو لایا جائے جو دارالعلوم کے شایان شان ہو اور علمی مزاج کے ہوں، اس سلسلہ میں انھوں نے (کذا) حضرت والا کا نام پیش کر رہے تھے کہ ان سے بڑھ کر اس وقت کوئی دوسرا محدث نہیں ہے، کسی نے کہا بھی کہ وہ تو مولانا اسعد صاحب کی طرف مائل سمجھے جاتے ہیں، اس پر بھی انھوں نے کہا تو بھی وہی مناسب ہیں اور یہ طے ہے کہ پہلے محدث اور عالم ہیں پھر کچھ اور ہیں، البتہ ان کے راضی کرنے کا سوال ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے مجھ سے بھی کہا کہ حضرت مولانا مدظلہ کو دارالعلوم کے علمی ماحول کو زندہ کرنے کے لیے آمادہ ہوجانا چاہیے، میں خاموش رہا، میں نے یہ البتہ کہا کہ متفقہ طور پر اگر سب مولانا سے عرض کریں گے تو ممکن ہے قبول فرمالیں، پھر آپ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی رائے معلوم کریں، جمیل مہدی صاحب نے کہا کہ وہ راضی ہوں گے اور بخوشی چاہیں گے، اور دوسرا گروپ بھی ان کے نام کے بعد ہمت نہ کرے گا۔

دارالعلوم میں جو لوگ غیر جانب دار اور علمی مناسبت رکھتے ہیں، ان کی رائے بھی حضرت اقدس کے لیے ہے۔ یہ صرف اس لیے لکھ رہا ہوں کہ پوری صورت حال سامنے آجائے''۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اعظمیؒ کا وہ یادگار مکتوب گرامی بھی نقل کردیا جائے، جو مفتی صاحب کے خط کے جواب میں آپ نے ان کو تحریر فرمایا ہے اور جس سے آپ کے علمی مزاج اور شفاف طبیعت کا پتہ چلتا ہے، ۵ر شوال ۱۳۸۷ھ کو لکھتے ہیں:

''تم نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بعید از قیاس نہیں ہیں، میرا خیال ہے کہ ہر دو فریق مجھے اس لیے گوارہ کرلیں گے کہ ہر ایک کے سامنے آئندہ جو اندیشے ہوں گے وہ میرے باب میں یا تو نہ ہوں گے، یا بہت کم ہوں گے، مگر میں اپنے دل کو جہاں تک ٹٹولتا ہوں، میرے دل کے کسی گوشے میں یہ تمنا نہیں ملتی، میں وہاں کے ماحول سے بہت متوحش ہوں، میں انشاء اللہ وہاں کا رنگ قبول نہیں کرسکتا اور یہ امید نہیں کہ میرا رنگ وہاں مقبول ہو۔ آج شوریٰ کا دعوت نامہ آگیا ہے، قوی امید ہے کہ انشاء اللہ شرکت کروں گا، تاریخ ۲۱ر جنوری مقرر ہوئی ہے۔ دیکھو خدا کو کیا منظور ہے''۔ ۳۴

اس کے آگے کا قصہ یہ ہے کہ جب مجلس شوریٰ منعقد ہوئی، تو اس میں حضرت محدث الاعظمیؒ نے حضرت مولانا فخرالدین صاحب کا نام پیش کیا اور اسی پر شوریٰ نے فیصلہ کردیا، مولانا سید محمد یحییٰ صاحب ندوی راقم الحروف کی کتاب ''حیات ابوالمآثر - جلد ثانی'' پر اپنے تاثراتی کلمات میں لکھتے ہیں:

''اس واقعے کے کچھ دنوں کے بعد حضرت - محدث الاعظمیؒ - پٹنہ تشریف لائے، تو میں نے پوچھا کہ حضرت مولانا ابراہیم بلیاویؒ کے بعد صدر مدرسی کا عہدہ کن کے سپرد ہوا؟ فرمانے لگے کہ مولانا عبدالصمد اور مولانا منت اللہ میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ صدر

مدرسی کا عہدہ قبول کرلیں، آپ کے علاوہ کوئی اور اس کا حق دار نہیں ہے، میں نے کہا کہ آپ لوگ یہ عہدہ میرے سپرد کررہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری اہلیت اور صلاحیت کے معترف ہیں، تو آپ لوگوں کے اس اعتماد کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ اس کے مجھ سے زیادہ حق دار مولانا فخرالدین ہیں، اس لیے ان ہی کے سپرد کردیا جائے، اور پھر اسی پر مجلس شوریٰ نے فیصلہ کردیا''۔ ۳۵؎

اس دوطرفہ ربط وتعلق کو پروان چڑھانے میں شاگرد کی محنت ومشقت اور جفاکشی کے علاوہ بہت بڑا دخل اس کی سعادت مندی اور خدمت گزاری کا بھی رہا ہوگا اور نہ جانے استاذ کی کس ساعت کی دعا نے اثر کیا ہوگا، دیکھیے مفتی صاحب حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کے تذکرے میں حضرت محدث الاعظمیؒ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ایک زمانہ میں بڑے مولانا پر دردگردہ کا حملہ ہوتا تھا، تو اس وقت عشاء پڑھ کر میں حضرت کے پاس چلا جاتا اور پوری رات خدمت میں گزارتا، اس کی خبر عام طور پر حضرت مولانا عبدالجبار صاحب ہی لے کر آتے، بڑے مولانا کو بھی خاکسار سے بڑی محبت تھی، جب کبھی بیمار ہوجاتا اور سبق میں حاضری نہیں ہوتی، تو حضرت مولانا مرحوم سے معلوم فرماتے کہ ظفیرالدین کا کیا حال ہے؟ مولانا جاکر خبر دیتے کہ اب روبہ صحت ہے''۔ ۳۶؎

اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر کردینا بھی نامناسب نہ ہوگا، ہمارے مخدوم بزرگ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب زید مجدہم - سانہہ، مونگیر- کی روایت ہے کہ حضرت محدث الاعظمیؒ نے کسی شوریٰ کے موقع پر دارالعلوم دیوبند میں قیام کے

وقت مفتی صاحب سے پانی مانگا، مفتی صاحب پانی لے کر آئے تو حضرت مولانا کی جب تک آنکھ لگ گئی، مفتی صاحب تقریباً آدھے گھنٹے تک پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر کھڑے رہے، پھر جب حضرت بیدار ہوئے تو آپ کو پانی پیش کیا۔ اب شاگرد کی ایسی سعادت مندی اور استاذ کی ایسی اطاعت وفرماں برداری کا تصور بھی محال ہے، شاگرد کی خدمت کا یہ واقعہ زمانۂ طالب علمی کا نہیں ہے، بلکہ دارالعلوم دیوبند جیسے موقر ادارے کے مربی ومدرس یا ایک بلند پایہ مفتی کا ہے۔

مفتی صاحب کا یہ معمول تھا کہ سال بھر میں ایک مرتبہ اپنے اساتذہ سے ملاقات کے لیے مئو ضرور حاضری دیا کرتے تھے، انھوں نے خود لکھا ہے:

''۱۹۴۰ء سے اب تک برابر سال میں ایک مرتبہ ضروری حاضری دیتا رہا''۔ ۳۷؎

مفتی صاحب کی یہ تحریر ۱۹۹۴ء کی ہے، یعنی تقریباً ۵۴ سال تک مفتی صاحب کا یہ معمول رہا ہے اور اس معمول میں بہت کم ناغہ یا تخلف ہوا ہے، تقریباً ہر سال ہی اساتذہ کی زیارت اور ان کی دست بوسی کے لیے مئو آیا کرتے تھے، لکھتے ہیں:

''حضرت الاستاذ مرحوم -یعنی حضرت مولانا عبدالجبار صاحب علیہ الرحمہ- جب تک بنارس مظہرالعلوم میں رہے ہیں، وطن سے واپسی پر پہلے مئو اترتا اور محدث جلیل کی خدمت میں حاضری دیتا اور دوتین دن قیام کرتا، پھر یہاں سے بنارس مولانا کی خدمت میں پہنچتا، اور وہاں کم از کم ایک دن مکمل قیام کے بعد دیوبند روانہ ہوتا''۔ ۳۸؎

مفتی صاحب مئو جب بھی تشریف لاتے اپنے مادر علمی مدرسہ مفتاح العلوم میں قیام فرمایا کرتے، جس کے دیوار ودر پر حضرت محدث الاعظمیؒ کی پچاس

سالہ یادیں نقش تھیں اور جسے حضرت محدث الاعظمیؒ نے اپنے خون پسینے سے سینچا اور پروان چڑھایا تھا، لیکن جب ۱۹۷۷ء کے قریب آپ نے بعض ناموافق حالات کی وجہ سے مفتاح العلوم سے قطع تعلق کرلیا اور پھر اس کے بعد مدرسہ مرقاۃ العلوم کی بنیاد رکھ کر اس کو تعمیر کیا، تو مئو حاضری کے موقع پر مفتی صاحب کا قیام مرقاۃ العلوم میں ہونے لگا۔ حضرت محدث الاعظمیؒ اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کے وصال کے بعد بھی اس پر عمل جاری رکھا، گو کمزوری اور دراز عمری کی وجہ سے اس پر سالانہ عمل نہیں ہو پاتا تھا۔ حضرت محدث الاعظمیؒ کے انتقال کے بعد بھی آپ کا قیام مرقاۃ العلوم ہی میں رہا کرتا، حالاں کہ اس کے بعد آپ کی مادر علمی کے بعض ذمہ داروں نے وہاں قیام کے لیے اظہار تمنا اور اس پر اصرار بھی کیا، لیکن آپ اپنے شفیق اور حبیب استاذ کے آستانۂ مبارک کو چھوڑ کر دوسری جگہ قیام کے لیے تیار نہ ہوئے۔

اس عنوان کے آخر میں مفتی صاحب کا عقیدت مندانہ اعتراف تشکر بھی نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ''اسلام کا نظام تربیت'' کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''اس موقع پر اپنے اساتذۂ کرام اور اکابر کی خدمت میں بھی ہدیۂ عقیدت ومحبت پیش کرتا ہوں، بالخصوص شیخ الحدیث حضرت الاستاذ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی اور حضرت الاستاذ مولانا عبدالرحمٰن صاحب دامت برکاتہم کی خدمت اقدس میں جن کی تعلیم وتربیت اور اخلاص دعا نے آدمی بنایا اور جن کے فیض صحبت سے یہ علمی شغف نصیب ہوا''۔

مفتی صاحب اپنی تصانیف کے لیے فراہمی مواد اور مراجع کی تلاش کے سلسلہ میں بھی حضرت محدث الاعظمی سے رجوع کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں مفتی

صاحب کی ایک بہت ہی قابل قدر مگر خاموش خدمت، جس کا عام طور سے اہل علم کو علم نہیں ہے، وہ ندوۃ المصنفین سے شائع ہونے والی حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی کی ''ترجمان السنۃ'' کی چوتھی جلد کا تکملہ ہے۔ ترجمان السنۃ کی یہ جلد ۵۱۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس کے ۴۲۸ صفحات میں حضرت مولانا میرٹھی کی تحریر پوری ہوجاتی ہے، جس کی شہادت خود کتاب میں موجود ہے، لیکن اس کے بعد کے ۸۵ صفحات خود مولانا میرٹھی کے تحریر فرمودہ ہیں، یا کسی اور عالم کے، اس کا پتہ کتاب سے نہیں چلتا، اس کا سراغ ایک خط سے ملتا ہے، جو مفتی صاحب نے حضرت محدث الاعظمیؒ کے نام ۳/ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ کو لکھ کر ارسال فرمایا ہے، ''ترجمان السنۃ'' کے اضافے سے متعلق مفتی صاحب کے خط کا متن حسب ذیل ہے:

> ''چوتھی جلد میں سو صفحہ کا اضافہ خاکسار کا ہے، مگر..... صاحب نے تذکرہ تک نہیں کیا، پتہ نہیں ان کی کیا مصلحت ہے، پہلے مجھے ہی دیباچہ لکھنے کو کہا تھا، رمضان میں گھر چلا گیا، عجلت میں لکھ سکا (کذا)، ..... صاحب کو خود دیباچہ لکھنا پڑا، مگر اضافہ کے ساتھ نام تک انھوں نے نہیں لیا، گویہ کوئی اہم خدمت ہے بھی نہیں''۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمان السنۃ کے کام کے سلسلے میں مفتی صاحب سے اسی وقت سے سلسلہ جنبانی ہورہی تھی، جب وہ دارالعلوم معینیہ سانحہ میں مقیم تھے، ۵/ جنوری ۵۵ء کو سانحہ سے حضرت محدث الاعظمیؒ کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> ''مفتی صاحب سے کیا بات چیت رہی، ترجمان السنۃ کا کام مجھ سے ہوسکے گا؟ کتابیں فراہم ہوجائیں اور حضور کی راہنمائی رہے تو محنت کرکے دیکھا جائے، اور اپنا خیال تو ہے ایسی کتابوں کے لیے کافی محنت کرنی پڑے گی، بہرحال اس طرح کا کام جب سپرد

فرمائیں تو اپنے ہی واسطہ سے''۔

چوتھی جلد کے تکملہ کے بعد پانچویں جلد کے لیے بھی اصرار ہوتا رہا، جیسا کہ اس زمانے کے متعدد خطوط میں مذکور ہے، مفتی صاحب ۲؍رمضان ۱۳۸۷ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مفتی صاحب ترجمان السنۃ کی پانچویں جلد کو کہہ رہے ہیں، یہ جلد اخلاق پر لانا چاہتے ہیں، ان کی شرط یہ بھی ہے کہ تم اپنے مولانا سے مل کر نقشہ بناؤ، تشریح بھی نہ ہو، ترجمہ ہو، اور مختصر تشریح، جس سے لوگ اکتائیں نہیں، اس سلسلہ میں کیا کیا جائے، اب تک ابتدا نہیں کی ہے''۔

پانچویں جلد کی تصنیف سے بھی مفتی صاحب فارغ ہو چکے تھے، انھوں نے ''مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے'' میں لکھا ہے:

''ترجمان السنۃ کی پانچویں جلد میں نے بطور خود تیار کر لی ہے، جو اخلاق پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ اس کی طباعت کا سامان فراہم کردے''۔[۳۹]

شاگرد کی نسبت استاذ کی رائے

دارالعلوم دیوبند کے ہنگامے کے بعد مفتی صاحب ناکردہ گناہی کی لپیٹ میں آگئے اور معتوب افراد کی فہرست میں شمار کیے جانے لگے، اس وقت حضرت محدث الاعظمیؒ نے اپنے شاگرد کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی، وہ مفتی صاحب کے لیے بڑی اہم سند ہے، مفتی صاحب لکھتے ہیں:

''اس کے بعد میری جبری چھٹی کا ہمارے بعض اساتذہ پر ناخوشگوار اثر ہوا، ان کی رائے تھی کہ اس حال میں دارالعلوم چھوڑ دینا ہی

مناسب ہوگا، سب سے زیادہ تکلیف ہمارے استاذ محترم محدث جلیل حضرت مولانا اعظمیؒ کو تھی، کیوں کہ طبعاً وہ بہت خوددار واقع ہوئے تھے، انھوں نے اظہار رائے کرتے ہوئے اپنے قریب ترین لوگوں سے فرمایا کہ جب سلیم میں اس کو جگہ مل رہی تھی تو وہیں رہ گیا ہوتا، بعد میں دیکھا جاتا، مئو سے ایسے خطوط آئے جس میں حضرت الاستاذ کی تکلیف کا اظہار تھا، حضرت کے پاس مختلف لوگوں کی طرف سے اس مضمون کے خطوط بھی بھجوائے گئے کہ ظفیر نے ہنگامہ میں نمایاں حصہ لیا ہے، پڑھتے اور ہنس کر فرماتے ظفیر طالب العلمی سے اب تک برابر میرے پاس آتا جاتا ہے، کیا وہ ایسا کبھی کرسکتا ہے، وہ طالب العلمی سے اب تک متین وسنجیدہ ہے، کبھی اس کی ایسی شکایت نہیں سنی گئی، اب اس عمر میں ایسا ہوسکتا ہے؟ لوگ پاگل ہیں، خواہ مخواہ میرے پاس ایسے خطوط بھیجتے ہیں، میں ان واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اور نہ اس کے سلسلہ میں کوئی غلط رائے قبول کرسکتا ہوں''۔[۴۰]

حواشی ومراجع

۱ زندگی کا علمی سفر، ۳۰

۲ یہاں عبارت کچھ پیچیدہ ہے، ترجمان الاسلام (۱۳۸) میں مفتی صاحب لکھتے ہیں: ''دوسرے سال دو اسباق حضرت مولانا اعظمی کے پاس اور ایک مولانا نعمانی کے پاس جلالین اور حماسہ کا سبق تھا اور مولانا نعمانی کے یہاں مختصر المعانی کا'' فلسفہ کی کتابیں آپ نے مولانا شمس الدین صاحب کے پاس پڑھی تھیں، حضرت محدث الاعظمیؒ کے نام ۴؍ذی الحجہ ۶۵ھ کے ایک خط میں لکھتے ہیں: فلسفہ کی دونوں کتابیں (سعیدیہ، میبذی) حضرت الاستاذ مولانا

شمس الدین صاحب کے یہاں ہوئی تھیں''۔

۳ زندگی کا علمی سفر، ۳۱

۴ ترجمان الاسلام- مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نمبر-: ۱۳۸

۵ تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی: ۱۰۲-۱۰۱

۶ ایضاً: ۱۰۲

۷ ایضاً: ۱۰۱۔ تذکرۂ مولانا عبداللطیف نعمانی میں آپ کا سن فراغت ۱۳۶۴ھ مذکور ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، صحیح ۱۳۶۳ھ ہے، جیسا کہ ''زندگی کا علمی سفر'' اور ''علمی مراسلے'' میں ہے، اور اس کی تائید علامہ اعظمیؒ کے ساتھ آپ کی خط و کتابت سے بھی ہوتی ہے۔

۸ زندگی کا علمی سفر، ۳۲

۹ المآثر: ج:۱،ش: ۳،ص: ۱۴، زندگی کا علمی سفر، ۳۶، علمی مراسلے: ۱۰-۹

۱۰ مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے: ۱۴۵، زندگی کا علمی سفر: ۴۲

۱۱ زندگی کا علمی سفر: ۴۲

۱۲ ایضاً: ۵۴

۱۳ ایضاً: ۵۶

۱۴ علمی مراسلے، ص ۱۵

۱۵ زندگی کا علمی سفر: ۸۴

۱۶ ایضا: ۸۲

۱۷ ایضاً: ۸۴

۱۸ ایضاً: ۸۷

۱۹ ایضاً: ۸۸

۲۰ ایضاً: ۹۳

۲۱ ایضاً: ۱۰۰-۹۹

۲۲ ایضاً: ۱۱۵

۲۳ ایضاً: ۱۲۷

۲۴ ایضاً: ۱۳۴

۲۵ ایضاً: ۱۳۶

۲۶ ایضاً: ۱۴۴

۲۷ ایضاً: ۱۸۳

۲۸ ایضاً: ۱۶۷

۲۹ علمی مراسلے: ۱۴۲

۳۰ المآثر، ج:۱،ش: ۲،ص: ۲۳

۳۱ ایضاً: ۲۴

۳۲ ایضاً: ۲۶

۳۳ ایضاً: ۲۶

۳۴ علمی مراسلے: ۸۲-۸۳

۳۵ حیات ابوالمآثر، جلد ثانی، ص ۳۵

۳۶ المآثر، ج:۲،ش: ۳،ص: ۹۲

۳۷ ایضاً: ۹۴

۳۸ ایضاً: ۹۲

۳۹ علمی مراسلے، ص ۱۸۴ (حاشیہ)

۴۰ زندگی کا علمی سفر: ۱۹۸

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ- باہمی رشتے

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

نوٹ : یہ مضمون حضرت مولانا محمد ولی رحمانی حفظہ اللہ کو لکھنا تھا، انھوں نے درخواست قبول کرلی تھی اور مضمون کا آغاز کردیا تھا مگر اپنی علالت کے باعث مکمل نہ کرسکے اور مندرجہ ذیل مکتوب کے ذریعہ معذرت ارسال فرمائی۔ راقم نے اپنی حد تک تلافی کی کوشش کی ہے، تاہم وضو اور تیمّم کا فراق واضح ہے۔

مخلص مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے بڑا اچھا کیا، حضرت مفتی صاحبؒ پر مجموعہ مضامین مرتب کرنے کا ارادہ کیا اور بحمداللہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ یہ کام پورا ہوگیا۔ جزاکم اللہ وتقبل اللہ- اپنے بڑوں کو یاد کرنا اور یاد رکھنا چھوٹوں کی شرافت اور خوشگوار ذمہ داری ہے، آپ نے بہت سے چھوٹوں کو اس کارخیر میں شریک کرلیا اور بہت سے لوگوں کے احساسات، معلومات اور تجربات کو اظہار کا موقعہ فراہم کیا، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بہترین بدلہ دے (آمین)۔ آپ نے خیر خلف لخیر سلف بزرگوں کے بہترین نمائندہ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

آپ کی محبت اور عنایت ہے کہ آپ نے مجھے حضرت مفتی صاحبؒ پر لکھنے کے لیے بار بار آمادہ کیا- ان کا مجھ پر حق ہے اور میری یہ ذمہ داری بھی ہے کہ ان کی یادوں کو تازہ کروں، ان سے میرا جو مخلصانہ مربیانہ رشتہ رہا ہے، اور نہ صرف

میرا بلکہ والد ماجد علیہ الرحمۃ سے جو تعلق خاطر اور عقیدت، ساتھ ہی کاموں میں اشتراک رہا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ میں بھی ایک مضمون کے ساتھ اس مجموعہ مضامین میں شامل رہوں، مگر ''مجموعہ'' بحمداللہ قریب منزل آخر ہے اور میں ابھی وسط مضمون میں ہوں، سوچتا ہوں، کیا کروں؟

ایک تو میرا مضمون، وہ بھی آدھا ادھورا، بھلا کس کام کا-؟ آپ کے علم میں ہے کہ رمضان کا بڑا حصہ کلکتہ میں علاج کی نذر ہوگیا، آخری عشرہ میں اعتکاف میں مونگیر مقیم تھا، اس موقعہ پر لکھنے لکھانے کا موقعہ ملتا کہاں ہے! عید کے دن سے پھر طبیعت خراب ہے، اور پھر معالج کی خدمت میں کل کلکتہ حاضر ہورہا ہوں- یقین کیجیے یہ داستان زندگی ہے، ''عذر گناہ'' ہرگز نہیں ہے، دو تین دنوں میں کچھ لکھ سکا تو ای میل کردوں گا، ورنہ متاع حقیر میں احساس ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں!

اللہ تعالیٰ آپکو اور گھر کے تمام افراد کو صحت وسلامتی، عزت وسعادت کے ساتھ رکھے (آمین)۔ والسلام

محمد ولی رحمانی

۵ رشوال المکرّم ۱۴۳۲ھ

امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی (ولادت ۱۹۱۲ء، وفات ۱۹۹۱ء) بیسویں صدی کے صف اول کے ہندوستانی علماء میں تھے، جو اپنی قائدانہ لیاقت، ملی حمیت، ایمان غیرت، مومنانہ فراست اور حق گوئی و بے باکی کے حوالہ سے معروف تھے۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کے نسبی، علمی اور روحانی جانشین اور خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین تھے، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے چوتھے امیر اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بانی جنرل سکریٹری تھے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور اس کی مجلس شوریٰ کے معزز رکن تھے۔

اعلیٰ دماغ، اولوالعزم، روشن خیال اور مفکر و منتظم تھے۔ ملت اسلامیہ کے مخلص وغم گسار اور نفاذ شریعت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ ان کا دماغ ملت اور شریعت کے مسائل پر سوچتا تھا، دل مسلمانوں کی مشکلات پر دھڑکتا تھا اور آنکھیں قوم وملت کی حالت پر اشکبار رہتی تھیں۔ ان کی آواز مظلوموں کی پکار تھی، ان کی زندگی انسانی خدمت کے لیے وقف اور اسلامی شریعت پر نثار تھی۔

ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی جرأت ایمانی کا قومی مشاہدہ اس وقت کیا جب ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی اور خاندانی منصوبہ بندی کا فرمان جاری کردیا۔ اس آمرانہ اور ظالمانہ حکم سے ملک کانپ اٹھا، ہر مکتب فکر کے علماء پریشان تھے مگر خاموش تھے، شعلہ بیانی ٹھنڈی پڑ گئی تھی، اسٹیج کی گھن گرج غائب ہوچکی تھی، ہر شخص بڑا ہو یا چھوٹا دم بخود مہر بلب تھا۔ ایسے ماحول میں اس مرد حق آگاہ کی آواز بلند ہوئی اور خاموشی کا سینہ چیرتی چلی گئی:

تو جفا میں مست ہے روز و شب ، میں کفن بدوش غزل بلب
تیرے رعب حسن سے چپ ہیں سب، رہوں میں بھی چپ تو مزہ ہے کیا؟

امیر شریعت نے نس بندی کی کھلے عام مخالفت کی اور طوق وسلاسل کے خوف سے بلند ہوکر کی، ظلم کی یہ کالی آندھی ختم ہو کر رہی، موافق ومخالف سب نے حضرت امیر شریعت کی غیرت وحمیت کی تعریف کی۔ اسی جرأت کا مظاہرہ انھوں نے شاہ بانو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلہ (۱۹۸۵ء) کے خلاف عوامی تحریک کے ذریعہ کیا تھا۔

حضرت امیر شریعت سے مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کا دیرینہ تعلق تھا جو کچھ کم نصف صدی پر محیط تھا، ابتدا میں یہ تعلق رسمی تھا، وقت گذرنے کے ساتھ یہ علمی اور دینی ہوا اور دوطرفہ اخلاق و اخلاص نے اسے ذاتی اور قلبی بنادیا تھا، پھر ایک وہ وقت آیا کہ مفتی صاحب کی محبوب ترین شخصیت مولانا منت اللہ رحمانی کی

ذات تھی، ان کا گھرانہ محبوب گھرانہ تھا، ان کے صاحب زادے حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ مفتی صاحب کے عزیز ترین شاگرد ہیں۔ مفتی صاحب محبت سے ان کو پیر جی کہا کرتے تھے اور ہمیشہ خانقاہ رحمانی جایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب کی آخری تصنیف جو مکتبہ نعیمیہ دیوبند سے شائع ہوئی وہ ان کی خودنوشت سوانح حیات ''زندگی کا علمی سفر'' ہے۔ مگر آخری کتاب جو ان کے زیر تصنیف تھی وہ امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی سوانح عمری تھی۔ مفتی صاحب چالیس پچاس صفحات لکھ چکے تھے مگر بیماری، ضعف اور نسیان کے باعث اسے مکمل نہ کرسکے اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

مفتی صاحب نے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی شخصیت کے بارے میں جو تاثر پیش کیا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''حضرت امیر شریعت کا ذہن وفکر روشن تھا اور دل زندہ تھا۔ سوچنے کا انداز ستھرا اور مخلصانہ تھا، ملک کی جنگ آزادی میں طالب علمی ہی کے دور سے شریک تھے، بے پناہ جرأت وہمت تھی، دور اندیشی اور دور بینی تھی، جو کام کرتے بڑی پامردی کے ساتھ کرتے اور وقت پر چوکتے نہیں تھے۔ کسی سے مرعوب ہونا جانتے نہیں تھے۔ وہ خود لاکھوں مسلمانوں کے محبوب مرشد اور ہزاروں برادران وطن کے بہی خواہ اور معتمد تھے۔ ہر صبح وشام ان کے در پر سینکڑوں ضرورت مند انسانوں کا ہجوم ہوا کرتا تھا، جس میں ہندو مسلمان، مرد وعورت سب ہوا کرتے تھے، اور آپ سبھوں کی ضرورت کا خیال فرماتے تھے''۔ (حضرت امیر شریعت - نقوش و تأثرات، ص ۲۴۷)

اس دل آویز اور دل ربا شخصیت سے مفتی صاحب کی عقیدت ومحبت

مثالی تھی۔ مفتی صاحب کے نام ہندوستان کے اکابر علماء خطوط کا منتخب مجموعہ علمی مراسلے کے نام سے قاضی پبلشرز دہلی نے شائع کیا ہے، اس میں مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کے ۷۷ خطوط شامل ہیں، اس مجموعہ مراسلات میں زیادہ خطوط مولانا رحمانیؒ ہی کے ہیں مگر وہ ان خطوط کا نصف ہیں جو مفتی صاحب کے نام امیر شریعت نے ارسال فرمائے تھے۔ کچھ خطوط تو ۱۹۸۲ء میں دارالعلوم کے ''مقدس فساد'' میں ضائع ہوگئے جو رہ گئے وہ مولانا احمد سجاد صاحب کے پاس محفوظ ہیں، ان میں ذاتی، علمی، سماجی، سیاسی ہر طرح کے امور کا تذکرہ ہے۔ بلکہ بعض خطوط ایسے حساس معاملات سے متعلق ہیں جن کے بارے میں شاید ہی امیر شریعت نے کسی اور سے تذکرہ کیا ہو۔ مکاتیب طرفین کے تعلقات اور خیالات کا آئینہ دار ہوتے ہیں، ان میں بے تکلفی اور سچائی ہوتی ہے۔ ان خطوط کے ذریعہ مفتی صاحب اور مولانا رحمانی کے باہمی رشتوں کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی صاحب سے مفتی صاحب کی ملاقات اور تعارف کا آغاز کس طرح ہوا وہ خود مفتی صاحب کی زبانی سنیے:

> ''آپ کو سن کر حیرت ہوگی، پہلی دفعہ خانقاہ رحمانی میں چلکوڑہ سے حضرت شیخ الاسلام کے ساتھ گیا تھا۔ بہت سارے لوگ تھے، ان سبھوں میں ایک میں بھی تھا، میری جان پہچان نہ اس وقت حضرت مدنی سے تھی اور نہ امیر شریعت سے[1] ..... سانحہ کی زندگی میں ایک زمانہ میں تہجد پر کچھ لکھ رہا تھا، قیام اللیل للمروزی کا میرے استاذ مولانا حلیم عطا صاحب نے نام بتایا تھا، کتاب باوجود

[1] غالباً مفتی صاحب سے سہو ہوا ہے، اس واقعہ سے ایک سال پہلے وہ مولانا حسین احمد مدنی سے لکھنو میں مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے گھر پر بیعت ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ۱۰/مئی ۱۹۴۷ء کا ہے۔ دیکھیے زندگی کا علمی سفر، ص ۱۷۲۔

> تلاش کے نہیں مل سکی تھی، معلوم ہوا کہ خانقاہ رحمانی مونگیر کے کتب خانہ میں ہے۔ حضرت سید صاحب (علامہ سید سلیمان ندویؒ) سے خط و کتابت تھی، حضرت نے ایک دفعہ لکھا کہ تم خانقاہ رحمانی مونگیر جاؤ، میرا یہ خط لے کر جاؤ اور مولانا منت اللہ رحمانی کو یہ خط دکھاؤ .....(یہ خط ۱۸/اگست ۱۹۴۸ء کا بنام مفتی ظفیر صاحب ہے)

کارڈ (خط) لے کر وہاں گیا اور حضرت سید صاحب کا خط دیکھ کر انھوں نے اثر لیا اور فرمایا آپ یہاں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ کتاب باہر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد میں برابر خانقاہ جاتا رہا اور یہاں سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب سے جان پہچان ہوئی اور ان کے کتب خانہ سے استفادہ کرتا رہا، مگر ابتدا یہیں ہوئی، پھر میرے تعلقات بڑھتے گئے اور آج بھی یہ تعلق بحمداللہ باقی ہے''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص ۱۰۵-۱۰۴)

مفتی صاحب مدرسہ معینیہ سانحہ میں صدر مدرس تھے، وہاں سے خانقاہ جاتے رہے۔ جب کبھی سانحہ میں جلسہ ہوتا تو مولانا رحمانی کو مدعو کرتے اور مولانا رحمانی اپنے مواعظ حسنہ سے مستفیض کرتے۔

۸/جنوری ۱۹۵۲ء کو حضرت مفتی صاحب نے مدرسہ معینیہ سانحہ کی عمارت کی بنیاد مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا منت اللہ رحمانی کے ہاتھوں سے رکھوائی بلکہ مولانا مدنیؒ کو لانے والے بھی مولانا رحمانیؒ تھے۔ وہ ان کے شاگرد بھی تھے۔ ۱۹۵۶ء میں جامعہ رحمانی مونگیر کی لائبریری کے افتتاح کا جلسہ ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنیؒ صاحب اور قاری محمد طیب صاحب بطور خاص شریک ہوئے تو مفتی صاحب نے لائبریری کی تاریخ پر ایک معلوماتی مقالہ مولانا رحمانی کی دعوت پر پیش کیا جو نہ صرف پسند کیا گیا بلکہ وہی مقالہ مفتی صاحب کی دارالعلوم دیوبند میں آمد کا ذریعہ بنا، علمی مراسلے میں مولانا رحمانی کا پہلا مکتوب اس طرح ہے:

''مکرم مولانا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ موصول ہوا، یادفرمائی کا شکریہ، جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی جس کے (لیے) معافی کا خواست گار ہوں۔

دیوبند سے جس جگہ کی آپ کو اطلاع دی گئی ہے میرے خیال میں وہ جگہ بالکل علمی نہیں ہے اور وہاں کے سیاسی فضا میں ہر شخص کا پنپنا مشکل ہے.....۔

والسلام منت اللہ

مفتی صاحب نے اس خط کے نیچے حاشیہ میں حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

''یہ حضرت والا کا غالباً سب سے پہلا خط ہے جو خاکسار کے خط کے جواب میں موصول ہوا۔ دارالعلوم طلبی پر مشورہ چاہ رہا تھا''

(علمی مراسلے، ص ۲۲۵)

اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے مگر چونکہ مفتی صاحب کے نام حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کے ابتدائی مراسلے ۱۹۵۶ء کے ہیں اور اسی سال ستمبر میں وہ دارالعلوم دیوبند گئے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ خط ۱۹۵۶ء کا ہوگا۔ یہاں شاید مفتی صاحب سے سہو ہوا ہے، مولانا رحمانی کا ان کے نام یہ پہلا خط نہیں ہے بلکہ پہلا خط وہ ہے جو دارالعلوم سانحہ کے جلسہ میں شرکت کی دعوت کے جواب میں مولانا رحمانی نے ان کو لکھا تھا۔ یہ خط ۲۱ رمئی ۱۹۵۱ء کو مفتی صاحب نے لکھا تھا۔ مولانا رحمانی نے اسی خط پر اسی دن جواب لکھ کر دستی بھجوایا تھا، خط اور جواب خط کا متن درج ذیل ہے:

''سیدی المحترم دامت فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج وہاج! گیلانی سے واپسی پر حاضری کا موقع نہ مل سکا، معاف فرمایا جائے۔ مولانا مناظر احسن

گیلانیؒ) نے اپنی معذوری ظاہر فرمائی، مولانا عبدالصمد رحمانی کا بھی اب تک کوئی جواب نہیں آیا۔ لہٰذا گذارش ہے کہ حضور اپنے ساتھ کسی مقرر کو لیتے آئیں، کوئی ضروری نہیں کہ اچھا ہی بولنے والا ہو، بولنا حضور کو ہے.....

والسلام محمد ظفیر الدین، دارالعلوم سانحہ

مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کا جواب مورخہ ۲۱ رمئی ۱۹۵۱ء اس طرح ہے:

''مکرم! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

میں انشاء اللہ ۲۶ رمئی کو پٹنہ سے سانحہ حاضر ہوں گا، کچھ ضرورت ایسی آن پڑی کہ مجھ کو پٹنہ رہنا ضروری ہوگا۔ جناب کو شاید اس کا علم نہیں کہ مجھ کو تقریر کرنا نہیں آتا، مقرر کے لیے آپ نے ایسے کم وقت میں اجازت دی ہے کہ اس کا نظم دشوار ہے۔ میں سعی کروں گا کہ کوئی صاحب آجائیں، آپ بھی سعی کریں گے.....

والسلام منت اللہ

ستمبر ۱۹۵۶ء میں مفتی صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تبلیغ میں اپنی ڈیوٹی جوائن کی، ابتدا میں تقرر عارضی تھا، دیوبند کے ماحول اور کچھ اشخاص سے مفتی صاحب مطمئن نہ ہوئے اور حاسدوں کی حرکتوں سے طبیعت پریشان ہوئی تو اپنے احوال حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کو لکھے، مولانا منت اللہ رحمانی صاحب نے ۳۰ رنومبر ۱۹۵۶ء کو مفتی صاحب کو جواب لکھا، مفتی صاحب کے نام دارالعلوم جانے کے بعد مولانا رحمانیؒ کا یہ پہلا خط تھا:

مکرم مولانا! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ آپ دیوبند میں کام کرتے رہیں گھبرائیں نہیں، دیر سویر دل لگ ہی جائے گا، مکتوب گیلانی ابھی

ابتدائی منزلوں میں ہے، اس نامہ سیاہ کو غیر ضروری کاموں سے کب چھٹی ہے جو ضروری کاموں کو انجام دے سکے۔ آپ کے پاس جو خطوط ہوں انھیں بھیج دیں۔ ابتدائی تقرر عارضی ہی ہوتا ہے۔ چھ ماہ بعد استقلال کا سوال سامنے آتا ہے، خیر وہاں جانے سے ایک فائدہ تو آپ کو پہونچا کہ اپنی جماعت کی کمزوریاں آپ کے سامنے آگئیں، کہیے بہار کے علماء اور اس کے مدارس غنیمت ہیں یا نہیں؟ غالباً دسمبر کے اخیر میں نصاب کمیٹی ہونے والی ہے، اس کے اندر حاضری کی سعی کروں گا اور تفصیلی گفتگو ہوگی، الحمد للہ بخیریت ہوں، خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

والسلام منت اللہ

مذکورہ بالا دونوں خطوط ''علمی مراسلے'' میں شامل نہیں ہیں بلکہ مفتی صاحب کے علمی ورثہ میں ہیں۔

مولانا رحمانیؒ جوانی میں یعنی ۱۹۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوگئے تھے اور اس شان کے ممبر تھے کہ بقول مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند:

''اس وقت مجلس شوریٰ میں ملک کے ممتاز علماء اور بڑے سنجیدہ، جہاں دیدہ، معاملہ فہم صاحب الرائے اور ذی الفواد حضرات تھے۔ اور مولانا منت اللہ رحمانی سن و تجربہ میں ان سے بہت بعد کے تھے، مگر جب میں ۱۹۸۵ء میں شوریٰ کا ممبر ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ مجلس شوریٰ میں مولانا رحمانی کی معاملہ فہمی، اصابت رائے اور قوت استدلال کا خاص وزن ہے'' (حضرت امیر شریعت نقوش و تاثرات، ص ۴۱)

مجلس شوریٰ اور دیگر جلسوں میں شرکت کے لیے سال میں دو تین بار مولانا رحمانیؒ دیوبند تشریف لاتے تھے۔ مفتی صاحب ان سے ملاقات کرتے اور ان کے کاموں میں تعاون کرتے تھے۔ بلکہ دارالعلوم دیوبند کے حالات سے مولانا رحمانی کی واقفیت کا معتبر ذریعہ تھے۔ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو جب کبھی علمی مسئلہ میں دارالعلوم کے کتب خانہ، کسی اہل علم یا کسی ادارہ سے رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ بلا تکلف مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کو لکھتے اور مفتی صاحب بخوشی اس کی تعمیل فرماتے۔ خواہ رسالہ دارالعلوم میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے مطبوعہ مضامین کی فہرست کی ضرورت ہو، یا طبقات ابن سعد کی جلدوں اور ان میں مذکورہ شخصیات سے واقفیت مطلوب ہو۔ ملا صدرا کی کتاب اسفار اربعہ سے متعلق معلومات کی ضرورت ہو یا مکاتیب گیلانی کی طباعت سے متعلق ضروری رابطہ۔ رد قادیانیت پر دیوبند سے شائع ہونے والی کتابوں کی فراہمی ہو یا جامعہ رحمانی مونگیر میں استاذ کے تقرر کا مسئلہ ہو ان امور میں مولانا رحمانی ان سے مشورہ کرتے اور مفتی صاحب ان کے ساتھ تعاون فرماتے۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۳ء میں ایک مکتوب میں مفتی صاحب کو مولانا رحمانی نے لکھا:

''مکرم و محترم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

..... دو کام آپ سے ہیں پہلا تو یہ ہے کہ ہم لوگ جامعہ میں اور اوپر کی کتاب پڑھانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے مولانا شیخ محمد صاحب مئو کو بلانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ میں بلاؤں، ہماری رائے یہ ہے کہ وہ خود مجھ کو لکھیں اگر آپ سے ہو سکے تو کوئی ایسی راہ نکالیے کہ ان کا خط میرے پاس آئے .....

دوسری عرض یہ ہے کہ مجھے سلاسل صوفیہ کے شجرہ کے سلسلہ میں مواد کی ضرورت ہے۔ یہ شجرہ مرشد اپنے مرید کو دیتا ہے، یہ کب

سے جاری ہوا، اس کو جاری کرنے والا کون ہے، کسی کتاب میں
اس پر گفتگو کی ہے یا نہیں، ذرا اس کو تلاش فرمائیے، مجھے اس پر
ایک مضمون لکھنا ہے''۔ (علمی مراسلے، ص ۳۹-۲۳۸)

دارالعلوم دیوبند کے اندرونی ماحول میں سیاسی اتار چڑھاؤ اکثر آتے رہے، باہمی کھینچ تان ہوتی رہی اور علمی اداروں میں ایسا تو ہوتا رہتا ہے، اس نشیب و فراز کی زد میں مفتی صاحب بھی آتے رہے اور کبھی کبھی بد دل بھی ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۶۱ء میں طلباء کی شورش کے اثرات اور بعض ملازمین کی طرف سے مفتی صاحب کے خلاف ریشہ دوانیاں ان کے لیے زحمت کا باعث بنیں۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ حاسدین ان کے درپے آزار ہیں اور ان کی علمی صلاحیت اور محنت کی ناقدری ہو رہی ہے۔ مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ:

''دارالعلوم دیوبند کی زندگی میں نہ کسی سے میری دوستی ہوئی اور نہ کسی
سے دشمنی مول لی۔ لیکن شروع میں طلباء کا میری طرف رجحان کافی
ہوا، مضامین لکھنے کے سلسلہ میں ان کی رہنمائی کیا کرتا۔ اس زمانہ
میں تقریر بھی اچھی کرتا تھا، مقالے اور مضامین بھی اچھا لکھ لیا کرتا تھا
اس لیے کچھ لوگوں کو حسد ہو گیا تھا''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص ۱۶۴)

اگرچہ مفتی صاحب مہتمم قاری محمد طیبؒ کی سرپرستی سے مطمئن تھے، مگر کبھی کبھی کسی اور مناسب جگہ کا خیال بھی دامن گیر ہوتا تھا، حضرت امیر شریعت جوہر شناس تھے، انھوں نے اس موقع پر مفتی صاحب کو امارت شرعیہ تشریف لانے اور یہاں کے نظام افتاء اور پندرہ روزہ نقیب کی ادارت سنبھالنے کی پیش کش کی۔ حضرت امیر شریعت اور ان کے ساتھ نائب امیر شریعت مولانا عبدالصمد رحمانی نے اس سلسلہ میں ان کو متعدد خطوط لکھے۔ ایک مکتوب میں جو ۲/ستمبر ۱۹۶۱ء کا ہے، مولانا منت اللہ رحمانیؒ لکھتے ہیں:

''مکرم بندہ مولانا ظفیر الدین صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
گرامی نامہ موصول ہوا، واقعتہً یہ بات ہم لوگوں کے لیے بڑے
صدمہ کی ہے کہ اپنی مادر علمی میں اس کے فرزند سکون و اطمینان
محسوس نہ کرسکیں، اب ان اداروں کا کیا حشر ہوگا اسے اللہ ہی بہتر
جانتا ہے۔ گرچہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے آپ کو چھوڑنا نہیں
چاہا ہے میں اپنے سابقہ خیال وارادے پر قائم ہوں۔ آپ چھ ماہ کی
چھٹی لے لیں اور تشریف لے آئیں ..... ۔ سردست دفتر امارت
سے ۱۵۰ روپے ماہوار آپ کی خدمت میں پیش کیے جاسکیں گے۔

والسلام منت اللہ

۱۴/اکتوبر ۱۹۶۱ء کے مکتوب میں مولانا رحمانی صاحب نے مفتی صاحب کے ایک خط کے جواب میں لکھا:

''اس وقت میں چاہتا ہوں کہ آپ تشریف لاکر افتا اور اخبار نقیب
کا کام کریں۔ ..... آپ کے حالیہ خط سے میرے ذہن پر یہ
اثر پڑا کہ شاید ہم لوگ اپنے سابقہ فیصلوں پر قائم نہیں ہیں اس
لیے یہ خط کچھ صاف طریقہ پر لکھ رہا ہوں۔
میں چاہتا ہوں کہ آپ امارت شرعیہ میں آجائیں اور اسی کے ہوکر
رہیں اور جلد آجائیں کام کیا ہوگا وہ اوپر عرض کیا اور پھر جب آپ
رہیں گے اور امارت کے شعبے آپ کے سامنے رہیں گے تو ہم لوگ
باہمی مشورہ سے بعد میں بھی کاموں کی تعیین کرسکتے ہیں۔ اگر آپ
آمادہ ہیں تو بسم اللہ۔ مذکورہ بالا گفتگو کے پیش نظر لمبی فرصت جو کم از
کم چھ ماہ کی ہو، لے کر تشریف لے آئیں۔ (علمی مراسلے، ص ۲۳۴)

قدرت کاملہ نے مفتی صاحب کی قسمت میں دارالعلوم دیوبند کی خدمت

اور فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب لکھی تھی، حضرت مہتمم قاری محمد طیب صاحب نے مفتی صاحب کو دیوبند سے جانے کی اجازت نہیں دی اور یہاں رہ کر یکسوئی سے کام کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ حضرت امیر شریعت دور اندیش تھے، مفتی صاحب کی صلاحیتوں سے واقف تھے، جب یہ دیکھا کہ مفتی صاحب کا دیوبند سے واپس آنا مشکل ہے تو امارت شرعیہ کے علمی کاموں میں تعاون کرنے، لٹریچر تیار کرنے اور اس کے علمی اور انتظامی امور میں شرکت کرنے کی دعوت دی جسے مفتی صاحب نے بخوشی قبول کی اور اس طرح وہ دیوبند میں رہ کر امارت شرعیہ پٹنہ کی علمی وفقہی سرگرمی میں حصہ لیتے رہے۔ بقول ڈاکٹر کلیم عاجز:

ہم اگرچہ بزم سے دور ہیں، ہمیں رنگ ہیں ہمیں نور ہیں
ہم اگر نہ دیں گے لہو انہیں، وہ چراغ کیسے جلائیں گے

امیر شریعت نے مفتی صاحب سے ایک کتابچہ بنام ''امارت شرعیہ کتاب وسنت کی روشنی میں'' لکھوایا اور بڑی تعداد میں شائع کر کے عوام میں تقسیم کرایا، اس سلسلہ میں ۱۳؍رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ کے مکتوب میں لکھا:

''ایک رسالہ یک جزئیہ تو اس انداز سے لکھا جائے جس سے عام لوگ امیر کی ضرورت اور اس کی اطاعت کو سمجھ لیں۔ دوسرا رسالہ یک جزئیہ یا زائد سے زائد دو جزئیہ امارت شرعیہ کے نظام پر لکھا جائے کہ یہی تنظیم دینی وشرعی تنظیم ہے، جو امیر کی اطاعت سے شروع ہو کر نقیب کی نگرانی اور اس کی اطاعت پر ختم ہوتی ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب میں آپ کو تاریخ امارت از حضرت نائب صاحب مدظلہ (مولانا عبدالصمد رحمانی) سے پوری مدد ملے گی، بس ابھی یہ دو رسالے لکھ کر بھیجئے۔

والسلام منت اللہ

(علمی مراسلے، ص ۲۳۲)

کتابچہ کی اشاعت کے بعد امیر شریعت نے امارت شرعیہ کی تاریخ، طریق کار اور نظام پر ایک مفصل کتاب مفتی صاحب سے لکھوائی جو ''امارت شرعیہ دینی جدو جہد کے روشن باب'' کے نام سے دفتر امارت شرعیہ پٹنہ سے شائع کی۔ اس سلسلہ میں ایک مکتوب میں جو یکم رمضان المبارک ۹۳ھ مطابق ۷۳ء کا ہے مفتی صاحب کو لکھا:

''ابھی میں (نے) مسودہ دیکھا جس کا مبیضہ آپ کے پاس جا چکا ہے، ..... میں چاہتا ہوں کہ جہاں تک کتابت ہو جائے آپ تصحیح فرماتے جائیں پورے اہتمام کے ساتھ اور چھپتی بھی جائے .....مطلع فرمائیں کہ کتنی کتابت ہوئی، فکر میں ہوں کہ مولانا علی میاں صاحب اور ان سے نہ ہو سکے تو مولانا منظور نعمانی سے آپ کی کتاب ''امارت شرعیہ دینی جدو جہد کا روشن باب'' پر مقدمہ لکھوالوں، آج مولانا علی میاں کو خط لکھ رہا ہوں''۔

والسلام منت اللہ

(علمی مراسلے، ص ۶۵-۲۶۴)

مفتی صاحب نے اس کتاب کی بابت لکھا ہے:

''کئی سال کی محنت وکاوش سے بحمد اللہ یہ کتاب تیار کر کے امیر شریعت مدظلہ کے پاس بھیج دی، حضرت نے نظر ثانی فرمائی اور مناسب رائے دی''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص ۱۶۲)

دیوبند میں مفتی صاحب کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنی منصبی کارکردگی اور علمی سرگرمی سے اپنے اساتذہ مولانا عبدالرحمانؒ اور مولانا حبیب الرحمان اعظمیؒ کے علاوہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو مطلع کرتے تھے۔ مولانا رحمانی ان کی علمی سرگرمیوں سے خوش ہوتے، تعریف وتوثیق فرماتے، دعا اور مشوروں سے نوازتے، حضرت

مفتی صاحب کو جب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کی تنظیم وترتیب کا کام مہتمم قاری محمد طیب صاحب نے سونپا تو مفتی صاحب نے نئی ذمہ داری اور علمی مصروفیات کے متنوع تقاضوں کی بابت مولانا رحمانی کو مفصل خط لکھا، جواب میں مولانا رحمانی نے حسب ذیل مکتوب ۷/اکتوبر ۱۹۶۲ء کو روانہ فرمایا:

''تفصیلی والا نامہ سے سرفرازی ہوئی، مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ کتب خانہ کا جو کام آپ کے سپرد کیا گیا ہے وہ اچھا ہی انجام پائے گا، اگر یہ اعتماد نہ ہوتا تو آپ کا نام وہاں نہ آتا۔ آپ رام پور، علی گڑھ و پٹنہ ہوآئیں پھر انشاء اللہ کتب خانہ رحمانیہ کی فہرست بھی آپ ہی کی ہدایت کے مطابق تیار کرائی جائے گی.....''۔

والسلام منت اللہ

ایک اور مکتوب میں جو ۵ رمضان المبارک ۸۲ھ مطابق ۱۹۶۳ء کو لکھا گیا ہے، حضرت مولانا رحمانیؒ نے مفتی صاحب کو لکھا:

''کتب خانہ میں جناب کو اسی توقع کی بنا پر بھیجا گیا ہے کہ آپ اپنی محنت اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں سے کتابوں کی ترتیب کی اس گتھی کو سلجھا سکیں گے جو دارالعلوم کی پچاس سالہ تاریخ میں کبھی سلجھ نہ سکی''۔ (علمی مراسلے، ص ۲۳۸)

مفتی صاحب نے کتب خانہ کی ترتیب وتنظیم کے ساتھ فتاویٰ دارالعلوم کی ترتیب وتہذیب کا جو کارنامہ انجام دیا مولانا منت اللہ رحمانیؒ قاری محمد طیب صاحب کی طرح اس سے بہت مطمئن اور مسرور تھے، حضرت مفتی صاحب کی بڑی تعریف کرتے اور دعائیں دیتے۔ مفتی صاحب کے نام ایک مکتوب میں جو ۱۴/جولائی ۱۹۶۵ء کو لکھا گیا، مولانا رحمانی رقم طراز ہیں:

''یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ فتاویٰ کی پانچویں جلد، جلد ہی پریس

میں جانے والی ہے، نظام امن وامان کی کتابت شروع ہوگئی ہے۔ فتاویٰ کی ترتیب آپ کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی قلمی کاوش اور دینی وعلمی خدمات کو قبول فرمائے اور بھرپور اجر عطا فرمائے''۔ (علمی مراسلے، ص ۲۴۳-۲۴۲)

مفتی صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد مرتب کی اور جب اس کے چھپنے کی نوبت آئی تو ٹائٹل سے مرتب فتاویٰ کا نام غائب کردیا گیا، یہ حضرت مہتمم صاحب کی اطلاع کے بغیر کیا گیا۔ یہ بات کسی طرح مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کو معلوم ہوئی، انھوں نے مفتی صاحب کو بتائے بغیر ایک خط قاری طیب صاحب کو لکھا، وہ اس وقت پاکستان میں تھے، اہتمام کے پیش کار صاحب نے مولانا رحمانی کا خط اور مفتی صاحب سے بھی خط لے کر مہتمم صاحب کو پاکستان بھیجا۔ مہتمم صاحب نے جواب میں لکھا:

''حق پسندی کا تقاضا بھی ہے کہ یہ نام آنا آپ کا حق ہے، جب کہ اول سے آخر تک محنت آپ کی ہے''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص ۱۵۷)

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ شعبۂ مطالعہ علوم قرآنی کے نگراں تھے اور منتخب طلبہ کی تصنیفی تربیت اور قرآنی علوم سے مناسبت پیدا کرنے پر مامور تھے۔ چند سالوں کے بعد یہ شعبہ نائب مہتمم صاحب کی کوششوں سے بند کردیا گیا۔ اس واقعہ سے مفتی صاحب کو بھی تکلیف ہوئی اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کو بھی۔ ۲۹/جولائی ۱۹۶۸ء کو مفتی صاحب کے نام ایک خط میں مولانا رحمانی نے اپنی تکلیف کا اظہار ان لفظوں میں کیا:

حضرت محترم زید مجدکم السامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے مزاج عالی بعافیت ہو،

یہ عریضہ اس صورت حال سے متاثر ہوکر جناب کی خدمت میں لکھ رہا

ہوں جو دفتر مطالعہ علوم قرآنی والے کمرے کے سلسلے میں ہمارے ہی منتخب کیے ہوئے نائب مہتمم صاحب نے اختیار کیا ہے۔ دارالترتیب اور اس کے دفتر اور اس میں آنے والے غیر مستقل ملازم جیسے کچھ ہوں گے، اسے دارالترتیب کے ماضی کو سامنے رکھ کر آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ ایسے دارالترتیب کے نام پر مطالعہ علوم قرآنی کے دفتر اور اس کے ذمہ دار اور دارالعلوم کے قدیم کارکن جو اپنی تالیفات اور ترتیب فتاویٰ کے باعث دارالعلوم دیوبند سے باہر بھی اپنا تعارف رکھتے ہیں، پر ہاتھ ڈالنا اور انتشار میں مبتلا کرنے کی کوشش کرنا میرے خیال میں کوئی دانش مندانہ کام نہیں۔

امام سرخسیؒ نے سیدنا عمر بن الخطابؓ کا وہ خط نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو قضا سپرد کرنے کے بعد لکھا تھا، فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں: ''**فافهم اذا ادلیٰ الیک**'' پھر آگے چل کر فرماتے ہیں: ''**الفهم الفهم فیما یختلج فی صدرک**'' اس خط کے نقل کرنے کے بعد امام سرخسیؒ لکھتے ہیں: ''**وفی تکراره مرة بعد مرة بیان انه ینبغی للقاضی ان یصرف العنایة الی ذلک خصوصا**'' میری عرض یہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے الفہم الفہم کے براہ راست مخاطب اگرچہ قضاۃ ہیں لیکن اسلامی اداروں کے ذمہ داروں کو بھی اس کا مخاطب سمجھا جانا مناسب ہے۔ الفہم الفہم پر توجہ نہ صرف کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ کارکن قریب ہونے کے بجائے دور ہوتے جارہے ہیں اور یہ پالیسی اور طریق کار کس حد تک قابل ستائش ہے، آپ خود فیصلہ فرمائیں۔ بہرحال ؎ رموز مملکت خویش خسرواں داند

چونکہ علوم قرآنی کے کمرے سے متعلق مذکورہ بالا صورت حال سے مجھے

تکلیف پہنچی، اس لیے بے ساختہ یہ سطریں قلم پر آگئیں، اگر ناگوار خاطر گذریں تو معاف کیا جائے.....۔

والسلام منت اللہ

مولانا منت اللہ رحمانی صاحب صرف علمی و دینی امور میں ہی مفتی صاحب سے مشورہ نہ کرتے بلکہ ملکی اور ملی امور کے نازک مسائل میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے، ۱۹۷۲ء میں پارلیامنٹ میں متبنیٰ بل پیش ہونے کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ کی تاسیس کا موقع آیا۔ مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم کو اس کا صدر بنانے کی تجویز آئی تو مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے مفتی صاحب ہی کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ قاری محمد طیب صاحب سے بات کریں۔ مفتی صاحب نے اس موقع پر حضرت مولانا منت اللہ رحمانی کی فکرمندی اور دوراندیشی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مجھے یاد ہے کہ اس واقعہ سے چند ماہ قبل حضرت امیر شریعتؒ نے ایک مکتوب میں مجھے لکھا تھا کہ مونگیر دہلی سے دور ہے، یہاں سے آواز دیر سے پہونچتی ہے اور اب مسلم پرسنل لا کے تحفظ کے لیے مضبوط آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کام کے لیے لوگوں میں فکرمندی نہیں ہے نہ ایسا کوئی ادارہ ہے جو اس ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے کے لیے آمادہ ہو۔ انھوں نے مجھ سے مشورہ طلب فرماتے ہوئے لکھا تھا کہ دارالعلوم دیوبند سب سے مستحکم علمی اور دینی ادارہ ہے، اس کے پاس اثرات اور وسائل ہیں اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اپنے علم، تقویٰ اور وقار واحترام کے لحاظ سے طبقہ علماء میں سب سے ممتاز ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے اگر حضرت مہتمم صاحب کو اس اہم

دینی خدمت کی طرف متوجہ کیا جائے؟۔

اس احقر نے حضرت کی رائے سے پورا اتفاق کیا اور حضرت مہتمم صاحب سے اس کا ذکر بھی کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ دارالعلوم پڑھنے پڑھانے کی جگہ ہے اور ہم لوگ پڑھنے پڑھانے والے ہیں، اس طرح کی تحریک اور اجتماعی خدمت کا مزاج نہیں ہے مگر جو جماعت کا فیصلہ ہوگا اس کی پابندی میرا مزاج ہے اور دارالعلوم بھی جماعت کے فیصلہ کا پابند رہے گا، میں نے حضرت امیر شریعت کو حضرت مہتمم صاحب کی رائے سے واقف کرادیا، حضرت امیر شریعت نے حضرت مولانا طیب صاحب کو تفصیل کے ساتھ خط لکھا''۔ (حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات، ص۲۵۰)

حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کو مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کی علمی شخصیت اور فقہی بصیرت پر بڑا اعتماد تھا اور اس کا اظہار وہ برملا کرتے تھے، اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ جب مسلم پرسنل لا بورڈ نے عائلی مسائل سے متعلق اسلامی قانون کو دفعہ وار مدون کرنے کا منصوبہ بنایا تو امیر شریعت نے یہ ذمہ داری مفتی صاحب کے سپرد کی اور مفتی صاحب نے بخوشی اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ امیر شریعت نے حضرت مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو خط لکھ کر مفتی صاحب کو مونگیر بھیجنے کی اجازت لی۔ مفتی صاحب یکم مارچ ۱۹۸۶ء کو مونگیر پہونچے اور ترتیب قانون اسلامی کا کام شروع کیا اور تقریباً تین چار ماہ مونگیر میں رہ کر اس کام کو انجام دیا۔ مفتی صاحب نے اس عرصہ میں حضرت امیر شریعت کی مہمان نوازی اور راحت رسانی کا تشکر آمیز تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مونگیر کا دوسرا سفر مفتی صاحب نے جنوری ۸۷ء میں کیا تھا مگر طبیعت کی خرابی کے باعث زیادہ دن قیام نہ کرسکے۔

حضرت امیر شریعت اور مفتی صاحب کے تعلقات اس حد تک گہرے

تھے کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں وہ شریک رہتے، بلکہ بعض ایسے امور پر بھی باہم گفتگو کرتے جو دوسروں سے نہ کرتے۔

۱۹۸۲ء میں جب دارالعلوم پر دوسرے گروپ کا قبضہ ہوا تو مفتی صاحب زد میں آئے، ان کا مال واسباب لوٹا گیا، یہ حادثہ ان کے لیے صبر آزما تھا، حضرت امیر شریعت برابر مفتی صاحب کے حالات سے باخبر رہے اور ان کی دلجوئی کرتے رہے ایک خط میں مورخہ ۱۷ر مئی ۱۹۸۲ء کو لکھا:

''اچھا کیا آپ نے کام شروع کردیا خدا کرے مستقبل بھی بہتر ہی رہے، آپ کا کافی سامان ضائع ہوا اس کا صدمہ ہے، مگر زندگی میں ایسے حوادث پیش آتے رہتے ہیں اور اسے انگیز کرنا ہی پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تلافی فرمائے، آمین۔'' (علمی مراسلے، ص۲۷۶)

حضرت مفتی صاحب اور حضرت امیر شریعت کے تعلقات فرد سے بڑھ کر خاندان تک محیط تھے، حضرت مفتی صاحب کے چچازاد بھائی اور استاذ مولانا عبدالرحمان صاحب کو امیر شریعت نے مولانا عبدالصمد رحمانی کے انتقال کے بعد امارت شرعیہ کا نائب امیر مقرر فرمایا تھا اور مولانا رحمانی کے بعد ۱۹۹۲ء میں وہ پانچویں امیر شریعت منتخب ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کی اہلیہ محترمہ حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ سے بیعت تھیں۔ مفتی صاحب نے اپنے صاحب زادے مولانا احمد سجاد صاحب دارالعلوم سے فراغت کے بعد سال بھر حضرت امیر شریعت کی سرپرستی اور حضرت مولانا ولی رحمانی صاحب کی تربیت میں جامعہ رحمانی مونگیر بھیج دیا تھا۔ مولانا احمد سجاد کہتے ہیں کہ:

''حضرت مولانا ولی رحمانی دامت برکاتہم نے بہت ہی مخصوص طریقہ سے مجھے مطالعہ کی عادت ڈلوائی، پہلے سیرت کا تفصیلی مطالعہ کرایا، النبی الخاتم لاکر دی، رحمۃ للعالمین اور اصح السیر

پڑھوائی، سیرت النبی کا مطالعہ کروایا۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیری اور علامہ سید سلیمان ندوی کی حیات پڑھوائی، حیات جاوید اور حیات شبلی بھی لاکر دی، تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کا بھی مطالعہ کروایا درمیان میں مطالعہ کا ماحصل بھی پوچھتے، اس لیے کتابوں کو جی لگا کر پڑھنا ضروری تھا۔ بعد میں اسلوبیات کو سمجھایا۔ سید سلیمان ندوی، مولانا مناظر احسن گیلانی، عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد سبھی کی کتابیں پڑھوائیں۔ ہنس کے فرماتے، ابوالکلام آزاد کا اسلوب کبھی مت اختیار کرنا اس کے لیے میں ابا جان (حضرت امیر شریعتؒ) سے ڈانٹ کھا چکا ہوں ان کا حکم ہوا آسان اردو لکھا کرو بالکل عام فہم''۔

مفتی صاحب کے دوسرے صاحب زادے مولانا حماد قاسمی صاحب بھی جامعہ رحمانی میں رہے اور مفتی صاحب کے تیسرے صاحب زادے ڈاکٹر ابوبکر عباد وہیں سے فارغ ہوئے اور حضرت امیر شریعت کی ان سب کو سرپرستی اور شفقت حاصل رہی، حضرت مفتی صاحب کے حوالہ سے راقم پر بھی حضرت امیر شریعت کی نظر عنایت تھی۔ یہاں صرف دو واقعات کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔ ۱۹۷۷ء میں دارالعلوم دیوبند میں راقم کا داخلہ ہوا تھا، مولانا احمد سجاد صاحب مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے، طبیہ کالج میں پڑھتے تھے اور احاطہ مسجد کے ایک کمرہ میں اکیلے رہتے تھے۔ راقم کو جو کمرہ اسی احاطہ مسجد میں ملا تھا وہ تین طلباء کے لیے تھا، مولانا احمد سجاد صاحب جب تعلیم مکمل کرکے گھر جانے لگے تو اپنا کمرہ مجھے دے دیا اور میں اس سنگل سیٹ والے روم میں آگیا۔ دارالاقامہ کے ناظم حضرت مولانا نعیم صاحب بہت کم گو اور سپاٹ تھے، معائنہ کے لیے تشریف لائے، مجھے دیکھا، کچھ پوچھا اور فرمایا: نئے طالب علم کو ایک سیٹ کا کمرہ نہیں دیا جاسکتا۔ اور مجھے اس کمرہ

سے محروم کردیا گیا۔ چند ہی دنوں بعد حضرت مولانا منت اللہ رحمانی صاحب مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے تشریف لائے، مہمان خانہ میں قیام تھا، حضرت مفتی صاحب مجھے ساتھ لے گئے، حضرت امیر شریعت سے ملوایا، میں نے اپنا ماجرا سنایا، حضرت نے ناظم صاحب کے نام ایک سفارشی رقعہ لکھا، میں رقعہ لے کر ناظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام کرکے رقعہ پیش کیا، ناظم صاحب نے میرا کمرہ دوبارہ میرے نام کردیا۔ اسی کمرہ میں مجھے مطالعہ کی یکسوئی نصیب ہوئی۔ (اللہ ان دونوں بزرگوں سے راضی ہو)۔

راقم جب علی گڑھ آیا اور یونیورسٹی سے ایم ٹی ایچ کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کرکے پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا، اسی زمانہ میں لکچرر کم ناظم کی پوسٹ مشتہر ہوئی، میں نے بزرگوں کے مشورہ سے درخواست دے دی۔ انہی ایام ۱۹۸۷ء میں حضرت امیر شریعت کا علی گڑھ آنا ہوا اور اپنی عزیزہ رؤفہ اقبال صاحبہ کے یہاں انکا قیام ہوا اس زمانہ میں وہی صدر شعبہ دینیات تھیں، راقم ابوبکر عباد صاحب کو ساتھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ صدر صاحبہ سے کلمہ خیر فرمادیں، حضرت نے ان کو آواز دی اور راقم کا خیال رکھنے کی سفارش کی۔ انھوں نے کہا کہ حضرت دعا کیجیے۔ حضرت امیر شریعت نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ حضرت امیر شریعت کی دعا کا نتیجہ ۲۳؍نومبر ۱۹۸۷ء کو ظاہر ہوا جب یونیورسٹی کی مجلس شوریٰ کی طرف سے راقم کو لکچرر کم ناظم دینیات کے عہدہ پر تقرری کا خط ملا۔ میں نے حضرت امیر شریعت کو خط لکھ کر اطلاع دی، جواب میں حضرت نے نہایت حوصلہ افزا کلمات لکھے، دعا دی اور محنت و دیانت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کی تلقین فرمائی۔

●●●

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ اور مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت

مولانا وصی احمد شمسی ☆

حضرت مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کا دوہرا جسم، اوسط قد و قامت، کھلا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، سفید اور ہلکی داڑھی، موٹے چشمے کے نیچے روشن و ذہین آنکھیں مستقبل کی تابناکی کو جھانکتی ہوئیں، دوپلّی ٹوپی، سفید کرتا، پائجامہ، کرتا نصف پنڈلی اس کے نیچے تک پاجامہ۔ اس کرتے پر کبھی کبھی شروانی بھی زیب تن، ہاتھ میں عصا پیری، مہمان نواز، نرم خو، نرم گفتار، بڑوں کا بے حد احترام کرنے والے، چھوٹوں پر حد درجہ شفیق و مہربان، ہمت و حوصلہ افزائی کرنے والے، تواضع و انکساری کا مجسّم پیکر، ذکر و اوراد کا خاص اہتمام، سادہ مزاج، سادہ دل، سادہ زبان، رہن سہن سادہ، کھان پان سادہ، سادہ تحریر کے نامور مصنف، زندگی بھر قرطاس و قلم کی رفاقت، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ لکھنؤ کے کتب خانہ کو ترتیب دینے والے ماہر لائبریرین، وقت کی قدر کرنے والے، ہزاروں صفحات لکھنے والے، علم و تحقیق کے کام کرنے والے علماء کے لیے نمونہ رہے۔ حضرت مفتی مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی صاحبؒ میرے چھوٹے ماموں، بے حد شفیق و مہربان، بچپن ہی سے حوصلہ و ہمت بڑھانے والے مخلص، مربّی و مشیر، میرے دینی، اصلاحی و تعمیری

☆ سابق ہیڈ ماسٹر واٹسن ہائی اسکول، مدھوبنی

کاموں کے سرپرست اور قدر کرنے والے تھے۔ ان جیسے لوگ کہاں ملیں گے، جو قدم قدم پر حوصلہ افزائی کرتے۔ مزید تعلیم کے لیے دیوبند جانے کا مشورہ دیتے۔

مفتی صاحب کے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمان صاحب نے ۱۹۳۰ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت کی اور پورے بہار میں فرسٹ کلاس فرسٹ آئے، انھیں گولڈ میڈل ملا، حضرت مفتی صاحب کی بڑی بہن سے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی شادی ہوئی اس وقت وہ پڑھ ہی رہے تھے، حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا نام اخبار میں چھپ گیا تھا، اس لیے مدرسہ محمودیہ راج پور ترائی نیپال میں صدر مدرس کی جگہ پر بحال کر لیے گئے، گاؤں کی تعلیم کے بعد حضرت مفتی صاحب اپنے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ مدرسہ محمودیہ راج پور نیپال چلے گئے اور انھیں کی سرپرستی میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ دو ڈھائی سال بعد حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب اپنے استاذ کے مشورہ سے مدرسہ وارث العلوم کریم چک چھپرہ میں صدر مدرس کی جگہ پر چلے آئے۔ مفتی صاحب کو بھی اپنے ساتھ وارث العلوم چھپرہ لیتے آئے، اسی مدرسہ سے حضرت مفتی ظفیر الدین صاحبؒ ۱۹۳۸ء میں مدرسہ اسلامی شمس الہدیٰ پٹنہ کے تحت فوقانیہ اور مولوی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اُس زمانے میں پورے بہار کا مرکز امتحان پٹنہ ہی ہوا کرتا تھا۔ ہمارے بڑے بھائی علی احمد مرحوم (والد جناب عبدالباری صدیقی اپوزیشن لیڈر بہار اسمبلی پٹنہ) اس وقت مفتی صاحب ہی کے ساتھ مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں پڑھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ مفتی صاحب شروع ہی سے لکھنے پڑھنے میں محنت کرتے تھے، عصر بعد ہم لوگ تفریح میں چلے جاتے اور حضرت مفتی صاحب کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ نامور مصنف ہیں۔

مفتی صاحب اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے تھے، وہ ذہین و فطین

ہونے کے ساتھ محنتی بھی تھے، حالاں کہ اس وقت کے سبھی لڑکے تیز و ذہین تھے۔ حضرت مولانا عبدالرحمان صاحب کی نگرانی اور خاص توجہ کا ہی فیض ہے کہ حضرت مفتی صاحب مستقبل میں علمی دنیا کے نامور عالم ومصنف بنے۔

شہر چھپرہ میں مسلم لیگ کا زور تھا، مولانا عبدالرحمٰن صاحب جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے جنگ آزادی کی تحریک میں سرگرم تھے، ایک موقع پر مولانا سجاد رحمۃ اللہ کی تحریک پر چھپرہ میں جمعیۃ کانفرنس کا اعلان ہوا، مسلم لیگ والے سخت مخالف تھے مگر مفتی ظفیر الدین صاحب نے اپنی جوانی کی شعلہ بیانی سے لوگوں میں جادو جگادیا اور کانفرنس کامیاب ہوئی، مفتی ظفیر الدین صاحب حضرت مولانا عبداللطیف نعمانی محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کے مشورہ کے بعد انھیں کے مدرسہ مفتاح العلوم مئو یوپی چلے گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔

آپ کے اساتذہ میں آپ کے چچازاد بھائی اور مربّی وگارجین حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب تھے جو حضرت مولانا ریاض احمد چمپارنی حضرت مولانا بشارت کریم صاحب اور حضرت شاہ نعمت اللہ عرف میاں رحمۃ اللہ علیہ، تھاوے اندرواں گوپال گنج کے صحبت وتربیت یافتہ تھے، خود مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے میں نے حضرت مولانا کی جماعت چھوٹتے کبھی نہیں دیکھی، وہ جتنے بڑے عالم اور فقیہ تھے اسی درجہ کے بزرگ، متقی و پرہیز گار بھی تھے، یہی وجہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی شخصیت میں اپنے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا رنگ غالب تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے مشہور ومعروف اساتذہ میں آپ کے شفیق و مربی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس بہار واڑیسہ جھارکھنڈ کے علاوہ مجاہد ملت مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (مئو)، ندوہ لکھنؤ کے اساتذہ میں حضرت مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ، مولانا اسحاق سندیلویؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا حمیدالدین صاحبؒ اور حضرت مولانا سید

سلیمان ندویؒ وغیرہ ہیں۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنی تعلیم و تربیت اور نگرانی کے لیے اپنے چچازاد بھائی مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے خط و کتابت سے رابطہ قائم رکھا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی اسی شفقت ومحبت کا اثر رہا کہ جب بھی حضرت امیر شریعت اپنے گاؤں آتے اور مفتی صاحب گھر موجود رہتے تو فوراً چائے ناشتہ کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ایک دوسرے سے محبت و احترام کا سلوک کرتے ہمیشہ مفتی صاحب اکرام و احترام میں پیش قدمی کرتے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے حکم سے مسجد میں امامت آپ ہی کرتے۔

دیوبند میں انقلاب آیا تو ان کے علمی اثاثے کے ساتھ دیگر سامان بھی برباد ہوگئے کچھ سامان تو واپس بھی مل گئے مگر ان کی آپ بیتی کا مسودہ نہیں ملا، جس کا صدمہ انھیں مرتے دم تک رہا، انقلاب کے بعد بالکل ٹوٹ سے گئے تھے، فرماتے ہماری آپ بیتی کوئی اپنے نام سے بھی چھاپ دیتا اس موقعہ پر اپنے مربی مولانا عبدالرحمان صاحب سے مشورہ کیا کہ دیوبند جائیں یا دیوبند کے بجائے امارت شرعیہ میں رہیں۔ حضرت مولانا نے مشورہ دیا کہ دیوبند جائیں اور مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا منت اللہ رحمانی صاحب امیر شریعت رابع سے بھی مشورہ کرلیں کہ یہ دونوں مجلس شوریٰ کے اہم رکن ہیں۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب اپنے خاندان میں سب سے بڑے اور خاندان کے گارجین تھے، ہمارے گھر کے بھی یہی دونوں بھائی گارجین وسرپرست رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں آدمیوں سے رشتہ داری و برادری پرانی ہے اور دونوں بزرگوں کی صاحب زادیوں کی شادی ہمارے گھر میں ہے۔ مفتی صاحب کی بڑی صاحب زادی بی بی حسنیٰ صدیقہ ہمارے بڑے بھائے الحاج سعید احمد صاحب کے نکاح میں ہے اور حضرت امیر شریعت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی چھوٹی

صاحبزادی بشریٰ صالحہ میری زوجیت میں ہے۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے کا بے حد احترام و اکرام کرتے، خاندانی مسائل شادی بیاہ میں مشورہ کرتے، ایک مرتبہ میں نے مسلم فنڈ ٹرسٹ اور انجمن تعمیر ملت رجسٹرڈ کے صدر کے لیے حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے گذارش کی تو انھوں نے اپنے خط میں لکھا کہ مفتی ظفیر صاحب دیوبند سے آرہے ہیں اللہ نے انھیں شہرت اور ناموری سے نوازا ہے انھیں کو صدر بناؤ مجھ جیسے گم نام کو چھوڑو۔

حضرت مفتی صاحب جب بھی دیوبند سے آتے یا گھر سے دیوبند جاتے تو مدرسہ حمیدیہ گودنا جاکر حضرت سے ملاقات کرتے بیماری کی حالت میں خبر گیری کرتے۔ آخر تک اس تعلق کو نبھایا۔

حضرت مفتی صاحب ہماری تعلیمی اصلاحی تحریک اور اسکول و مکاتب مسلم فنڈ لائبریری دیکھ کر ہمت افزائی کرتے اور خوشی کا اظہار کرتے۔ مشوروں سے رہنمائی کرتے، ہمدردی کا اظہار کرتے۔

حضرت مفتی صاحب کی نماز جنازہ جناب پروفیسر مولانا سعود عالم قاسمی سابق صدر شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے پڑھائی، نماز جنازہ میں سینکڑوں علماء و دانش ور حضرات شریک ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب مدرسہ شمس العلوم پورہ کے احاطہ میں سپرد خاک ہوئے، اللہ ان کی مغفرت کرے۔

●●●

مکاتیب مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ
بنام مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے پانچویں امیر تھے۔ ان کے دادا کا نام محمد بقاء الدین تھا جن کے پانچ لڑکے تھے، دوسرے لڑکے کا نام منشی بشارت علی تھا جو حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے والد محترم تھے، پانچویں اور سب سے چھوٹے لڑکے کا نام محمد شمس الدین تھا جو حضرت مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کے والد ماجد تھے، اس طرح مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ اور مفتی محمد ظفیر الدین صاحب چچازاد بھائی تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ مفتی صاحب سے عمر میں ۲۳ سال بڑے تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ ۱۷/اپریل ۱۹۰۳ء کو اپنے گاؤں پورہ میں پیدا ہوئے، نانیہال موضع اسراہا دربھنگہ تھا، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، کچھ دنوں تک مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ دربھنگہ میں پڑھا، اس کے بعد مدرسہ حمیدیہ گودنا چھپرہ تشریف لے گئے جہاں حضرت مولانا ریاض احمد چمپارنیؒ سابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اخیر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ تشریف لے گئے، وہاں مفتی سہول صاحب بھاگلپوری، مولانا عبدالشکور آہ مظفرپوری تلامذہ شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا ظفرالدین بہاری م ۱۹۶۲ء، تلمیذ مولانا احمد رضا

خانصاحب فاضل بریلوی، والد پروفیسر مختارالدین احمد آرزو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا دیانت حسین دربھنگوی م ۱۹۴۷ء ، مولانا اصغر حسین بہاری م ۱۹۴۸ء، مولانا عبیداللہ امجھری سے تعلیم حاصل کی اور ۱۹۲۸ء میں فاضل کا امتحان پورے بہار میں اول نمبر سے پاس کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کی پہلی شادی مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کی بڑی ہمشیرہ سے تھی، وہ لاولد تھیں، ان کے انتقال کے بعد موضع سریّا شادی ہوئی اس گھر سے ایک لڑکا دولڑکیاں ہیں۔

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے انتقال کے بعد امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی نے ۱۹۷۳ء میں آپ کو نائب امیر شریعت نامزد کیا، پھر حضرت امیر شریعت کے وصال کے بعد ۳۱/ مارچ ۱۹۹۱ء میں آپ امیر شریعت خامس منتخب ہوئے۔

طالب علمی کے زمانہ میں ۱۹۲۶ء میں اپنے استاذ حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کے مرشد حضرت نعمت اللہ شاہ عرف میاں صاحب اندروا عباداللہ ضلع گوپال گنج سے بیعت ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں ان کے وصال کے بعد استاذ وشاگرد دونوں حضرت مولانا بشارت کریم گڑھولوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں حضرت گڑھولوی کا وصال ہوا تو اپنے استاذ اور پیر بھائی حضرت مولانا ریاض احمد صاحب سے بیعت ہوئے اور انھیں سے خلافت ملی۔

ابتدا میں رمضان المبارک گڑھول شریف میں گذارتے تھے، بعد میں بتیا ضلع چمپارن میں رمضان گذارنے کا معمول تھا، اخیر رمضان علالت کی وجہ سے اپنے گاؤں پورہ میں گذارا، جماعت کے ایسے پابند تھے کہ شاید تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہ ہوئی ہو، تہجد، اشراق، چاشت کا بڑا اہتمام فرماتے، ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک مدرسہ اسلامیہ راجپور ترائی نیپال میں صدر مدرس رہے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۰ء تک مدرسہ

وارث العلوم چھپرہ میں، ۱۹۴۰ء سے اخیر عمر تک مدرسہ حمیدیہ گودنا چھپرہ میں صدر مدرس اور مہتمم رہے۔ ۲۹/ستمبر ۱۹۹۸ء کو ۹۵ سال ۶ چھ ماہ کی عمر گذار کر اللہ کو پیارے ہوئے اور مدرسہ حمیدیہ گودنا چھپرہ کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔

تعلیم الاسلام سے لے کر شرح وقایہ تک مفتی صاحب نے اکثر کتابیں مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے پڑھیں۔ مفتی صاحب نے مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے تعلیم حاصل کرنے کا تذکرہ اپنی خودنوشت سوانح ''زندگی کا علمی سفر میں'' کیا ہے۔ مفتی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہمارے چچازاد بھائی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب اس وقت عربی مدرسہ میں پڑھ رہے تھے، جن کی شادی میری بڑی بہن سے تھی .....فراغت کے بعد مولانا مدرسہ محمودیہ راج پور نیپال میں صدر مدرس کے لیے بلائے گئے، جب مولانا وہاں جم گئے تو کچھ دنوں کے بعد اپنے چندعزیزوں کو مدرسہ ساتھ لے گئے۔ ان میں ایک یہ خاکسار بھی تھا، اس وقت پارہ عم کی سورہ والنازعات مکتب میں پڑھ رہا تھا .... میں اس درجہ قرآن سے نکل کر عربی درجہ کی طرف آ گیا جہاں اردو فارسی اور عربی کے اسباق ہوتے تھے۔ یہ درجہ مولانا کے ذمہ تھا اس لیے اردو قاعدہ اور اردو کی پہلی میں نے مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ کے پاس پڑھی ..... ۱۹۳۲ء کو مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ نیپال سے چھپرہ شہر کے مدرسہ وارث العلوم میں بحیثیت صدر مدرس آ گئے جو اس وقت محلّہ کریم چک میں واقع تھا۔ اس طرح ہم لوگوں کو بھی وہاں مدرسہ محمودیہ کا قیام ترک کرنا پڑا۔ گھر آ گئے اور کچھ دنوں کے بعد مدرسہ محمودیہ راج پور کے بجائے چھپرہ مدرسہ وارث العلوم جانا پڑا''۔

(زندگی کا علمی سفر، ص ۲۲، ۲۴)

مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ مفتی صاحب کے معلم و مربی، محسن اور مشفق تھے۔ مفتی صاحب نے ان کی شخصیت اور سیرت کے بارے میں لکھا ہے:

''میرے مربی حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب موجودہ امیر شریعت علم و عمل دونوں میں ممتاز ہیں، آپ کے اساتذہ فرماتے تھے کہ عبدالرحمٰن طالب علمی سے نیک اور تہجد گذار ہے، میرا بچپن اور جوانی کا بڑا حصہ ان کی خدمت میں گذرا، مجھے یاد نہیں ہے کہ اس عرصہ میں کبھی بھی ان کی جماعت کی نماز یا تکبیر اولیٰ چھوٹی ہو، اور اسی کے ساتھ یہ بھی برابر معمول رہا کہ فجر کی جماعت کے بعد مسجد میں مراقب رہتے تھے اور آفتاب بلند ہونے کے بعد اشراق پڑھ کر نکلتے۔

اس لیے خاکسار کی تربیت بھی ایسی ہوئی، باجماعت پنج وقتہ نماز مسجد میں ادا کرنا اور موٹا لباس، کرتا، پائجامہ، دوپلی ٹوپی استعمال کرنا، بلکہ سنن ونوافل پابندی سے ادا کرنا معمول رہا، اس میں ذرا بھی سستی اور غفلت ہوئی فوراً تنبیہ ہوئی، حضرت مولانا برابر نظر رکھتے تھے اور ٹوکتے رہتے تھے، اس سلسلہ میں آپ کے یہاں کوئی رعایت نہیں دیکھنے میں آئی۔'' (زندگی کا علمی سفر، ص ۱۶۸)

طالب علمی کے ایام کے بعد بھی مفتی صاحب نے مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے شاگردی اور نیاز مندی کا تعلق برابر قائم رکھا، کوئی گھریلو معاملہ ہو یا علمی و دینی مسئلہ، ذاتی پریشانی ہو یا سماجی الجھن، مفتی صاحب مراسلات کے ذریعہ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کو آگاہ کرتے، ان سے مشورہ لیتے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ جوابی خط کے ذریعہ ان کو دینی و دنیوی مصالح سے آگاہ کرتے اور نیک

مشوروں سے نوازتے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے بہت سے خطوط مفتی محمد ظفیر الدین صاحب کے نام ہیں جو مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے مولانا احمد سجاد قاسمی صاحب کے پاس ہیں۔ ان خطوط میں نجی اور خاندانی مسائل کے علاوہ علمی و دینی مسائل بھی مذکور ہیں۔ بعض نجی خطوط تو خود مفتی صاحب نے ''زندگی کا علمی سفر'' میں شائع کر دیے ہیں، مگر مفتی صاحب کے نام مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلات کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے خطوط شامل نہیں ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ کے بعض خطوط جن میں قارئین کے لیے دینی و علمی دلچسپی کا سامان ہے، شائع کر دیا جائے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ استاذ اور شاگرد میں کتنی محبت اور اپنائیت تھی۔ شاگرد استاذ کا کتنا اکرام کرتے تھے اور استاذ شاگرد سے کتنی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے، بلکہ ہر مشکل وقت میں حوصلہ افزائی کرتے تھے اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے تھے، ان کو تسلی دیتے تھے اور صبر و شکر کے ساتھ قدم جمانے کی نصیحت کرتے تھے۔

ایک مکتوب بنام مفتی صاحب مورخہ ۲۱ ربیع الآخر ۱۳۶۷ھ میں لکھا:

''عزیز المحترم! صانک اللہ عن کل غائلۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کے خطوط ملتے رہے، کچھ غفلت، کچھ لیت ولعل میں بروقت جواب نہ دے سکا، سمستی پور کے اجلاس کی شرکت کی توقع بھی مزید تاخیر کا باعث ہوئی، جب مدرسہ معینیہ میں قیام اختیار کرلیا تو اسی میں اللہ کے فضل سے خیر کی توقع رکھنا چاہیے۔ انتشار فضول ہے، دنیا مختلف آویزشوں ہی کا نام ہے، دنیا میں سکون وچین کہاں؟

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۳-۳-۴۸ء''

مدرسہ معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کے قیام کے زمانہ میں مفتی ظفیر صاحب مفید کتابوں کی تصنیف کا منصوبہ بنا رہے تھے، ان میں نماز تہجد، اسلام کا نظام مساجد اور تاریخ مساجد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کا منصوبہ انھوں نے حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کے مشورہ سے بنایا تھا، ان کتابوں کو لکھنے کے لیے ان کو مواد اور ماخذ کی ضرورت تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے جن اساتذہ سے رجوع کیا ان میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب بھی تھے۔ چنانچہ مفتی صاحب کے ایک مکتوب کے جواب میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا:

''عزیزی المحترم: زادکم اللہ علما وفضلاً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا جوابی کارڈ ملا، قدرے تاخیر سے جواب دے رہا ہوں، قیام لیل پر مستقل رسالہ میرے علم میں تو نہیں ہے، بسیط بحث امام غزالی رحمۃ اللہ کی احیاء العلوم میں ملے گی، ذخیرہ حدیث بھی کافی ملیں گے''۔

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۲۱-۶-۴۸ء

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''عزیزی زادک اللہ علما وفضلا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، عرصہ پر آپ کا کارڈ ملا، میں کئی ہفتہ پر بتیا سے آیا۔ گھر کی کوئی خیر معلوم نہ تھی، آپ کی تحریر سے اجمالی حالت معلوم ہوگئی۔ بتیا اواخر جنوری میں اچھی بارش ہوئی تھی اور یہاں کل پرسوں ہلکی بارش ہوئی جو بہت حد تک فصل ربیع کے لیے مفید ہی ہوئی۔ ہم لوگوں کے اعمال بد کا ثمرہ ہے کہ قحط کا پیش خیمہ بن رہا ہے۔ اللہ رحم فرمائیں۔ میں انشاء اللہ سعی کروں گا کہ اسی

یک شنبہ کو سید صاحب سے ملوں اور تاریخ مساجد کا تذکرہ بھی کروں گا۔ خدا آپ کو اپنے نیک مقصد میں کامیاب فرمائیں۔''

عبدالرحمٰن عفی عنہ

شب ۸-۲-۵۱ء

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب نے سانحہ کے مدرسہ میں تدریس کے علاوہ عام لوگوں کی دینی تربیت کے لیے درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ درس ہفتہ میں دوبار ہوتا تھا اور اس میں عوام وخواص کی شرکت ہوتی تھی، مفتی صاحب نے اس سلسلہ میں رہنمائی کے لیے ایک خط مولانا عبدالرحمٰن صاحب کو لکھا، مولانا نے جواب میں ۱۹؍رجب ۱۳۶۷ء کو حسب ذیل مکتوب ارسال فرمایا:

عزیزی المحترم! صانک اللہ عن کل غائلۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بخیر رہ کر خواہان خیر ہوں۔ کل آپ کا جوابی کارڈ ملا، اب خط وکتابت ومراسلت میں بھی ضعف آ گیا، گھر سے آنے کے بعد سے اب تک خط نہ لکھ سکا۔ دل کو چین واطمینان نصیب نہیں۔ عرصہ سے دل بے چین ہے کہ کوئی ایسی جگہ ملتی جہاں دین دار لوگوں کی بستی ہوتی اور ایسے لوگوں کے سایہ میں دل کو کسی طرح کا سکون ہوتا۔ مگر افسوس یہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ نہ معلوم واقعی دنیا ظلمت وسیئت جاہلیہ میں گھر گئی یا ہمارے اعمال بد کی ظلمت قلب کی گہرائی سے پھوٹ کر دنیا کو تاریک کر رہی ہے۔ بہر حال اس پرفتن دور میں علم دین کی اشاعت خاص کر بالغوں میں اشد ضروری ہوگئی ہے اور علماء کرام ہر جگہ شبانہ حلقہ درس جاری کر رہے ہیں۔ ''دین سیکھو سکھاؤ'' بھی اسی کا ایک مجرب طریقہ ہے۔ اگر لوگوں میں ذوق ہو تو ہفتہ میں ایک بار مزید حلقہ

درس بخاری بھی جاری کردو، یا درس قرآن کے دو روز کی جگہ ایک روز درس حدیث ہی رہے۔ اپنے لیے مطالعہ میں سب تفسیریں رہیں مگر عوام کے لیے مختصر حاشیہ حمائل شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح ملخص زیادہ مناسب ہوگا۔ اس طرح جلد ختم بھی ہوجائے گا اور عوام کا ذہن مختصر مضمون کو اخذ بھی کرلے گا۔ یہاں کی بنجر وکھوسٹ زمین میں ''دین سیکھو سکھاؤ'' کی تحریک ہفتہ وار شروع ہے اور تعلیمی گھنٹہ میں مختصر حدیث شریف اور کچھ فقہی مسائل کی تعلیم جاری کی گئی ہے۔ دست بہ دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کو اپنے پیارے نبیؐ کی سنت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور انہی کے طریقہ پر موت دیں اور انہی کے سایہ میں محشور فرمائیں۔ والسلام

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۱۹؍رجب، ۱۳۶۷ء

مدرسہ معینیہ سانحہ مونگیر سے جب مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند چلے گئے تو وہاں بھی مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے مراسلت کے ذریعہ برابر ربط قائم رکھا اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے بھی ہمیشہ ان کی خبرگیری اور رہنمائی کی۔ ۴؍ربیع الاول ۱۳۷۶ھ کو ایک مکتوب مولانا نے مفتی ظفیر صاحب کے نام اس طرح لکھا:

''عزیزی الفاضل البرالتقی صانک اللہ عن کل غائلۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا کارڈ ملا، مدرسہ کے ضروری مشاغل کی وجہ سے جواب میں کچھ تاخیر ہوئی، خدا کرے آپ اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔ آپ کا خیال صحیح ہے کہ مکتوبات امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ میں عقائد اہل سنت والجماعت کے سلسلہ میں پوری وضاحت ہے۔ مکتوبات جلد سوم مکتوب نمبر ۱۷ و

نمبر ۲۶ پڑھیے اور اس کے ساتھ مکتوب نمبر ۲۳، ۲۴، ۴۱، ۶۶، ۶۸ کے مطالعہ سے ترتیب وطریق استدلال پر بھی پوری روشنی سامنے آجائے گی۔ مکتوبات کی فہرست بھی ہر جلد کی دیکھ جایئے۔

حضرت شیخ مدفیوضہم کی صحبت کو غنیمت سمجھئے اور صحبت کی پابندی رکھیے۔ سوانح قاسمی بغور مطالعہ کریں گے۔ سوانح قاسمی ہر دو جلد جس کتب خانہ میں ہو اس کے منیجر کو میرا پتہ لکھا کر میرے نام وی پی بھیج دینے کی تاکید کردیجیے۔ اس کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے دستور وضوابط کی ایک کاپی اگر مل جائے بھیج دیجیے۔ حضرت شیخ الاسلام مدفیوضہم کی خدمت بابرکت میں سلام مسنون بصد اکرام عرض کردیجیے اور دعا کی درخواست۔ گو خدا کے فضل سے بہت زیادہ زیارت کا موقع ملا ہے، لیکن حضرت شیخ مجھ سے واقف نہ ہوں گے۔ ان دنوں مدرسہ کے خلاف رضاخانی فرقہ کا ہنگامہ رہ رہ کر اٹھتا رہتا ہے، فتنہ رضاخانیہ کے خلاف میں جو کتابیں وہاں موجود ہوں ان کی فہرست مع قیمت لکھیے تاکہ حسب موقع ان کتابوں کو منگالوں.....۔

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۱۱؍اکتوبر ۵۶ء

از مدرسہ حمیدیہ گودنا، ضلع سارن''

ایک اور مکتوب مؤرخہ ۶؍ربیع الآخر ۷۶ھ میں مفتی صاحب کو دینی اور عملی تربیت کے سلسلہ میں حسب ذیل نصیحت فرمائی:

''مجمع السعادات والمفاخر عزیز مولانا ظفیر الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ابھی صبح کی گاڑی سے جب مدرسہ

پلٹا آپ کا کارڈ ملا۔.....اپنے کاموں کی سعی کرنی چاہیے۔ثمرات ونتائج مسبب الاسباب ہی کے سپرد کرنا چاہیے، بندہ کا کام صرف سعی اور صحیح سعی ہے،ثمرات مسبب الاسباب کے ہاتھ۔سعی کے بعد پریشانی کیسی؟ میرا کام تو بقدر وسعت ارتکاب اسباب ہے، ثمرات دینے والے مولیٰ کی حکمت جو متقاضی ہو۔ میرا فریضہ تو اس پر صرف اپنی رضا کو اتار لینا ہے۔ہم ظاہر بیں ظاہر ہی کو کیوں اصل سمجھ لیں۔ عالم سرائر وعلام غیوب جلّ مجدہٗ نے "**عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیرٌ لکم**" میں اسی ذہنی اضطراب ودماغی کوفت کا کتنا شفا بخش نسخہ عطا فرمایا،**فالحمد للہ علی احسانہ حمدا کثیرا کثیرا**۔

سوانح قاسمی دوجلدیں آگئیں اور الحمد للہ چند روز ہوئے دونوں جلدوں کے مطالعہ سے شرف یاب ہو چکا، اب پھولن بابو کے زیر مطالعہ ہے۔ دوسرے احباب کی بھی فرمائش ہے۔حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے مطالعہ کو بھی جی بے چین ہے فی الحال وہاں کون کون سی کتابیں مل سکتی ہیں تحریر فرمایئے۔

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۱۱/نومبر ۵۶ء"

مولانا عبدالرحمٰن صاحب مفتی صاحب کو دیوبند جانے کے بعد علمی اور روحانی ترقی کے لیے ضروری مشورے اور نصائح سے نوازتے رہے، خاص طور سے مولانا حسین احمد مدنیؒ سے علمی و دینی استفادہ کرنے پر زیادہ زور دیتے اور ان کی صحبت کو غنیمت شمار کرنے کی تلقین کرتے۔ ۲۲/محرم الحرام ۷۷ھ کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

عزیز محترم مولانا ظفیر الدین سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کے دیوبند جانے کے بعد آپ کے حسب تحریر ۸/محرم کو میں گھر گیا تھا اور ۱۴/کو واپس آیا، واپسی کے وقت حسنیٰ سلمہا (صاحب زادی مفتی صاحب) نے باصرار کہا تھا کہ آپ کو لکھوں کہ اپنی خیریت سے جلد مطلع کریں اور غالباً اخراجات کے لیے کچھ مطالبہ کیا تھا، میں یہاں پہونچ کر ضروری مشاغل میں ایسا کھو گیا کہ آج یاد آیا اور آپ کو لکھ رہا ہوں، بہرحال ہر ہفتہ اپنی حالت گھر لکھا کریں۔

قیام دیوبند کی بہت بڑی نعمت صحبت حضرت شیخ مدظلہ العالی سمجھیں، اس میں حتی الوسع کوتاہی وغفلت کو راہ نہ دیں، بخاری شریف کے شب کے اسباق میں شرکت کی بھی پابندی رکھیں اس کے علاوہ بھی جو موقع ملے۔حضرت کی صحبت بابرکت ملکہ کبریت احمر سے استفادہ کریں، اس موقع کو غنیمت سمجھیں۔ وقت گذر جانے کے بعد عموماً لوگوں کو کسی چیز کی قدر معلوم ہوتی ہے اور حسرت کرتے ہیں۔مگر اس سے کیا حاصل؟ اس بابرکت صحبت کی برسوں تمنائیں کیں، آرزوئیں دل میں گانٹھیں، ایک سال یہ برسوں کی تمنائیں قریب الحصول ہوتے ہوتے رہ گئیں۔لیکن قسمت میں شاید یہ نہ تھا اور نہ ہوا اور نہ اب بظاہر کوئی امید۔ اگر موقع ملے میرا بہت ادب کے ساتھ سلام مسنون عرض کردو اور بہت الحاح کے ساتھ فلاح دارین واستقامت کی دعا فرمانے کی درخواست۔

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۲۰/اگست ۱۹۵۷ء"

ایک مکتوب میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے مفتی ظفیر الدین صاحب کو

گھریلو مسائل اور حالات میں جس طرح تقویٰ وطہارت اور تعلق باللہ کی تلقین کی ہے وہ قابل تقلید ہے۔ یکم ربیع الآخر ۷۷ھ بروز جمعہ کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

مجمع الفضائل عزیز مولوی ظفیر الدین سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا کارڈ پرسوں ملا، گھر سے بھی خط حسنیٰ سلمہا کے نام کا لکھا ہوا آیا تھا، وہاں بھی اللہ کے فضل سے موجب شکر باری تعالیٰ احوال ہیں۔ ہاں آپ کی خیریت مجھ سے دریافت کی گئی ہے، انشاء اللہ گھر بھی جواب لکھوں گا۔ اضطراب و پریشانی فضول ہے، مکان کا مسئلہ قابل غور ضرور رہنا چاہیے۔ لیکن قلق واضطراب کی بونہ آنی چاہیے۔ میں نے تقریباً ۲۵ تیس برس کے لیت ولعل کے بعد موجودہ مکان بنایا۔ ''کل امر مرھون باوقاتہ'' مشہور بات ہے، اس کے لیے پریشانی کیسی؟ ع پھٹے کپڑے میں خنداں مثل گل ہوں۔ جیب قلب میں حوصلہ بلند و وسعت رکھنی چاہیے۔ باطن پر ہمہ دم نظر کیمیا اثر سے غفلت نہ ہونی چاہیے۔ یہی مرد کا کام ہے، وہاں اسباب کا ارتکاب ہم ضعیفوں کا شیوہ ہے یہ ہونا چاہیے لیکن مسبب الاسباب کا خیال ایک لمحہ کے لیے الگ نہ ہونے پائے۔ بہرحال زمین سے زمین کا تبادلہ یا کسی مناسب جگہ کا نظم گوگراں قیمت پر ہو ترجیح دینی چاہیے۔

عبدالرحمٰن عفی عنہ

۲۵-۱۰-۵۷ء

مذکورہ مکاتیب کے علاوہ بھی کچھ اور مکاتیب ہیں جو شخصی اور خانگی نوعیت کے ہیں، اگرچہ ان میں بھی سماجی اور دینی مصالح کی طرف اشارات ہیں، مگر عام لوگوں کے لیے شاید وہ مفید مطلب نہ ہوں اس لیے ان کو ترک کیا جاتا ہے۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کی خردنوازی

عبدالباری صدیقی ☆

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی رحمۃ اللہ علیہ سے میرا خاندانی رشتہ ہے۔ اور وہ اس طرح ہے کہ میری دادی مرحومہ امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن نوراللہ مرقدہ کی اپنی سگی بہن اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی خاص چچا زاد ہمشیرہ تھیں۔ اسی طرح میری والدہ محترمہ ان بزرگوں کی خاص بھتیجی ہیں، پھر میری ایک چچی حضرت مفتی صاحب کی بڑی صاحب زادی اور دوسری چچی حضرت امیر شریعت خامس کی چھوٹی صاحب زادی ہیں، اس طرح میرے والد صاحب علیہ الرحمہ کا ننہال، میرا ننہال اور میرے دو چچا کی اولاد کا ننہال اسی خانوادہ میں ہے، اسی گہرے رشتہ کا اثر رہا کہ میرے ابا جان علی احمد مرحوم اور میرے تمام چچا کی تعلیم وتربیت کا معاملہ بھی اپنے ماموں مولانا عبدالرحمٰن نوراللہ مرقدہ سے جڑا رہا، اور میرے چچازاد بھائیوں کی تعلیم وتربیت اپنے نانا حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب کی نگرانی میں ہوئی۔ والد مرحوم اور سبھی چچا محترم کی طرح میرا اور میرے تمام چچازاد بھائیوں کا ہمیشہ اپنے ننہال (پورہ) آنا جانا لگا رہتا ہے، اور میرے سبھی نانا اور ماموں حضرات کا میرے گاؤں روپس پور ہمیشہ آنا جانا رہا۔

میرے ابا جان اور حضرت مفتی صاحب نانا میں اگرچہ عمر کا فرق تھا لیکن

☆ سابق وزیر کابینہ بہار، موجودہ لیڈر حزب اختلاف بہار اسمبلی

دونوں حضرات نے بڑے نانا مولانا عبدالرحمٰن کی خدمت میں رہ کر مدرسہ وارث العلوم چھپرہ اور مدرسہ حمیدیہ گودنا چھپرہ میں طالب علمی کے ایام ساتھ گذارے۔ اس لیے بھی دونوں حضرات میں قلبی رشتہ تھا، جسے آخری وقت تک ان بزرگوں نے بڑی خوبصورتی سے نباہا۔ حضرت مولانا مفتی ظفیر صاحب نانا جب بھی پٹنہ آتے تو امارت شرعیہ پھلواری شریف میں قیام ہوتا، وہ امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے۔ ان سے ملنے کے لیے ابا جان علی احمد مرحوم ضرور پہونچ جاتے، میں بھی حاضر ہوتا اور نانا بھی ہمارے گھر بہت شوق سے تشریف لاتے، دونوں بزرگ ایک دوسرے سے والہانہ محبت رکھتے اور غائبانہ میں ایک دوسرے کی بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کا میرے ساتھ ہمیشہ مشفقانہ برتاؤ ہوتا اور میری سیاسی زندگی سے مطمئن اور خوش رہا کرتے تھے، میں جب بھی الیکشن لڑتا میرے لیے دعا فرماتے اور میری تائید میں اپنی طرف سے اپیل لکھ کر میرے حلقہ میں روانہ فرماتے، جس سے خاطر خواہ فائدہ ہوتا تھا، میں جب بھی بہار میں وزیر کابینہ رہا ہمیشہ اپنے نیک مشوروں سے نوازتے رہے، میرے کاموں سے اور میری نیک نامی سے بہت خوش ہوتے، دعائیں دیتے اور اپنی خاص مجلسوں میں اچھے لفظوں میں میرا تذکرہ فرماتے۔ بلاشبہ مفتی صاحب اعلیٰ ظرف، بلند نظر اور خردنواز بزرگ تھے۔

میں اپنی زندگی کا ایک واقعہ پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ حضرت مفتی صاحب عام لوگوں کی غیر ذمہ دارانہ باتوں کو سن کر نہیں بلکہ معاملہ کی تہہ تک پہونچ کر تحقیق کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کرتے تھے جو بہت ٹھوس اور مضبوط ہوتی تھی اور یہ کہ خاندان کے بزرگ کا رول کیا ہوتا ہے! اس کا اندازہ بھی اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہوا یہ کہ میری شادی سے ابا جان خفا ہوگئے کیوں کہ میں نے ایک غیر مسلم گھرانے میں شادی کرلی، چنانچہ مجھے اپنے گھر سے باہر رہنا پڑا، اس وقت آنجہانی

کرپوری ٹھاکر حزب اختلاف کے لیڈر تھے اور میں ان کا سکریٹری تھا۔ انھیں کے بنگلے کے ایک حصہ میں فیملی کے ساتھ میں رہنے لگا، اتفاق سے اس سال جب حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب نانا پٹنہ آئے اور ابا سے ملاقات کے دوران تمام صورت حال سے آگاہ ہوئے۔ تو سب سے پہلے مدرسہ شمس الہدیٰ گئے جہاں نوری مسجد میں میرا نکاح ہوا تھا، وہاں کے علماء اور اساتذہ کرام سے میرے رشتہ کے بارے میں معلوم کیا۔ جب تحقیق ہوگئی کہ میری شریک حیات نے اسلام قبول کرکے شادی کی درخواست کی ہے اور پھر شرعی نکاح ہوا ہے تو مفتی صاحب پوری طرح مطمئن اور خوش ہوئے۔ مفتی صدر عالم صاحب قاسمی سابق مفتی امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ، استاذ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کو ہمراہ لے کر آنجہانی کرپوری ٹھاکر کے بنگلہ پر تشریف لے گئے، ٹھاکر جی ان حضرات سے مل کر بہت خوش ہوئے اور بہت ہی عزت و احترام کا معاملہ فرمایا اس وقت میں وہاں موجود نہیں تھا، میری اہلیہ کو ٹھاکر جی نے ان حضرات سے ملوایا، میری اہلیہ تعلیم یافتہ ہیں، انھوں نے مذہب اسلام کی حقانیت کی شہادت دی اور اپنے ایمان کی پختگی کا اظہار کیا جس کے لیے انھیں اپنے والدین اور پورے خاندان والوں کا معتوب ہونا پڑا تھا، نانا جان نے بہت دعائیں دیں اور پھر میرے ابا جان سے ہم لوگوں کی سفارش ان الفاظ میں کی کہ عبدالباری نے بہت بڑے ثواب کا کام کیا ہے اس سے خفا نہیں خوش ہونا چاہیے اور ان کے وہم اور وسوسہ کو دور کیا، پھر ہم لوگ خوشی خوشی اپنے گھر میں رہنے لگے۔ میرے ابا جان اور خاندان کے لوگوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی، حضرت مفتی صاحب نانا خاندان کی نزاکت اور رشتے ناطے کی باریکیوں سے واقف تھے اس لیے وہ معاملہ کی تہ تک پہونچے۔

حضرت مفتی صاحب نانا مجاہد آزادی بھی تھے ۱۹۴۲ء کے بھارت چھوڑو تحریک میں مئو ضلع اعظم گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں قائدانہ رول ادا

کیا تھا، انگریزی حکومت نے آپ کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کردیا، گیارہ دنوں تک آپ وہاں روپوش رہے، اس عرصہ میں آپ نے کافی مصیبتیں جھیلیں، تین دن فاقہ بھی کرنا پڑا اور جب روپوش رہنا بھی ممکن نظر نہیں آیا تو گرفتاری سے بچنے کے لیے کچھ بزرگوں اور دوستوں کے مشورے سے آپ نے مئو چھوڑنے کا فیصلہ کیا، اس وقت پورے ملک میں آزادی کے متوالوں نے ریل کی پٹریاں اکھاڑ دی تھیں، ٹرین کی آمد و رفت بالکل بند تھی، ایسی حالت میں پاؤں پیدل مئو، اعظم گڑھ یوپی سے چل کر گیارہ دنوں میں اپنے مکان پورہ نوڈیہہ ضلع دربھنگہ پہونچے، جس کی پوری تفصیل آپ کی کتاب ''جنگ آزادی کا ایک یادگار سفر'' میں درج ہے، مگر بحیثیت مجاہد آزادی آپ نے حکومت سے پینشن لینا کبھی پسند نہیں کیا، نہ کبھی درخواست دی اور نہ کبھی اس کی تمنا کی۔

آپ نے اپنے لیے قلم کا راستہ اپنایا اور بہت ساری کتابیں آپ نے لکھیں، سیکڑوں مضامین ہندو پاک کے علمی رسالوں میں لکھتے رہے، تقریباً سترہ سال تک دارالعلوم دیوبند کے میگزین ''ماہنامہ دارالعلوم'' کا اداریہ لکھا، آپ کی بہت سی کتابوں کا انگریزی، عربی اور فارسی میں ترجمہ ہوکر مختلف ملکوں میں چھپا، بہت بڑے رائٹر کی حیثیت سے آپ ملک میں جانے جاتے تھے، ساتھ ہی دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی ادارے کے مفتی کے طور پر آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ بہت سارے علماء اور مفتیان کرام کے استاذ و مربی تھے، اس قدر ہمہ جہت خوبیوں کا انسان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کی موت واقعی ملک و ملت کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ اور طلباء کی تربیت

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحیؒ (ولادت ۱۹۲۶ء وفات ۲۰۱۱ء) مشرب دیوبند کے اصحاب نظر، اصحاب دل، اصحاب فکر، اصحاب قلم، اصحاب فقہ اور اصحاب علم وفن علماء میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ کتاب ان کی رہنمائے زندگی تھی۔ قلم ان کا رفیق تھا اور علم متاع حیات۔ دینی مسائل پر ان کی نظر وسیع تھی اور فقہی سرمایہ پر ان کا مطالعہ عمیق۔ وہ اپنی سادہ اور متواضع زندگی، محنت ولگن، حلم و بردباری، سنجیدگی و متانت اور اخلاص و اخلاق کے حوالہ سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کے یہاں چھوٹے بڑے سب کی رسائی تھی، وہ ہر شخص سے حسب مراتب محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ علم دوست اور انسانیت نواز تھے۔ پاک دل اور پاک باز تھے۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا اکرام و احترام اور چھوٹوں سے شفقت و محبت کے سلسلہ میں معروف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تقریر و تحریر دونوں کا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ وہ ایک سلجھی ہوئی فکر اور شگفتہ قلم کے مالک تھے۔

بہت لگتا تھا جی محفل میں ان کی وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے

انھوں نے تدریس وتصنیف دونوں طریقوں سے دین اسلام کی خدمت کی۔ ان کا قدم اور قلم دونوں راہ خدا میں وقف تھا۔ انھوں نے شاگردوں اور تربیت یافتہ نوجوانوں اور علم دوست متوسلین کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا۔ وہ اگر ایک طرف مشاہیر دیوبند کا سرمایہ افتخار تھے تو دوسری طرف علماء بہار کا درّ شاہوار تھے، ان کے

اساتذہ ان کی علمی خدمات سے مسرور تھے اور ان کے شاگرد ان کی شخصیت سے مرعوب اور مسحور تھے۔ ان کے انتقال پر یہ کہنا پڑتا ہے- ع

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

حضرت مفتی صاحب کو قدرت نے جو خوبیاں اور محاسن فیاضی کے ساتھ عطا کی تھیں وہ چاہتے تھے کہ ان کے عزیزوں، شاگردوں اور معتقدین میں بھی منتقل ہوجائیں۔ وہ صرف اس کی خواہش نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی نصیحت، جدو جہد اور سرپرستی فرماتے تھے۔ راقم بہت سے اصحاب قلم کو جانتا ہے جو حضرت مفتی صاحب کی تصنیفی تربیت کا صدقہ ہیں، بہت سے خطیبوں سے واقف ہے جن کی قوت گویائی میں مفتی صاحب کا خون جگر شامل ہے۔ بہت سے فقیہ ہیں جو حضرت مفتی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے باکمال بنے ہیں۔ بہت سے مدرس ہیں جو مفتی صاحب کے پروردہ ہیں اور بہت سے مربّی ہیں جو خود مفتی صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ جن مفتیوں کو انھوں نے افتاء کی مشق کرائی صرف ان کی تعداد سو سے متجاوز ہے۔ ان کے شاگردوں کا سلسلہ ہندوستان کے طول وعرض بلکہ بیرون ہند تک پھیلا ہوا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی شخصیت صحیح معنوں میں پھل دار اور سایہ دار درخت کی تھی۔ صحرا میں شجر نو بہار کی تھی جس سے ہر خاص وعام فیض پاتا ہے۔

مفتی صاحب اپنے شاگردوں اور متوسلین کو محنت ولگن کا درس دیتے تھے۔ ان کا فرمان تھا کہ دنیا محنت سے چلتی ہے، جتنی محنت کروگے اتنی کامیابی ملے گی، جتنا گڑ ڈالوگے اتنا میٹھا ہوگا۔ حضرت مفتی صاحب کی یہ تعلیم صرف زبانی نہ تھی بلکہ عملی تھی۔ وہ جو کہتے تھے ان کی زندگی اس کا عملی ثبوت فراہم کرتی تھی۔

وہ طلبا کو درسی کتابوں میں محنت کرنے اور عربی صرف ونحو کو اچھی طرح ہضم کرنے کی تلقین کرتے تھے تاکہ اعلیٰ کتابیں پڑھنے اور سمجھنے میں دقت نہ ہو اور ترقی کے مراحل آسانی سے طے ہوسکیں۔ مفتی صاحب محدث کبیر ابوالمآثر مولانا

حبیب الرحمان اعظمیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ حضرت مفتی صاحب ان کی تدریسی خصوصیات اور طلبہ کی تعلیمی نگرانی کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اپنا یہ واقعہ بیان کیا ہے:

''حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحبؒ کے یہاں عبارت اور ترجمہ وغیرہ کا حل کرنا طالب علم کے ذمّہ ہوتا تھا۔ ایک زبر، زیر وغیرہ کی غلطی بھی معاف نہیں ہوتی تھی ذرا سی غلطی پر صرفی نحوی ترکیب وتحلیل پوچھنا شروع کردیتے تھے۔

میں جلالین کے لیے مدارک التنزیل اور اس کی شرح الاکلیل جو شیخ عبدالحق مہاجر مکی کی تھی، پابندی سے دیکھنے کے ساتھ تفسیری خازن بھی مسلسل دیکھا کرتا تھا۔ مذاہب اربعہ کی تفصیل بھی دیکھ کر جانا ضروری ہوتا تھا یہی حال دیوانِ حماسہ کے مطالعہ کا تھا، حل لغات، شاعر کے ناموں کا صحیح تلفظ اور دوسری کتابوں کو دیکھنا ہوتا تھا۔

حضرت الاستاذ کے سامنے عموماً عبارت خوانی میرے ذمّہ ہوتی تھی اس لیے کہ مولانا بہت سخت تھے، جہاں ذرا سی زبر، زیر، کی غلطی ہوتی چھڑی اٹھالیتے تھے''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص:۳۱)

حضرت مفتی صاحب طلبا کو محنت ولگن کے ساتھ وسعتِ مطالعہ کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ کثرت مطالعہ سے فکر وذہن میں وسعت آتی ہے۔

وہ خود صاحب قلم اور صاحب تصانیف تھے، اہل علم جانتے ہیں کہ ایک مضمون لکھنے کے لیے متعدد رسالوں، کتابوں اور مقالوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے ورنہ آدمی کی فکر گہرائی اور قلم پذیرائی سے محروم ہوجاتا ہے۔ جو طلبا ان کے پاس افتاء کی تربیت حاصل کرتے تھے ان کو فقہی مصادر تک رسائی کی تعلیم دیتے تھے۔

جو طلبا انشا پردازی اور مضمون نگاری کے لیے ان کی خدمت میں حاضر

ہوتے تھے ان کو موضوع سے متعلق دستیاب کتابوں تک دسترس حاصل کرنے اور ان کو اچھی طرح ہضم کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ خود مفتی صاحب اپنے مقالات، تالیفات میں یہی نکتہ پیش نظر رکھتے تھے اور اس سے طلبا کو رہنمائی، سبق اور حوصلہ ملتا تھا۔

اس سلسلہ میں وہ مسلکی اور گروہی تعصب سے بالاتر تھے، تعصب کا مرض جس شخص میں پیدا ہوجائے وہ صحت بخش ہوا سے اپنے آپ کو محروم کرلیتا ہے اور یہی نکتہ علمی زندگی کی شاہ کلید ہے، جس سے وہ نئی نسل کی ذہنی وفکری تربیت کیا کرتے تھے۔ ان کی تربیت کا ایک اہم نکتہ بزرگ علماء سے تعلق اور استفادہ تھا، وہ فرماتے تھے کہ آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے مگر علم بوڑھا نہیں ہوتا، آدمی کو ہمیشہ اپنے سے بڑے اہل علم سے استفادہ جاری رکھنا چاہیے۔ وہ فرماتے تھے کہ جب طالب علم کو فاضل کی سند ملتی ہے تو یہ اس کے باکمال ہونے کی سند نہیں بلکہ اس کے تحصیل علم کا اہل ہونے کی سند ملتی ہے۔ اس کے علمی سفر کا آغاز اب ہوتا ہے۔ خود مفتی صاحب کا اپنا حال یہ تھا کہ فراغت کے بعد مدرسی کے زمانہ میں بھی بڑے علماء سے ربط رکھتے تھے اور ان سے بالمشافہ یا خط وکتابت کے ذریعہ استفادہ کرتے تھے۔

اس سلسلہ میں ان کے دو مربی خاص تھے ایک تو حضرت مولانا حبیب الرحمان اعظمیؒ جو ان کے استاذ بھی تھے اور دوسرے مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ مولانا سید سلیمان ندوی چونکہ ان کے استاذ نہیں تھے اس لیے بکثرت ان سے مراسلات کے ذریعہ استفادہ کرتے تھے۔

مثال کے طور پر مفتی صاحب کے ایک مکتوب کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو لکھا:

''خوشی ہوئی کہ آپ کو میری باتوں سے تشفّی ہوئی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص عمل کے ساتھ علم نافع عطا فرمائے۔ اس وقت جو کتابیں آپ پڑھا رہے ہیں ان کو آگے کی ترقی کا زینہ سمجھیے، چھوٹا

یا بڑا جو بھی فن ہو اس کو فن کی حیثیت سے پڑھائیے، کتاب کی حیثیت ثانوی اور فن کی حیثیت اولیٰ ہو۔ اگر یہ مختصر فقرہ سمجھ میں نہ آئے تو کسی فرصت میں آکر سمجھ لیجیے۔ مبسوط اچھی کتاب ہے اور محققانہ ہے مگر فتویٰ نویسی اور جزئیات کی نگاہ کے لیے شامی اور بدائع الصنائع مناسب ہیں، مدرس کو چاہیے کہ کتاب کے لفظوں کو چھوڑ کر نفس مسئلہ کی تقریر پہلے اپنے ذہن میں کرے پھر اس کو کم سے کم عبارت میں لیکن واضح سے واضح تعبیر میں ادا کرے، پھر طلبہ کو لفظ سے سمجھا دے تعبیر میں وضوح معنیٰ کا خیال رکھے، کتاب کی قید لفظی میں نہ رہے۔

سید سلیمان
اعظم گڑھ، ۱۳۶۴ھ''

حضرت مفتی صاحب طلبہ کی تربیت کے لیے جس چیز کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے تھے وہ وقت کی تنظیم اور پابندی ہے، جب کسی شخص کے سامنے کوئی مشن اور مقصد ہوتا ہے تو وہ اپنی مصروفیات اور مشغولیات کو اس لحاظ سے ترتیب دیتا ہے۔ اپنے مقصود کے لیے وقت فارغ کرتا ہے اور اس پر کاربند رہتا ہے، وقت کو ضائع کرنا اور غیر مفید کاموں میں لگانا انسان کے غیر ذمّہ دار اور مقصد زندگی سے غافل ہونے کی دلیل ہے۔

ایک موقع پر راقم سے فرمایا کہ'' آج جو محنت کرلوگے کل نہ ہو پائے گی۔ آج جتنا مطالعہ کرلوگے کل نہ ہو پائے گا، کسب معاش کی مصروفیت، بال بچوں کی کفالت اتنا وقت نہ دے گی، اعضاء و جوراح ڈھیلے پڑ جائیں گے، نگاہیں کمزور ہوجائے گی اور کام خاطر خواہ نہ ہوگا۔ اس لیے آج جو وقت میسر ہے اسے کام میں لاؤ اور علمی مصروفیت اختیار کرو''۔

یہی نصیحت مفتی صاحب کو ان کے استاذ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے ان لفظوں میں فرمائی تھی:

''یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تم یکسوئی سے اپنا کام کررہے ہو، محنت کا یہی وقت ہے اور اس وقت کی محنت بہت کام آئے گی، میرا حال یہ ہے کہ اسی عمر میں تھک گیا، اب کام نہیں ہوتا، مطالعہ سے جی گھبراتا ہے، اس لیے وقت کو غنیمت سمجھو'' (مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے، ص ۱۴۸)

حضرت مفتی صاحب کی نصیحت آج لفظ بلفظ سمجھ میں آرہی ہے، خانگی اور ازدواجی مشغولیات کے تقاضے اتنے شدید ہیں کہ بحث وتحقیق کے لیے خاطر خواہ وقت نکالنا مشکل ہوجاتا ہے۔ مفتی صاحب خود بھی اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتے تھے بلکہ جہاں کہیں بھی ہوتے اپنے وقت کا استعمال کرلیتے تھے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی فرماتے ہیں کہ:

''تیسری چیز وقت کی حفاظت اور اپنے علمی مشاغل کا اہتمام ہے، مفتی صاحب نے فتاویٰ نویسی، کتب خانہ کی ترتیب اور ترتیب فتاویٰ کے دشوار کام کے ساتھ ساتھ جس طرح اپنے تصنیفی شغل کو جاری رکھا، کتابیں اور مقالات لکھتے رہے اور علمی مجالس کو رونق بخشتے رہے وہ ایک قابل تقلید عمل ہے۔

میں نے مفتی صاحب کو دیکھا ہے کہ سفر کی حالت میں ہیں کہیں پلیٹ فارم پر رکنا پڑا، ٹرین آنے میں دیر ہے تو بیگ سے کاغذ نکالا، جیب سے قلم اور لکھنے میں مشغول ہوگئے، اپنی جائے اقامت میں تو بدرجہ اولیٰ لکھنے پڑھنے کا کام سرانجام دیتے اس لیے ان کے قلم اور وقت میں برکت ہے۔'' (زندگی کا علمی سفر، ابتدائیہ)

حضرت مفتی صاحب طلباء اور نوجوان میں صبر و استقلال کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ مشکلات ہر کسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اچھے برے حالات سے سب کو

گذرنا پڑتا ہے، ان حالات کو صبر وشکر کے ساتھ گذارنا چاہیے اور ہمّت سے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے، منزل پر نظر رکھنی چاہیے۔ مفتی صاحب کی ذاتی زندگی بھی دشواریوں سے گذری، دارالعلوم دیوبند میں مفتی صاحب کو متعدد بار ناگفتہ بہ حالات سے گذرنا پڑا مگر شکوہ و شکایت اور زود رنجی کے بجائے صبر کے ساتھ وہ حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر ان پر شورش پسند طلبا کی سرپرستی کا الزام عائد کرکے ان کو طویل رخصت پر بھیجا گیا، مگر تفتیش سے ثابت ہوا کہ مفتی صاحب کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مفتی صاحب نے ان تمام مشکلات کو جھیلا اور اپنے کام کو جاری رکھا، ایک نوجوان کو جو ابھی فارغ ہوا تھا، مفتی صاحب نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ''خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور خالی انسان مسائل کا، آدمی کو بیکار نہیں بیٹھنا چاہیے ورنہ وہ بے قیمت ہوجائے گا، جو انسان کسی کام سے لگا ہوگا اس کی قیمت ہوگی، جب اسے دوسری جگہ ملے گی تو موجودہ جگہ سے زیادہ مرتبہ اور حق المحنت ملے گا مگر جو بے کار ہوگا اس کی نہ عزت ہوگی نہ قدر و قیمت، اس لیے تم کو چاہیے کہ جو بھی نوکری ملے پہلے اسے اختیار کرلو پھر اس سے بہتر کی تلاش کرو''

مفتی صاحب کی نصیحت عملی اور مفید تھی۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر صبر و تحمل سے کام کرنے کی عادت پڑجائے گی تو زندگی کے باقی مرحلے خوشگوار گذریں گے۔ اور اگر آج محنت و مشقت اور صبر و استقلال کی عادت نہیں پڑی تو آنے والے دن مشکل سے مشکل تر ہوں گے۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو اپنے انداز سے کہا ہے:

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی آنگبیں

حضرت مفتی صاحب معاشرہ میں بڑھتی ہوئی فحاشی اور نوجوانوں میں

سرایت کرتی ہوئی برائی و بدکاری کے سلسلہ میں فکر مند رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان میں ساری خوبیاں ہوں لیکن اگر وہ سیرت کی پختگی اور اخلاق و اعمال کی پاکیزگی سے محروم ہوتو وہ اس مردہ لاش کی طرح ہے جسے حسین و جاذب نظر کفن میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ نئی نسل کی پاکیزہ سیرت و کردار کے داعی و مبلغ تھے، وہ بدکاری و فحاشی اور بدفعلی کی لعنت پر اپنی تقریر و تحریر میں تنقید کرتے تھے اور نئی نسل کو ان گناہوں سے دور رہنے کی نصیحت کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے باقاعدہ ایک کتاب اسلام کا نظام تعمیر سیرت کے عنوان سے رقم کی تھی۔ جو مصطفائی کتب خانہ دیوبند سے شائع ہوئی تھی۔

امیر شریعت بہار مولانا عبدالصمد رحمانیؒ نے اس کتاب کی بابت لکھا تھا:

''آوارگی کن کن روپ میں نمود کرتی ہے اور کس طرح انسان کو بے بس بنا کر حیا کے دامن کو تار تار کرتی ہے ضرورت تھی کہ اس آزاد ماحول میں اس کی نشان دہی کی جاتی اور ناصحانہ اور عالمانہ پیرایہ میں اس کے برے اثرات کو موثر انداز میں حوالۂ قلم کیا جاتا، ہمارے محترم مولانا محمد ظفیر الدین صاحب نے وقت کی اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک گراں قدر رسالہ اس موضوع پر مرتب فرما کر بہت بڑی دینی خدمت انجام دی''۔

حضرت مفتی صاحب طلباء اور نوجوانوں کی دینی تربیت میں اخلاص و للّٰہیت کو کلیدی اہمیت دیتے تھے، جب تک نوجوان اپنے آپ کو اخلاص کے زیور سے آراستہ نہ کرے علمی اور ذہنی محنت کچھ کام نہیں آتی، ملمع بن کر رہ جاتی ہے، جو کام کیا جائے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا خالص اللہ کے لیے کیا جائے تو اس میں برکت ہوتی ہے، جو کام عنداللہ مقبول ہوتا ہے وہ بندوں میں خود بخود مقبول ہوجاتا ہے۔ اخلاص کی تعلیم یوں تو ہر مذہبی آدمی، معلم و مدرس دیتا ہے، مگر یہ ایسا معیار ہے کہ

جس پر پورا اترنا مشکل ہوتا ہے۔ بظاہر انسان بہت للّٰہیت کی بات کرتا ہے مگر اس کا مقصد اور محرک کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے خود اس کے ثمرات سے محروم رہتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب اس سلسلہ میں خود بھی مثال تھے۔ انھوں نے سانحہ مونگیر کے مدرسہ میں تدریسی و انتظامی ذمّہ داریوں کے تعلق سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

''میرے مدرسہ کے سلسلہ میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ مجھے کچھ تکلیف بھی ہوئی۔ میں نے اعلان کردیا تھا کہ جب تک مدرسہ کا مکان تیار نہیں ہوجاتا سانحہ نہیں چھوڑونگا خواہ کچھ ہو۔ خطوط ادھر ادھر مدارس سے آئے جس میں میری طلبی تھی مگر میں نے توجہ نہیں دی، دارالعلوم سانحہ کی ترقی پر لگا رہا۔ میرے پیش نظر سادات سانحہ کی خدمت بھی تھی اور مکان مدرسہ کی تکمیل بھی البتہ جب مکان تیار ہوگیا تو اب میں نے دعا کی کہ رب العالمین میرا انتظام کہیں اور فرمادیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ سب میں نے اپنی راحت کے لیے کیا ہے''۔

حضرت مفتی صاحب طلبا کی ہمہ جہت تربیت کے لیے اعلیٰ حوصلگی اور اولوالعزمی پیدا کرنا چاہتے تھے، اسی لیے طلبا کو بلند نظر، بلند ذہن اور بلند مقام کا حامل بننے کی نصیحت فرماتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان جتنا مانگتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سب مل جائے۔ پھر مانگنے میں بخل اور کمی کیوں کرے۔ وہ کہا کرتے تھے ''بھیج مولیٰ چھپن کروڑ کی چوتھائی'' چوتھائی وہ ازراہِ مزاح فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم دارالعلوم میں داخل ہوا، اس کا نیا داخلہ ہوا تھا، وہ دارالعلوم کے نظام اور در و دیوار سے متاثر و مرعوب تھا اور وہاں کے ماحول کا شہرہ سن کر آیا تھا۔ اس نے کسی بات پر کہا کہ دارالعلوم میں چپراسی کی جگہ بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ یہ سن کر مفتی صاحب نے فرمایا تم اتنے بے حوصلہ ہوتو میرے پاس سے اٹھ جاؤ، اللہ سے مانگنے کے لیے چپراسی کی جگہ رہ گئی ہے۔ اہتمام مانگو گے تو نیچے کی جگہ

ملی گی ، اللہ سے ہمیشہ اعلیٰ وارفع جگہ مانگا کرو، اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے جو تم اس سے کم تر چیز مانگتے ہو۔ حضرت مفتی صاحب کی یہ تربیت خاصے کی چیز تھی اور اس سے ان کے شاگردوں میں بلندی پیدا ہوتی تھی، ان کی تربیت کا حاصل تھا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

حضرت مفتی صاحب طلبا کی رسمی تعلیم و تربیت کے علاوہ درس کے بعد فارغ وقتوں میں باذوق طلباء کے مضمون و مقالات کی اصلاح فرماتے تھے اور یہ ایسا میدان تھا جس میں وہ منفرد اور ممتاز تھے۔ بعض طلبا کو میں نے دیکھا کہ ان میں کہانی و افسانہ لکھنے کا ذوق تھا وہ اپنی کہانی حضرت مفتی صاحب کو دکھاتے تھے اور آپ ان کی بھی اصلاح فرماتے تھے، یہاں تک کہ بعض طلبا اپنی نظموں اور غزلوں کی بھی مفتی صاحب سے اصلاح کراتے تھے۔ مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے مولانا احمد سجاد صاحب رانچی کے مشہور عالم امام وخطیب کے بارے میں جو بعد میں رانچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار بھی مقرر ہوئے تھے بیان کرتے ہیں کہ ’’مولانا شعیب رحمانیؒ طالب علمی کے زمانہ میں بارہ بجے شب میں ابا جان کا دروازہ کھٹکھٹاتے، ابا جاگتے، دروازہ کھولتے اور پیار سے فرماتے، لگتا ہے میرے ’’ پگلے‘‘ نے کوئی تازہ غزل کہی ہے۔ جواب ملتا حضرت کسے سناتا۔ ابا فرماتے پہلے چائے بنا کر لاؤ پھر اپنی نظم سناؤ۔

راقم الحروف کو قرطاس وقلم سے شغف کی نعمت حضرت مفتی صاحب کی تربیت سے ملی، مفتی صاحب اس ناچیز کی کچّی تحریر پڑھتے، اصلاح فرماتے اور ساتھ ہی ساتھ نصیحت فرماتے۔ پہلے اپنی تحریر خود پڑھو، اپنی خامیوں کو دیکھو اور اصلاح کرو پھر میرے پاس لے کر آؤ، حضرت مفتی صاحب کی اصلاح مفید اور مؤثر ہوتی تھی وہ بھاری بھرکم جملوں نامانوس لفظوں اور شکستہ تحریر کو ناپسند فرماتے تھے۔ ان کی

تحریر سادگی کا نمونہ ہوا کرتی تھی، انھوں نے جو کچھ سکھایا وہ آج کام آیا، اللہ کرے آخرت میں بھی کام آئے اور اللہ استاذ وشاگرد دونوں سے راضی ہو۔

مفتی صاحب طالب علموں کی تربیت کے لیے قرآن وسنت کے گہرے مطالعہ کو لازم قرار دیتے تھے اور اس کو جزو زندگی بنا لینے کو سیرت کا کمال سمجھتے تھے۔ راقم الحروف جب دیوبند سے فارغ ہوکر علی گڑھ کے لیے عازم سفر ہوا تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: تمھیں چاہیے کہ از خود تفسیر ابن کثیر مکمل پڑھ ڈالو، اس سے قرآن کی بصیرت پیدا ہوگی ، بخاری شریف بھی مکمل پڑھو، اس سے حدیث میں درک پیدا ہوگا۔ امام غزالیؒ کی احیاء علوم الدین بھی پڑھ لو، پھر فرمایا کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا: علی گڑھ آنے کے بعد ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی میں راقم نے چھ سال مکمل مطالعہ میں وقت لگایا اور مذکورہ کتابوں کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ مگر احیاء العلوم میں ضعیف روایات کی کثرت کے سبب سے جی نہ لگا۔ مذکورہ مطالعہ نے فہم دین کی بنیاد نہ صرف مضبوط کردی بلکہ قرآن وسنت سے ایسا عشق پیدا کردیا کہ

ماہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنم

ایک مرتبہ راقم اور مشہور سیرت نگار پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مولانا علی میاں کی خدمت میں ندوہ حاضر ہوئے۔ میں نے حضرت مولانا سے مفتی صاحب کے حوالہ سے مذکورہ واقعہ ذکر کیا تو مولانا علی میاں نے فرمایا: ہاں میں نے ان کو یہ مشورہ دیا تھا۔ راقم نے عرض کیا کہ آپ کی نصیحت پر اب دوسری نسل عمل کر رہی ہے۔ مگر احیاء علوم الدین میں بکثرت ضعیف روایات ہیں اس لیے طبیعت ابا کرتی ہے۔ فرمایا اس کتاب کی یہ کمزوری تو ہے مگر اصلاح نفس کے لیے مؤثر کتاب ہے۔ اس کو اسی

نقطۂ نظر سے پڑھیے، پھر مولانا نے راقم کو دعائیں دیں۔

حضرت مفتی صاحب اور مولانا علی میاں ندویؒ دونوں اللہ کے یہاں جا چکے ہیں ان دونوں بزرگوں کے لیے رب کریم کے حضور عاجز کی دعا ہے کہ ان بزرگوں کے اعمال حسنہ کو قبول فرما، ان کو اپنے خاص مقربین کی فہرست میں جگہ دے اور ہم جیسے لوگوں کو ان کی پاکیزہ باتوں کو نشان راہ بنانے کی توفیق دے۔

جن کی صحبت نے ہمیں بخشا ہے جینے کا شعور
ان کی تربت پر گہر افشاں رہے ربِّ غفور

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ

میرے استاذ اور مربّی

مولانا محمد ساجد قاسمی ☆

حضرت مفتی صاحب سے مجھے نیازمندی کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی جب میں ۱۹۹۵ء میں دارالافتاء میں داخل ہوا، کتابوں میں آپ سے درمختار متعلق ہوئی اور تمرین فتویٰ کا گھنٹہ بھی آپ کے پاس آیا۔ درمختار کا گھنٹہ صبح کے وقت تھا، آپ سبق میں کتاب سے متعلق ہی بات کرتے تھے، سبق میں غیر متعلق کوئی بات نہیں کرتے۔ نگاہ کی کمزوری کی وجہ سے آپ ڈسک پر رکھی کتاب کو سر جھکا کر بہت قریب سے دیکھتے اور سر کو ادھر ادھر اٹھا کر نہ دیکھتے۔

تمرین فتاویٰ کے آغاز سے پہلے آپ نے ہم سب لوگوں سے کہا کہ تم میں سے ہر ایک اپنے اب تک کے حالات زندگی مختصر انداز میں لکھ کر دکھائے، چنانچہ ہم لوگوں نے اپنے مختصر حالات لکھ کر دکھائے، آپ نے ان کو پسند فرمایا اور یہ فرمایا کہ میرا مقصد آپ لوگوں کی تحریری صلاحیت کا اندازہ لگانا تھا، نیز فرمایا کہ ان کو محفوظ رکھنا، حسب کارکردگی آئندہ اس میں اضافہ کرتے رہنا، آپ کی ہدایت کے مطابق وہ حالات آج بھی میرے پاس موجود ہیں۔ ہم لوگوں کے ظہر کے بعد کے دونوں گھنٹے تمرین فتاویٰ کے لیے مختص تھے، پانچویں گھنٹے میں تمرین لکھتے یا

☆ استاذ دارالعلوم دیوبند، سہارن پور، یوپی

رات ہی میں لکھ لیتے تھے اور چھٹے گھنٹے میں دکھاتے تھے، میں نے اور میرے بعض ساتھیوں نے درخواست کی کہ تمرین پانچویں گھنٹے میں دیکھ لیا کریں؛ منشا یہ تھا کہ چھٹے گھنٹے میں ہم لوگ حضرت مولانا نور عالم صاحب کے المختارات العربیۃ کے سبق میں شرکت کرلیا کریں، تو آپ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ عام طور پر ہم لوگوں کی تمرین کو ملاحظہ فرما کر درست قرار دیتے تھے، اس میں زیادہ کاٹ چھانٹ نہیں کرتے تھے۔

میری رہائش دارالافتا سے قریب احاطۂ مسجد بالائی منزل کمرہ نمبر ۲۸ میں تھی، حضرت مفتی صاحب کا گذر میرے کمرے کے پاس سے ہوتا تھا، اس لیے آتے جاتے بھی آپ سے ملاقات ہوتی تھی۔ احقر فطری طور پر کم آمیز، عزلت پسند اور کم ہمت واقع ہوا ہے؛ اس لیے پورے زمانۂ طالب علمی میں عام طلبہ حتی کہ اپنے ساتھیوں سے بھی الگ تھلگ رہا، نیز اپنے اساتذہ کے پاس جانے اور ان کی خدمت سے بھی محروم رہا۔ البتہ افتا کے سال احقر کو مفتی صاحب کی خدمت کرنے کا موقع ملا، سردیوں میں جب مفتی صاحب دارالافتا سے اذان عصر کے وقت نکلتے تو احقر نیچے جاکر وضوخانے سے وضو کے لیے پانی لے کر آتا اور آپ کو وضو کراتا، اس کے بعد تولیہ پیش کرتا، آپ بہت خوش ہوتے تھے اور دعائیں دیتے تھے۔ جب میں دارالعلوم میں مدرس ہوگیا تو آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا، میں نے اپنا نام بتایا آپ نے فرمایا تم وہی تو ہو جو مجھے وضو کرایا کرتے تھے۔

آپ کے مزاج و مذاق میں بڑی سادگی تھی، تصنع اور تکلف پاس سے بھی نہیں گذرا تھا؛ اس لیے آپ کی گفتگو میں بھی سادگی ہوتی تھی، رہن سہن میں بھی اور انشا و تحریر میں بھی۔ نیز آپ رجائیت پسند واقع ہوئے تھے، مایوسی کا آپ کے یہاں گذر بھی نہیں تھا، اس کا اثر آپ کی پوری زندگی پر محسوس ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں آپ کی تشریف آوری کا واقعہ یہ ہوا کہ مونگیر میں

کانفرنس تھی، جس میں دارالعلوم دیوبند سے مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ بھی تشریف لے گئے تھے، اس کانفرنس میں مفتی صاحب بھی مدعو تھے، آپ نے اپنا مقالہ پیش کیا جو حضرت قاری طیب صاحبؒ کو بہت پسند آیا۔ دارالعلوم میں جماعت اسلامی کی رد میں لکھنے کے لیے ایک اچھے اہل قلم عالم کی ضرورت تھی؛ اس لیے قاری صاحب نے دیوبند آکر حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مشورہ کرکے شعبۂ تصنیف و تالیف کے لیے مجلس شوریٰ منعقدہ ۳؍صفر ۱۳۷۶ھ مطابق ۹؍ستمبر ۱۹۵۶ء میں آپ کا تقرر کرایا۔ چنانچہ آپ نے اپنی تالیف ''جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' اسی زمانے میں لکھی۔ لیکن آپ کسی اختلافی موضوع پر لکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار آپ نے فرمایا کہ کسی منفی یا تردیدی موضوع پر میرا قلم نہیں چلتا۔ مگر مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خواہش پر آپ کو یہ کام کرنا پڑا۔ مفتی صاحب نے خود اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

> ''حضرت (قاری محمد طیب صاحب) نے فرمایا کہ حضرت شیخ الاسلام کو مودودی جماعت سے سخت ذہنی بعد ہے، آپ پہلے ایک کتاب اس جماعت پر لکھ دیں پھر اس کے بعد کوئی دوسرا کام مثبت انداز کا شروع کردیں گے''۔ (زندگی کا علمی سفر، ص۱۲۹)

مفتی صاحب پھر ۱۳۸۳ھ میں مرتب کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کے عہدے پر فائز ہوئے، اسی زمانے میں آپ نے مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندی مفتی دارالعلوم دیوبند کے فتاویٰ کی ترتیب کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا، یہ مرتب فتاوے ۱۲ جلدوں میں ''فتاوی دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے شائع ہوئے۔

۱۳۸۴ھ میں دارالعلوم میں ''مطالعہ قرآن'' کے نام سے ایک شعبہ قائم ہوا، جس کی نگرانی و سرپرستی مجلس شوریٰ نے آپ کے سپرد کی، اس شعبے میں ذہین و باصلاحیت طلبہ اپنی تحریری صلاحیتوں کو جلا بخشتے تھے۔ یہ شعبہ ۱۳۸۸ھ تک قائم رہا

اس کے بعد بند ہوگیا۔ نیز دارالعلوم کی مجلس شوریٰ منعقدہ صفر ۱۳۸۵ھ نے آپ کو ماہنامہ ''دارالعلوم دیوبند'' کی مجلس ادارت میں شامل کیا اور اداریہ لکھنے کی ذمے داری آپ کے سپرد کی، چنانچہ آپ نے ماہنامے میں اداریہ لکھنا شروع کیا اور ۱۴۰۲ھ تک مسلسل اداریہ لکھتے رہے۔

۱۹۹۳ء میں دارالافتاء میں بحیثیت مفتی دارالعلوم آپ کا انتخاب عمل میں آیا، چنانچہ آپ افتاء کے اسباق میں درمختار پڑھاتے تھے اور طلبہ کو فتاویٰ کی تمرین کراتے تھے، جب کہ اس کے علاوہ کے گھنٹوں میں فتویٰ نویسی کی ذمے داری انجام دیتے تھے۔ ۲۰؍شعبان ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۲؍اگست ۲۰۰۸ء کو آپ نے پیرانہ سالی اور کمزوری کے باعث اس منصب سے خود سے سبک دوشی اختیار کی اور اپنے گھر چلے گئے۔ دارالعلوم نے آپ کے لیے ۲۰۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ جاری کردیا جو تا حیات جاری رہا۔

میں نے آپ کی مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کے بارے میں دریافت کیا، تو فرمایا کہ زمانۂ طالب علمی ہی سے میرا یہ معمول تھا کہ ہر ہفتہ میں جمعرات کو ایک مضمون لکھتا تھا، اس طرح میرے مشق کا سلسلہ جاری رہا، پھر جب میں مدرسہ معدن العلوم نگرام ضلع لکھنؤ میں مدرس ہوگیا تو میں نے مساجد کے موضوع پر مواد اکھٹا کرکے نظام مساجد کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، یہ میری پہلی کتاب تھی، میں نے چاہا کہ کوئی اس کو بالاستیعاب پڑھ کر اپنی رائے دے، چنانچہ میں جس شخص سے بھی کتاب دیکھنے کے لیے کہتا تو وہ مصروفیت کی وجہ سے معذرت کردیتا، یا کتاب کے صفحات الٹ پلٹ کر کہتا کہ کتاب تو اچھی ہے۔ لیکن جب میں نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے اس کتاب کے سلسلے میں عرض کیا تو آپ نے نہ صرف کتاب از اول تا آخر پڑھی بلکہ اس پر پیش لفظ بھی لکھا۔ اس سے مجھے تصنیف و تالیف کے میدان میں بہت حوصلہ ملا۔

آپ کو تحریر اور انشا پردازی کا ذوق وشوق زمانہ طالب علمی ہی سے تھا، چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں ہر ہفتہ ایک مضمون لکھا کرتے تھے جوں جوں آپ نے تعلیمی و تدریسی مراحل طے کیے یہ ذوق نکھرتا چلا گیا اور تصنیفی و تالیفی میدان میں ایک بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے متعارف ہوئے، آپ کے بے شمار مضامین و مقالات طول وعرض سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوئے۔ آپ نے اردو کی اسلامی لائبریری کو دو درجن سے زیادہ اہم اور قیمتی کتابوں کا تحفہ دیا۔ حضرت مفتی صاحب کا انتقال علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے۔ اللہ مفتی صاحب کی مغفرت فرمائے۔

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کے اوصاف حمیدہ

مولانا اشتیاق احمد قاسمی ☆

حضرت مفتی صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا، راقم الحروف نے جو باتیں انکی زندگی میں دیکھیں اور جن کو اُسوہ اور نمونہ بنایا جاسکتا ہے، ان میں سے کچھ منتخب باتیں ذیل ہیں:

۱- ''علم کی وسعت'' کی دولت سے مالا مال تھے اور ہر لمحہ مزید در مزید کے لیے کوشاں رہتے تھے، دارالافتاء میں رہنے کی وجہ سے روزانہ کوئی نہ کوئی تحقیقی مسئلہ سامنے رہتا، اس کے سلسلے میں شریعت کا قابلِ عمل آخری حل کیا ہے؟ مفتی صاحب کو اس کی جستجو رہتی تھی۔ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی موضوعات پر آپ کی معلومات کا اندازہ لگانا ہم جیسوں کے لیے مشکل تھا۔ آپ کی گراں قدر تصانیف، مقالات اور فتاویٰ اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔

۲- ''فنائیت و بے نفسی'' رب قدیر نے آپ کی شخصیت میں ودیعت فرمائی تھی، ہر لمحہ ایک حالت میں نظر آتے تھے، خلوت میں دیکھیے یا جلوت میں بس ایک ہی انداز، ایک ہی اسلوب، ایک ہی لہجہ اور ایک ہی آہنگ، کوئی تصنع اور تکلف نہیں۔

۳- ''اصابتِ رائے'' بھی مثالی تھی، طبیعت میں اصابت اور پختگی تھی، جماؤ تھا، ''مسلم پرسنل لا'' کے متعدد اجلاس میں راقم کو سفر کی رفاقت میسر ہوئی،

☆ استاذ دارالعلوم دیوبند، سہارن پور، یوپی

مشکل سے مشکل ملکی اور ملی حالات میں آپ نہایت ہی اطمینان سے ایک رائے دیتے اور اس کی دلیل بیان فرمادیتے۔ اور اس کے خلاف رائے کا نتیجہ بھی بتاتے، دارالافتاء میں عموماً نیم سیاسی، نیم مذہبی مسائل آپ ہی تحریر فرماتے اور ایسا اسلوب اپناتے کہ مخاطب مطمئن ہوجائے۔

۴- ''عزلت نشینی'' کے عادی تھے، کہیں نہ جانا نہ آنا: یہی وجہ تھی کہ آپ کی یکسوئی اخیر تک باقی رہی، اہلِ علم خصوصاً اہلِ قلم کے لیے یہ بڑی اہم دولت ہے، عموماً کمرہ، مسجد اور دارالافتاء کے درمیان ہی چوبیس گھنٹے گذرتے۔ نہایت مصروفیت کی حالت میں بھی اگر کوئی پھٹک جاتا تو بڑی خندہ پیشانی سے استقبال فرماتے تھے، ملنے والے کو بے وقت آنے کا احساس نہ ہونے دیتے، بلکہ ایسا لگتا کہ آپ اس کے انتظار میں تھے، عزلت نشینی کی عادت ہونے کی وجہ سے مطالعہ کے وقت مضمون میں بالکل ڈوب جاتے، بسا اوقات دارالافتاء میں فتویٰ نویسی کے وقت گردو پیش سے بے خبر ہوجاتے تھے، پوری ڈاک جب تک ختم نہ ہوجاتی سر نہ اٹھاتے تھے۔

۵- ''جہدِ مسلسل'' کے عادی تھے۔ ''رحال اور مرتحل'' جیسی زندگی تھی، ایک کام کرکے فارغ ہوتے اور دوسرا شروع فرمادیتے تھے، درمیان میں تھکان کا اظہار نہ کرتے اور نہ ہی بڑا کارنامہ انجام دے چکنے کا احساس ہوتا، اسی وجہ سے اتنی عظیم خدمات کا موقع میسر آیا۔ آپ کا کوئی وقت خالی نہ رہتا، ہاتھ سے لکھتے رہتے یا کوئی کتاب پڑھتے رہتے تھے۔

۶- ''اکابر سے ربط'' حضرت مفتی صاحبؒ کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ آپ ہمیشہ طالب علمی کے زمانے سے اخیر تک اکابر اور بزرگوں سے مربوط رہے، ان سے علمی استفادہ کا سلسلہ جاری رہا، ان میں حضرت تھانویؒ سرِ فہرست ہیں، آپ نے طالب علمی کے زمانہ میں ان سے مکاتبت کی تھی، خط کا جواب بھی

موصول ہوا تھا، اس خط کے گم ہوجانے پر بہت افسوس فرماتے تھے، جن علماء سے مراسلت رہی ان میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت بھی ہوئے اور قاری محمد طیب صاحبؒ سے خلافت بھی ملی، حضرت مولانا فضل اللہ صاحبؒ نے خلافت کے ساتھ حضرت سنوسیؒ کا بابرکت جبّہ بھی عنایت فرمایا تھا۔

۷- ''خلوص وللّٰہیت'': راقم الحروف حضرت مفتی صاحبؒ کے پاس تقریباً پانچ سال رہا، افتاء اور تدریبِ افتاء کے تینوں سال اکثر اوقات حضرت کے قرب و جواب میں رہ کر ہی گذرے، میں نے کبھی ان کا کوئی عمل غیر مخلصانہ نہیں دیکھا، عبادات، معاملات، معاشرت اور اخلاق سب میں نہایت ہی معتدل پایا، مسجد قدیم کے اوپر کی منزل میں پہلی صف کے پابند تھے، ساری نمازوں میں وقت سے پہلے اپنی جگہ پر جاپہنچتے، ایک بار ساتھ جاتے ہوئے میں نے پوچھا: حضرت: اوپری منزل میں بھی پہلی صف کا ثواب ملے گا؟ تو فرمایا: ''انشاء اللہ ضرور ملے گا، اللہ کے خزانہ میں کچھ کمی نہیں''۔

پیرانہ سالی کی وجہ سے ہمیشہ نیچے اترنا، چڑھنا مشکل تھا، سفر میں بھی کافی پہلے بیدار ہوتے اور اپنے معمولات پورے کرتے، مناجات کے اشعار پُر درد انداز میں پڑھتے، اپنے ساتھ والوں کو جماعت سے چند منٹ پہلے جگاتے، ٹرین میں بھی نماز بروقت پڑھ لیتے اور اگر کھڑے ہوکر پڑھنا دشوار ہوتا تو بیٹھ کر پڑھتے، کبھی سخت سردی میں یا بیماری کے زمانہ میں کمرے میں نماز پڑھتے تو خود امامت فرماتے اور دانت نہ ہونے کے باوجود قرآن عمدہ پڑھتے تھے۔

ایک بار دارالافتاء کا سادہ لفافہ مجبوری میں استعمال کرنے کی نوبت آئی تو

فرمایا کہ: میں نے وصیت کردی ہے کہ میرے مال میں سے ایک ہزار روپے احتیاطاً دارالعلوم کے خزانہ میں جمع کردیا جائے: کیوں کہ احتیاط کرنے کے باوجود دیکھو اس طرح کی نوبت آجاتی ہے، آپ کا معاملہ بالکل صاف رہتا، کسی کا نہ لینا اور نہ دینا باقی رہتا، معاشرت اور اخلاق کی گواہی تو ہر دیکھنے اور برتنے والے دیں گے۔

۸- ''جرأت و بے باکی'' حضرت مفتی صاحبؒ کی قوتِ ارادی بہت مضبوط تھی، ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے پُر آشوب حالات میں انھوں نے آزادی کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر تقریریں کی تھیں، تحریریں لکھی تھیں، اس کے بعد بھی ملکی حالات میں مشکلیں پیش آئیں، ہمیشہ آپ نے اپنی جرأت و بے باکی کا مظاہرہ فرمایا، شرعی مسائل میں حق کی ترجمانی فرماتے چاہے وہ کسی کے موافق ہو یا مخالف، اور اسی کی تلقین بھی فرماتے، ایک بار کسی نے اپنے باطل خیال کو نہایت ہی مدلل انداز میں بیان کیا، آپ نے اس کا مناسب جواب دیا اور تنہائی میں مجھ سے فرمایا کہ: باطل اسی طرح اپنے دلائل پیش کرتا ہے، اور متأثر کرنے کی کوشش کرتا ہے، تم مرعوب تو نہیں ہوئے؟ باطل سے کبھی متأثر اور مرعوب نہیں ہونا چاہیے!

۹- ''قلم کی تیز گامی'': حضرت مفتی صاحبؒ مضمون ڈوب کر لکھتے تھے اور بہت جلدی طویل مقالہ تیار کرلیتے، الفاظ میں سادگی، شگفتگی، شستگی اور روانی ہوتی، تعبیرات میں نہایت ہی جاذبیت محسوس ہوتی، مضمون میں بلا کی کشش ہوتی، اس میں قاری کے لیے محویت کا سارا سامان موجود ہوتا، قوتِ ترسیل و ابلاغ میں بہت کمال رکھتے تھے، ایک ایک جملہ دلوں میں نفوذ کرجاتا، مخاطب بس ان کا گرویدہ ہوجاتا۔ ایک بار ایک تازہ مضمون پڑھ کر میں نے کہا کہ: حضرت: دارالافتاء کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود آپ اتنا مفصل اور پُر کیف مقالہ کب لکھتے ہیں؟ اور اتنی زیادہ تاثیر کیوں کر پیدا ہوجاتی ہے؟ فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے قلم میں بہت برکت دی ہے، حضرت قاری طیب صاحبؒ بھی کہتے تھے

کہ آپ اتنی لمبی لمبی تحریریں کب لکھتے ہیں؟ آپ کے قلم میں سرعت و تیز گامی بہت ہے، اہتمام کی بہت سی تحریریں بہت کم وقت میں لکھ کر حاضر کر دیتا تھا، جب ذہن میں سکون ہوتا ہے، یکسوئی ہوتی ہے، افکار و خیالات کا ہجوم نہیں ہوتا، تب میں مضمون لکھتا ہوں اور عموماً خلوت میں اور رات کے اوقات میں لکھتا ہوں، مضمون کے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچ لیتا ہوں، اور جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو الفاظ وتعبیرات کو نہیں سوچتا، بس لکھتا ہی چلا گیا، میں نے الفاظ کے گیسو سنوارنے میں وقت ضائع نہیں کیا ہے، جو تعبیر اچھی لگی بس اسے لکھ دیا۔

کوئی بھی مصنف اپنی تحریر لے کر حاضر ہوتا، اس کو محروم نہ فرماتے، ایک گہری نظر مسودہ پر ڈالتے اور اپنی رائے ظاہر فرما دیتے، کسی کی حوصلہ افزائی سے دریغ نہ فرماتے اور نہ ہی عدیم الفرصتی کا عذر کر کے انتظار کراتے، اگر کوئی کتاب ضخیم ہوتی تو کچھ وقت لے لیتے، اخیر زمانہ میں کئی بار بعض کتابوں پر تفصیلی نظر ڈالنے کے لیے راقم الحروف کو دیا اور بہت اطمینان حاصل کرنے کے بعد اپنی رائے ظاہر فرمائی، بعض کتابوں پر لکھنے سے معذرت بھی فرما لیتے تھے۔

ایک صاحب نے کتاب بھیجی اس کا نام تھا: ''سائنس کہتا ہے کہ قرآن برحق ہے'' اس کو سرسری دیکھا، تو غیر معیاری معلوم ہوئی، راقم الحروف کو دیا کہ اس کو اچھی طرح دیکھ لو، اس پر کچھ لکھنا کیسا رہے گا؟ میں نے مشمولات کا مطالعہ کیا اور حاضر خدمت ہو کر تفصیلات بتا دی، تو مصنف سے آپ نے معذرت کر لی، آپ کے قلم میں بلا کی روانی تھی، دارالافتاء کی پوری ڈاک ناشتہ کے بعد ایک سوا گھنٹہ میں لکھ ڈالتے، فقہی عبارتیں زبانی یاد تھیں اور بہت سی عبارتیں اپنے پیڈ پر لکھے رہتے، ایک دن میں نے کہا کہ حضرت دارالافتاء میں ڈاک بہت رہتی ہے، فرمانے لگے کہ.....، اگر میں چاہوں تو اکیلے سب لکھ دیا کروں! یہ آج سے پندرہ سال پہلے کی بات ہے، جب انٹرنیٹ سے سوالات کا سلسلہ نہیں تھا، صرف ڈاک سے استفتاء

آتے تھے۔

۱۰- ''دینی وملی فکرمندی'': حضرت مفتی صاحبؒ اپنے استاذ محترم جناب مولانا عبداللطیف نعمانیؒ کے نقشِ قدم پر تھے، گردوپیش کے احوال سے باخبر رہتے، دینی و مذہبی فکرمندی کے ساتھ ملک وملت کا احساس بھی بہت زیادہ رکھتے تھے، ایک رات مغرب بعد کسی گہری سوچ میں تھے، چہرہ اداس اور غمگین تھا، اسی وقت میں پہنچا، پوچھا کہ: حضرت کیا بات ہے؟ اتنے غمگین کیوں ہیں؟ تو فرمانے لگے: یہ سوچ رہا تھا کہ ہماری زندگی تو پوری ہو رہی ہے، اگلی نسل کا اس ملک میں کیا ہوگا؟ یہ بول کر اور بھی غمگین ہو گئے، اس وقت بی، جے، پی کی حکومت تھی، مسلمانوں کے خلاف طوفان کھڑا تھا۔

۱۱- ''سادگی'': حضرت مفتی صاحبؒ سادگی میں اسلاف و اکابر کی یادگار تھے، ان کے لباس و پوشاک، نشست و برخاست، گفت وشنید، اخلاق و معاشرت میں سادگی اور بے تکلفی نمایاں تھی، سجاوٹ، طمطراق، شان وشوکت اور رعب وداب سے بالکل پاک تھے، بچے، بوڑھے اور جوان سب کے لیے آپ میں کشش تھی، اتنی عظمت و بزرگی کے باوجود وقت بے وقت ہر ایک کے لیے آپ سے ملنا ممکن تھا، ہر ایک کو آپ کی شخصیت میں اپنے لیے کشش محسوس ہوتی۔

احمد سجاد صاحب (بڑے فرزند) نے بتایا کہ: ایک بار والد صاحب اپنی صاحب زادی کے گھر تشریف لے گئے تو انھوں نے ابّا کی ضیافت میں عمدہ عمدہ کھانے بنائے حضرت مفتی صاحبؒ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اب میں تمھارے یہاں نہیں آوں گا، وہ ڈر گئیں اور پوچھا کہ: ابّا کیا تکلیف ہوگئی؟ تو فرمایا کہ: تم نے تکلف سے کام لیا، تکلف تو اجنبیوں کے لیے کیا جاتا ہے، میرے لیے تو جو ہو وہی حاضر کر دیا کرو! اس میں لطف ہے محبت ہے، پیٹ بھر کھانے کو جی چاہتا ہے، انھوں نے آئندہ کے لیے وعدہ کیا تو حضرت نے غلطی معاف کر دی۔

آپ کے کمرے میں ایک ٹاٹ بچھا ہوتا، ایک طرف سادہ بستر لگا ہوتا، باہر ایک تخت تھا، اس پر بلا کچھ بچھائے بیٹھے رہتے آنے والوں کے لیے چار پائی لگی ہوتی، اس پر بھی کچھ بچھا نہ ہوتا تھا، آپ کا کمرہ اور باہر کی نشست گاہ کو دیکھ کر یہ شعر زبان پر آتا:

ہم غریبوں کی یہی ہے کائنات　　بوریا حاضر ہے شاہوں کے لیے

کبھی کسی کے ٹھاٹ باٹ اور طمطراق سے مرعوب نہ ہوتے تھے اور نہ اپنی علمیت و عظمت سے کسی کو مرعوب کرتے تھے۔

۱۲-''آخرت کا استحضار'': آپ کے پاس رہ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو ہر لمحہ آخرت کا استحضار رہتا تھا، اپنی تقریر و تحریر میں اس کی تلقین فرماتے رہتے، اپنے ہر عمل کو محشر اور آخرت کا دھیان رکھ کر انجام دیتے تھے، کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتے، نہ کسی کو ستاتے، ہاں! دشمن سے چوکنا ضرور رہتے تھے۔

۱۳-''موت کے لیے تیار'': حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی میں جو نمایاں اسباق ملتے ہیں، ان میں سے ایک سبق یہ ہے کہ آپ موت کے لیے ہر لمحہ تیار رہتے؛ بلکہ ایمان و اعمالِ صالحہ کے ساتھ موت کی دعاء بھی کراتے، کبھی میں نے موت سے ہراساں نہیں دیکھا، اس طرح رہتے جیسے موت کا انتظار کر رہے ہوں، ہر ایک کا حساب بے باق، ہر گناہ سے توبہ، ہر لمحہ اپنے نامۂ اعمال کا جائزہ، ہر لحظہ آخرت اور منازلِ آخرت کا خیال اور دھیان رہتا تھا، بعض مرتبہ کانفرنسوں اور جلسوں میں بھی اپنی موت کا مختلف انداز سے ذکر فرماتے۔ آپ کی باتیں سن کر یقین ہوجاتا کہ آپ موت کے لیے ہر وقت تیار ہیں، یہ صفت کتنی قیمتی ہے، اس سے خلوص وللّٰہیت کی کتنی عظمت معلوم ہوتی ہے، اس کا اندازہ بڑے علماء ہی لگا سکتے ہیں۔

عام لوگ موت کے سلسلے میں شک میں رہتے ہیں، اس لیے موت کو قرآنِ پاک میں ''یقین'' سے تعبیر کیا گیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

واعبد ربک حتی یأتیک الیقین۔

(اپنے رب کی عبادت کرو یہاں تک تمھارے پاس یقین (موت) آجائے۔)

عام لوگوں کو موت کے اچانک آدھمکنے کا یقین نہیں ہوتا؛ اس لیے تیاری نہیں کرتے؛ حالانکہ ہر لمحہ موت کو یاد رکھنا چاہیے، اس کا مراقبہ کرنا چاہیے، اس کے ساتھ ہی اعمال صالحہ میں برکت ہوتی ہے، معاصی سے پرہیز پر قدرت ہوتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی زندگی میں موت کا استحضار و انتظار اور اس کے لیے ہر وقت تیار رہنے کا سبق ہمارے لیے موجود ہے۔

یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انھیں کے اتّقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کے مزے آئیں
جو آئیں اپنی جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؒ کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، ان کی خدمات کو قبول فرمائے! جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل نصیب فرمائے! اور نئی نسل کو آپ کی زندگی کو نمونہ بنا کر چلنے کی توفیق بخشے! (آمین)

●●●

مولانا مفتی محمد ظفیر الدینؒ صاحب اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی☆

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب کا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس کے شعبہ ہائے علوم شرقیہ کے اساتذہ سے گہرا تعلق تھا۔ آخر عمر میں اکثر ان کا علی گڑھ آنا جانا ہوتا تھا۔ وہ یہاں کے شعبہ دینیات سنی کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر رہے اور مختلف سمیناروں میں شرکت کے لیے مدعو کیے جاتے تھے۔ پہلی مرتبہ حضرت مفتی صاحب ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ تشریف لائے اور مشہور عالم دین مولانا عبداللطیف رحمانی سابق صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی و مسلم یونیورسٹی سے علمی استفادہ کیا۔ اس سفر کا حال خود حضرت مفتی صاحب نے اس طرح لکھا ہے:

''غالباً ۱۹۵۰ء میں جب مولوی یحییٰ ندوہ سے عالمیت کر کے آئے تو رائے یہ ہوئی کہ کچھ دنوں مفتی عبداللطیفؒ سابق مدرس دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد و صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت میں جا کر علی گڑھ میں گذاریں اور ان سے حدیث پڑھیں۔ سکریٹری صاحب (مدرسہ سانحہ مونگیر) نے فرمایا آپ جا کر یحییٰ سلمہ کو علی گڑھ پہونچا آئیں، اس سے پہلے ہم دونوں میں سے کوئی علی گڑھ نہیں گیا تھا، ہم دونوں روانہ ہوئے علی گڑھ میں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، کان پور میں ٹرین بدلنا تھی، وہاں علی گڑھ

☆ سابق رفیق، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

کے ایک طالب علم سے ملاقات ہوئی، ان کا نام محمود تھا.....
حضرت مفتی عبداللطیف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر) میں نے عرض کیا کہ یہ ہمارے مولوی یحییٰ ندوہ سے عالمیت کر چکے ہیں۔ کچھ سال آپ کی خدمت میں رہنا چاہتے ہیں تاکہ علمی استفادہ کرسکیں اور اسی مقصد سے میں ان کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ مفتی صاحب نے مسرت کا اظہار فرمایا، میں تین چار دنوں تک علی گڑھ رہا ان سے برابر ملتا رہا، سب سے پہلے بدائع الصنائع کا سانی کے مطالعہ کی طرف انھوں نے متوجہ کیا کہ تم کو فقہ سے مناسبت معلوم ہوتی ہے، اس کا مطالعہ ضرور کرو۔
(زندگی کا علمی سفر، ص ۱۰۱-۱۰۰)

مفتی صاحب کا علی گڑھ کا دوسرا سفر ۱۳۸۲ھ میں اس وقت ہوا جب وہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کی تنظیم و ترتیب کے نگراں بنائے گئے، کتابوں کی فہرست سازی اور کیٹلاگنگ کے لیے اور کتابوں کی ترتیب کے جدید طریقہ سے واقفیت کے لیے انھوں نے علی گڑھ کا سفر کیا اور مولانا آزاد لائبریری کے انتظام کا تفصیلی مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اس سفر میں ان کا قیام ڈاکٹر مسعود اشرف صاحب (شعبہ سرجری میڈیکل کالج) کی رہائش گاہ پر رہا، انھوں نے ڈپٹی لائبریرین مشتاق صاحب سے مفتی صاحب کا تعارف کرایا۔ مفتی صاحب نے اس کی سرگزشت اس طرح لکھی ہے:

''مشتاق صاحب سے ڈاکٹر صاحب نے ملایا، وہ مجھے کتب خانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لے گئے اور پورے کتب خانہ کی سیر کرائی، رجسٹر دکھائے، لوگوں سے ملایا، اتفاق سے وہ بھی ہمارے ضلع دربھنگہ ہی کے باشندہ تھے، مگر آپ علی گڑھ میں رہ گئے تھے اور بس

گئے تھے، پورے ایک ہفتہ میں علی گڑھ میں رہا اور کتب خانہ کا
جائزہ تفصیل سے لیا اور سبھوں سے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی،
کتب خانہ میں مولانا معین الدین اور مولانا عبدالشاہد شیروانی جیسے
اہل علم بھی تھے، ان لوگوں نے ہمت بڑھائی اور کتب خانہ کی تنظیم
اور کتابوں کی حفاظت پر بہت ساری باتیں گوش گذار کیں''۔
(زندگی کا علمی سفر، ص ۱۳۹)

۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۵ء کے عرصہ میں مفتی صاحب کا علی گڑھ بارہا آنا ہوا، ان کے عزیز ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی دیوبند سے علی گڑھ آچکے تھے اور ۱۹۸۷ء میں شعبہ دینیات کے ناظم مقرر ہوئے تھے۔ ان کے توسط سے حضرت مفتی صاحب شعبہ سنی دینیات کے بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر منتخب ہوئے نیز شعبہ کے اساتذہ کے انتخاب کے لیے ماہرین کی کمیٹی میں بھی شامل کیے گئے۔ وہ جب علی گڑھ آتے تو مختلف اہل علم سے ان کی ملاقات ہوتی۔ اسی عرصہ میں ان کے صاحب زادے ابوبکر عباد بھی علی گڑھ آگئے اور شعبہ اردو کے طالب علم اور بعد میں عارضی استاذ ہوئے تو مفتی صاحب کی آمد و رفت اور بڑھ گئی۔

رفیق سفر کی حیثیت سے مفتی صاحب کے ساتھ میرا پہلا سفر دیوبند سے علی گڑھ تک اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آٹھویں سمینار منعقدہ باہتمام ناظم دینیات، ۲۲-۲۴/اکتوبر ۱۹۹۵ء میں شرکت کی غرض سے ہوا۔ اس پورے سفر میں ان کی جو نوازشیں میرے ساتھ ہوئیں میں اس کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اتنی بڑی تعداد میں ملک کے بڑے بڑے علما اور دانش وروں کو پہلی بار دیکھنے اور ان سے ملاقات کا شرف انھیں کے طفیل حاصل ہوا۔ انھوں نے قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ اور شاید ڈاکٹر محمد منظور عالم سے خاص طور سے ملاقات کروائی۔ خردوں کی کیسے دل جوئی کی جاتی ہے اور ان کے حوصلوں کو کیسے بڑھایا جاتا ہے، کوئی ان سے سیکھے۔ اس سہ

روزہ فقہی سمینار کا ایک موضوع ''عقد نکاح میں شرائط کی حیثیت'' بھی تھا۔ اس تعلق سے علما اور دانش وروں کی بہت سی کارآمد باتیں سامنے آئیں اور مباحثہ و مناقشہ کا بازار گرم رہا۔ صدارت مفتی صاحب ہی فرمارہے تھے۔ مغرب کی اذان سے پانچ سات منٹ پہلے انھیں صدارتی کلمات کہنے کا موقع دیا گیا۔ مختصر سے وقت میں انھوں نے قیمتی باتیں فرمائیں۔ سارے لوگ ان کے خطاب کو سن کر عش عش کرنے لگے۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم کم و بیش کچھ یہ تھا:

'' آپ لوگوں کی طویل گفتگو میں توجہ سے سن رہا تھا، مگر یقین
جانیے ان باتوں میں توازن نہیں ہے۔ میں آئے دن استفتا کا
جواب لکھتا رہتا ہوں، اس لیے طویل تجربہ کی روشنی میں کہتا ہوں
کہ جہاں کہیں بھی طلاق و تفریق کے واقعات رونما ہوتے ہیں
اس میں بیش تر عورتوں کی ہی غلطی ہوتی ہے۔ وقت نہیں ہے ورنہ
میں تفصیل سے آپ لوگوں کو بتاتا۔''

مفتی صاحب کے ساتھ میرا دوسرا سفر ۱۹۹۷ء میں جولائی یا اگست کی کسی تاریخ میں علی گڑھ کے لیے ہوا۔ میں نے یونیورسٹی کے شعبہ سنی دینیات میں ایم ٹی ایچ کے لیے فارم بھر دیا تھا، داخلہ کے لیے میرا نام منتخب کرلیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فلاں تاریخ کو داخلہ کی کارروائی مکمل ہونی ہے۔ اس کی اطلاع جاکر مفتی صاحب کو دی۔ وہ فرمانے لگے میں بھی تمہارے ساتھ علی گڑھ جاؤں گا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا: اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے، ہامی بھرلی۔ اس سفر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس میں ان کی ایمان داری، بردباری، کسرنفسی اور انسانی ہمدردی وغیرہ کے بہت سے درس ملے۔ واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

ریل میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ہم لوگ دیوبند سے میرٹھ اسٹیشن پر اس وقت پہنچے جب سنگم اکسپریس کے کھلنے کا سگنل ہوگیا۔ مفتی صاحب نے فرمایا: دیکھو

جنرل ڈبہ کدھر ہے۔ میں نے کہا: ہم جنرل کے بجائے سلیپر ڈبہ میں بیٹھیں گے۔ انھوں نے فرمایا: یہ تو غلط ہوجائے گا، ہمارے پاس ٹکٹ جنرل کا ہے۔ میں نے کہا: آپ اس کی فکر نہ کریں، میں ٹی ٹی سے بات کرلوں گا۔ اسی دوران ایک ٹی ٹی سامنے آ گیا۔ میں نے چلتے چلتے اس سے کہا: یہ میرے گرو ہیں اور ہمارے پاس جنرل ٹکٹ ہے اور جنرل ڈبہ میں کافی بھیڑ ہوگی اور کوئی ٹھیک نہیں کہ وہاں پہنچنے سے پہلے ریل چل پڑے۔ اگر اجازت دیں تو ہم سلیپر ڈبہ میں بیٹھ جائیں، علی گڑھ تک جانا ہے۔ اس نے کہا: جایئے فلاں بوگی میں فلاں سیٹ پر بیٹھ جایئے۔ بڑی مشکل سے مفتی صاحب کو اس بوگی میں سفر کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

ہم متعینہ بوگی میں ٹی ٹی کی بتائی ہوئی سیٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک لڑکی کھڑکی سے ٹیک لگائے سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے، دوسری طرف سامنے والی سیٹ پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سامان کو سیٹ کے نیچے رکھا اور مفتی صاحب سے کہا: آپ یہاں بیٹھ جایئے۔ جیسے ہی وہ بیٹھنے لگے، لڑکی نے بڑے ہی حقارت بھرے لہجے میں کہا: بڑے میاں آپ ہٹ کر وہاں بیٹھئے۔ مفتی صاحب ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ کھڑے ہونے لگے۔ میں نے ان کا شانہ دباتے ہوئے کہا: آپ یہیں بیٹھیں گے۔ اس وقت تک تو میں یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید یہ اسی کی برتھ ہے۔ میں نے کہا: کیا آپ اپنے والد کو بھی اسی طرح مخاطب کرتی ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ چراغ پا ہوگئی اور کہنے لگی کہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں نے کہا: مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اتنا تو سمجھ گیا کہ بڑے چھوٹے کا آپ کو لحاظ نہیں ہے۔ مفتی صاحب بار بار مجھ سے کہتے رہے کہ خاموش ہوجاؤ، کیا ہوا ہم زمین پر ہی بیٹھ کر چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ میں نے چپ سادھ لی۔ مگر لڑکی خاموش ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس پر سامنے والی سیٹ کے لوگوں نے اس کو ڈانٹا کہ تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہیے تھا، غلطی تمہاری ہے، تمہیں تو ان سے معافی مانگنی

چاہیے۔ بڑی مشکل سے اس کا بڑبڑانا ختم ہوا۔

کچھ دیر کے بعد بلند شہر سے ایک دو اسٹیشن قبل گاڑی ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی، وہ لڑکی بدستور کھڑکی سے ٹیک لگائے رہی۔ کسی لٹیرے نے اسے تاڑ لیا، کیوں کہ وہ سونے کے زیورات پہنے ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں جیسے ہی گاڑی چلی، باہر سے اس نے اس کے کان پر حملہ کردیا اور سونے کی بالی نوچ لی، جس سے اس کا کان بُری طرح زخمی ہوگیا۔ لڑکی نے چیخ لگائی تو سارے لوگ حیرت میں پڑ گئے کہ آخر اس کو کیا ہوا۔ مزید کچھ کہنے کے بجائے وہ کان پکڑ کر بیٹھ گئی اور آہ و بکا کرنے لگی۔ دیکھا کہ خون اس کے کان سے تیزی سے بہہ رہا ہے۔ مفتی صاحب نے جھٹ سے اپنا رومال نکال کر اس کو دیا کہ بیٹی اس سے زخم کو دبالو۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا: میرا بیگ کھولو، اس میں فلاں دوا ہے اسے نکال کر اس بچی کو کھلاؤ تاکہ اس کی تکلیف کی شدت کم ہو۔ یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے خود سے ہی اپنے تھرمس سے پانی نکال کر اسے دیا اور کہا لو بیٹی یہ دوا کھالو شاید جلدی تم کو آرام مل جائے۔ تھوڑی دیر میں بلند شہر اسٹیشن آ گیا، جہاں اسے اترنا تھا، وہ معافی مانگتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئی۔

لڑکی کے جانے کے بعد مفتی صاحب نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ سفر میں آدمی کو ٹھنڈے دماغ کے ساتھ چلنا چاہیے۔ اگر اس نے مجھے ایسا ویسا کہہ دیا تو کیا ہوا میرا قد گھٹ تو نہیں گیا، ہم جیسے ہزاروں مفتی روزانہ سفر کرتے ہیں، کون جانتا ہے کہ کون مفتی ہے اور کون دارالعلوم کا استاذ۔

مفتی صاحب علی گڑھ آتے تو پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی یا پھر اپنے بیٹے ڈاکٹر ابوبکر عباد کے یہاں قیام کرتے۔ عام طور سے وہ ابوبکر صاحب کو اور مجھے ساتھ لیتے اور خاص طور سے پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر اعظم قاسمی، حکیم مودود اشرف، پروفیسر مسعود اشرف، قاضی افضال حسین اور مولانا ہناد احمد قاسمی وغیرہ سے

ملنے ان کے دولت خانہ پر تشریف لے جاتے۔ یہ حضرات ان سے بڑی محبت اور عقیدت سے ملتے۔ مفتی صاحب ان لوگوں کے اہل خانہ اور بڑے بزرگوں کے احوال نام بہ نام بڑی تفصیل سے معلوم کرتے۔ مجھے تعجب ہوتا کہ ان کو ان حضرات کے اہل خانہ کے متعلق اتنی جانکاری کیسے ہوئی۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ علی گڑھ آئے ہوں اور اپنے جاننے والوں سے ملے بغیر چلے گئے ہوں۔ ان کا جب بھی میرے پاس خط آتا تو نام بنام لکھتے کہ فلاں فلاں لوگوں کو میرا سلام عرض کر دینا۔

حضرت مفتی صاحب کا ایک یادگار سفر ۲۵-۲۶ مارچ ۲۰۰۰ء کو ہوا تھا۔ ان تاریخوں میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی پر ایک وقیع سمینار ناظم دینیات ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی کی نگرانی میں منعقد ہوا تھا۔ اس سمینار میں بیت المقدس کے امام ڈاکٹر محمود ا□م بھی شریک ہوئے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے اس سمینار میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دارالعلوم دیوبند سے روابط و تعلقات پر ایک قیمتی مقالہ پڑھا تھا اور ۲۵ مارچ کو شب میں کنیڈی ہال میں اجلاس عام سے خطاب بھی کیا تھا۔ اس سفر میں ان کا قیام دفتر ناظم دینیات میں تھا جو جامع مسجد سے ملحق ہے۔

جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم ہوگیا تو جب کبھی مفتی صاحب کی طبیعت علی گڑھ آنے کو چاہتی، مجھے خط لکھ دیتے اور میں وقت مقررہ پر دیوبند پہنچ جاتا اور نہ صرف ان کو ساتھ لے کر علی گڑھ آجاتا بلکہ واپس دیوبند بھی پہنچا دیتا۔ اس طرح سال میں کم سے کم دو مرتبہ وہ علی گڑھ ضرور آجاتے تھے۔ ان اسفار میں مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے اور سننے کا موقع ملا۔ وہ اپنے بیتے ہوئے دنوں کے ایسے ایسے واقعات سناتے کہ مجھے تعجب ہوتا۔

جب میں آفتاب ہال میں رہنے لگا تو مفتی صاحب نے کئی مرتبہ خواہش

ظاہر کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوسٹل میں ہی رہوں گا، مگر میں بعض وجوہ کی بنا پر ٹال دیتا اور کہتا کہ آپ اپنے بیٹے کے یہاں ٹھہریں تو زیادہ بہتر ہوگا، وہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ مگر جب میں آفتاب ہوسٹل میں رہنے لگا تو ایک مرتبہ انھوں نے ایک رات کے لیے میرے کمرہ پر قیام کیا۔ چوں کہ یہ سنگل سیٹیڈ روم تھا، اس لیے مجھے ان کو یہاں ٹھہرانے میں کسی طرح کی قباحت محسوس نہیں ہوئی، بلکہ خوشی ہوئی۔ وہ میرے باضابطہ استاذ تو نہ تھے، مگر اس سے کم بھی نہ تھے اور وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے اور میں ان کی کفش برداری کو اپنے لیے فخر اور سرمایہ زندگی سمجھتا تھا:

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

●●●

اے بہار آ گہی اے نازشِ علم و ہنر

مولانا وارث ریاضی☆

کس نے پائی ہے جہانِ علم و دانش میں وفات؟
رو رہے ہیں جس کے غم میں آج مردانِ ثقات

مفتیِ دینِ مبیں دنیا سے کیا رخصت ہوا؟
اک نیا غم آرزو[1] کے بعد پھر سہنا پڑا

زندگی کیا ہے؟ مسلسل رنج و غم کھانے کا نام
یا فراقِ رفتگاں میں اشک برسانے کا نام

ہے خدا باقی مگر فانی ہے اس کی کائنات
چند لمحوں کے لیے ہے رونقِ بزمِ حیات

رہ بر قوم و وطن اے منبعِ علم و عمل
ترجمانِ ملتِ بیضا ، فقیہِ بے بدل

تیری رحلت پر حزیں ہیں علم کے مہر و نجوم
تیرے غم میں آج ہے محوِ فغاں[2] دارالعلوم

پیکرِ صبر و رضا اے عالمِ روشن خیال
انکساری میں کہیں ملتی نہیں تیری مثال

اے بہار آ گہی ، اے نازشِ علم و ہنر
تیری ہر تصنیف ہے گل دستۂ فکر و نظر

اے صحافت[3] کے زعیمِ بے مثال و معتبر
تھی زمانے کی سیاست پر تری گہری نظر

تھی تری ہستی سلیمانؒ[4] کی نظر سے مستطاب
بوالمآثر[5] کے کمالِ علم و فن سے فیض یاب

☆ کاشانہ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار، ۸۴۵۴۵۳

۱ پروفیسر مختارالدین احمد آرزو۔

۲ دارالعلوم دیوبند۔

۳ مفتی صاحب نے ایک عرصے تک ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی ادارت کی خدمت انجام دی اور بڑے فکر انگیز اداریے تحریر کیے۔

۴ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ جن سے مفتی صاحب نے علمی و فکری رہنمائی حاصل کی۔

۵ ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ جن سے مفتی صاحب نے اسلامی علوم کا درس لیا۔

جانشینِ عبد رحمٰن[6] داعیِ امن و اماں
یادگار حضرتِ گیلانی[7] شیخِ زماں

حضرت میرِ شریعت[8] تیرے غم میں سوگوار
تیری فرقت میں ولی[9] نیک خو ہیں اشک بار

محوِ غم سجاد[10] ہیں، حماد[11] بھی، عباد[12] بھی
مبتلائے غم سعود[13] و وارثؔ ناشاد بھی

از جہاں در دو ہزار و دہ و یک، وارث حسن[14]
شد بہ جنت آں ظفیرِ عالمِ شریں سخن

۲۰۱۱ء

●●●

۶ حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ امیر شریعت خامس جو مفتی صاحب کے چچازاد بھائی تھے، مدرسہ حمیدیہ گودنا چھپرہ میں مفتی صاحب نے ان سے ہدایہ اور مشکوٰۃ شریف وغیرہ کی تعلیم پائی تھی۔

۷ حضرت مولانا مناظر احسنؒ گیلانی جن سے مفتی صاحب نے علمی استفادہ کیا اور ان کی سوانح ''حیات گیلانی'' تالیف کی۔

۸ حضرت مولانا سید نظام الدین مدظلہ امیر شریعت بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ جن سے حضرت مفتی صاحب کے گہرے روابط تھے۔

۹ حضرت مولانا ولی رحمانی نائب امیر شریعت وسجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر جو مفتی صاحب کے بڑے عقیدت مند ہیں۔

۱۰ تا ۱۲ حضرت مفتی صاحب کے صاحب زادگان جو مفتی صاحب کی طرح صاحب علم ہیں۔

۱۳ پروفیسر سعود عالم قاسمی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو حضرت مفتی صاحب کے عزیز رشتے دار ہیں اور حضرت مفتی صاحب کے ساختہ و پرداختہ بھی۔

۱۴ راقم ناچیز کا اصلی نام۔

فقہ وفتاویٰ علم نبی کا نیر تاباں ڈوب گیا

ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی

ہر سمت اداسی چھائی ہے مغموم یہاں ہر پیر و جواں
ہر دل میں غموں کا طوفاں ہے ہر چہرے سے ہے کرب عیاں
نمناک بنی ہیں ہر آنکھیں ماحول میں ہر سو آہ و فغاں
پژمردہ ہیں گلہائے چمن او ردیدۂ نرگس اشک فشاں
اے حلم و مروت کے خوگر اے مہر و محبت کے پیکر
اے رہروِ راہِ خلدِ بریں تجھے ڈھونڈ رہی ہے میری نظر
وہ خواب سلیماںؔ ندوی کے وہ عاشقِ حضرت گیلانیؒ
محبوبِ حبیبؔ رحماں تھے شاگردِ رشید نعمانیؒ
وہ دیدۂ طیبؔ مدنیؒ کے دلدادۂ منتؔ رحمانی
اسلاف کے تھے وہ عکسِ حسیں اور ان سے تھا رشتۂ روحانی
وہ فقہ و فتاویٰ علم نبی کا نیّرِ تاباں ڈوب گیا
سرتاپا جو درسِ قرآں تھا وہ مہرِ درخشاں ڈوب گیا
وہ نرم مزاج و شیر زباں وہ جود و سخا کا نقشِ حسین
تھی ذوقِ عبادت سے ہر دم مہتاب سی روشن ان کی جبیں
تھے آپ تصنع سے عاری اور ان میں تکلف کچھ بھی نہیں
وہ سہل نگار و سہل بیاں وہ سہل پسندی کے تھے امیں

اخلاق جلیلہ کا حامل تربت میں ابھی خوابیدہ ہے
تھا لمبا سفر اب منزل پر آسودہ ہے آرامیدہ ہے
ترتیب فتاویٰؔ علمِ فقہ کی دنیا میں شہ کار بنی
تو اسوۂ حسنہ عشقِ نبی کے جذبے کا اظہار بنی
پھر عفت و عصمت کی شہرت سے دنیا لالہ زار بنی
اور ایک نظامِ امن تری لوگوں کے لیے گل زار بنی
تاریخؔ مساجد بھی لکھی اور اس کے نظامؔ اعلیٰ کو
اور درسِؔ قرآں کی خوشبو سرشار کرے گی دنیا کو
تخریجِ مسائل میں یکتا تحقیق کے فن میں تو اعلا
تحریر تمہاری اہلِ قلم کے واسطے روشن مینارا
سب تجھ سے محبت کرتے ہیں تو سب کی آنکھوں کا تارا
جو کام ادارے کرتے ہیں وہ تنہا تونے کر ڈالا
اب قادرِ مطلق کی جانب سے جنت میں اکرام ملے
ہر حرف کے بدلے میں تجھ کو اعزاز ملے انعام ملے
سب آپ کے مرشد اور بڑے ہیں آج یقیناً خلد نشیں
استاذ جو دل کی دھڑکن تھے وہ سب کے سب ہیں زیر زمیں
غمخوار میاںؔ صاحب تیرے ہمدرد عتیقؔ مفتیؒ دیں
احباب میں ازہرؔ شاہ تھے یا علامہ بہاریؒ کوئی نہیں
یوں دنیا میں جو آئے ہیں سب جانے کو آئے ہیں
پھر ہوک سی دل میں کیوں اٹھی، کیوں ہر سو غم کے سائے ہیں
اولاد سبھی افسردہ ہیں اور اہل خانہ اشک فشاں
ہیں سارے عزیزوں کے دل میں رنج و الم اور درد نہاں

ہیں بھیگی بھیگی سب آنکھیں اور چہروں پر ہے کرب عیاں
کیوں ہر سو آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں آپ کہاں ہیں آپ کہاں
حجرے سے نکل کر آنگن میں پرکیف نوا کب آئے گی
پوتی کو مخاطب کرنے کو ''بٹی'' کی صدا کب آئے گی
ہو تیری لحد پہ رحمتِ حق اے مفتیٔ دوراں سایہ فگن
اور قبر ہو نورِ ایمان و اخلاصِ عمل سے ہی روشن
پھر حشر میں داور تجھ سے کہے اے بندۂ مومن لاتحزن
دیکھا ہے حسابِ یُسر ترا ، ہے خلد بریں تیرا مسکن
ہر لطف و عنایت فضل و کرم اور رحمتِ اعلیٰ ذات ملے
اللہ احد اللہ صمد کا تجھ کو یہ سوغات ملے

●●●

قطعہ تاریخِ وفات

طالبانِ علم دیں را ہر زماں اور رہ نمود
عقدہ فقہ و فتاویٰ را او دائم بر کشود
سال تاریخ وفاتش ہر کہ جوید اے عزیز
گو بہ او ''جادو قلم مفتی ظفیر الدین بود''
۲۰۱۱ء

(احمد سجاد)

قطعہ تاریخِ وفات

غم ہے ان کی موت کا گرچہ بہت سنگین بھی
صبر کی لیکن ہر اک حالت میں ہے تلقین بھی
زندگی جن کی تھی قال اللہ اور قال الرسول
تشنگان علم کی تھے آپ ہی تسکین بھی
آپ کی تصنیف اور تالیف اعلیٰ ہیں بہت
تو کئی جلدوں میں کی فتووں کی پھر تزئین بھی
پڑھیے اِنّا للہ (و) اِنّا اِلیہ رَاجِعون
اب گئے دنیا سے وہ مفتی ظفیرالدین بھی
۳، ۳۰، ۶۵، ۷۰، ۱۱، ۱۸۱۵، ۱۷ =۲۰۱۱ء

(ڈاکٹر عبدالمنان طرزی)